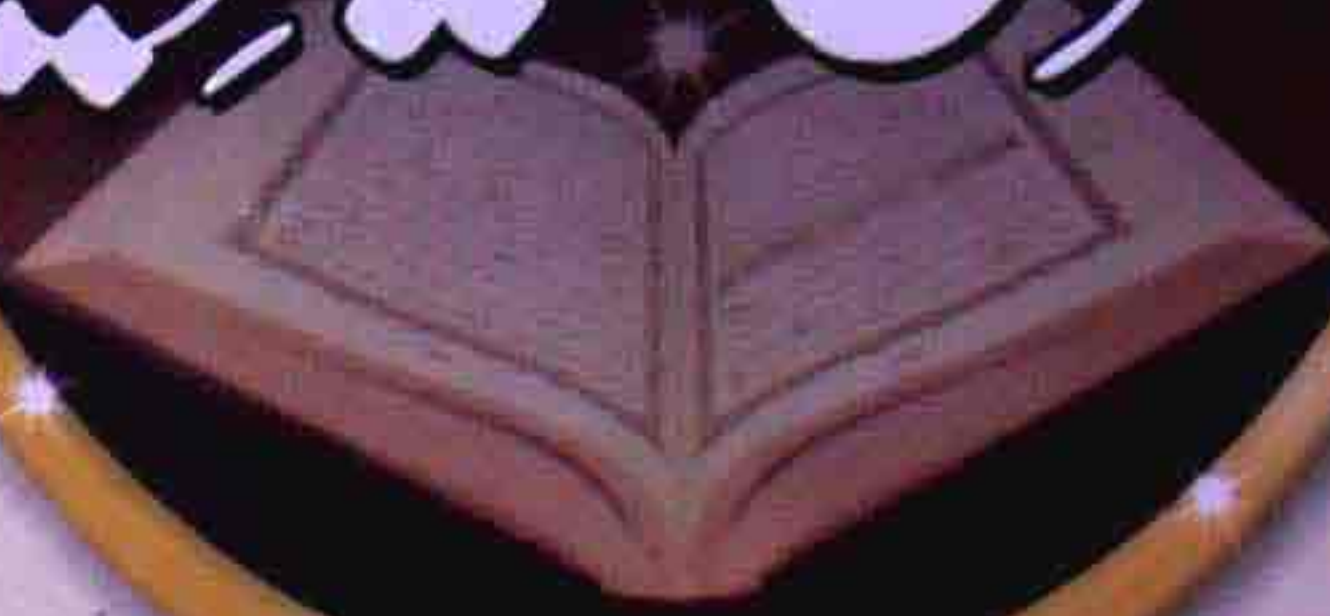


اصنافِ شہد

میتاؤں اور تعمیرات



پروگریسو پبلشرز

تالیف
جناب ڈاکٹر ذی الدین صاحب
ایم ایچ پی ایچ ڈی انڈین ایئر لائنز
مد شعبہ فلسفہ جامعہ شاہزادہ آبد گن



پیمانہ اور تہمت

اضافہ شد

تالیف
جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیٹرٹریٹ لار
صد شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

پر و گریو پبلشرز

۳۰-بی-اردو بازار لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرآن اور تعمیر سیرت

مصنف ————— ڈاکٹر میروالی الدین

بار اول ————— 1988ء

بار دوم ————— 2012ء

پرنٹرز ————— حاجی حنیف پرنٹرز

ناشر ————— چوہدری غلام رسول

میاں جوادر رسول

قیمت ————— 300/- روپے

ملے کے پتے

ملت چولی کیشنر

فصل مسجد اسلام آباد 051-2254111 Ph:
E-mail: millat_publication@yahoo.com

پبلسٹک سٹریٹریو

۱۳ گنج بخش روڈ لاہور 042-37112941

شوروم ملت چولی کیشنر دوکان نمبر 5 مکہ سنٹر نیوارو بازار لاہور 0321-4146464

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ ارو بازار لاہور
042-37352795 فون 042-37124354 فیکس

پروگریسو بکس

اُنسباً

مرشدی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام جن
 کے فیضانِ توجہ اور برکاتِ تربیت سے اس خدمت کے
 لائق ہوا۔

عمرِ حریص در طلبِ کیمیا گزشت
 مارا قبولِ اہلِ نظر کیمیا بس است

میر ولی الدین

مُصَنَّف کی دُوسری کتابیں

تراجم

- ۸۔ رہنمائی قرآن
- ۹۔ تاریخ فلاسفہ اسلام
- ۱۰۔ تاریخ مسائل فلسفہ
- ۱۱۔ مقدمہ فلسفہ حاضرہ
- ۱۲۔ فلسفہ کی پہلی کتاب
- ۱۳۔ مقدمہ مابعد الطبیعیات

- ۱۔ قرآن اور تصوف
- ۲۔ فلسفہ کیا ہے؟
- ۳۔ رموز اقبال
- ۳۔ مراقبات
- ۵۔ قنوطیت یا فلسفہ یاس
- ۶۔ ابطال مادیت
- ۷۔ رسالہ اخلاقیات

فہرست مضامین

صفحہ	مقصد
۹	تہیہ
۱۳	عبادت و استعانت
۲۲	توحید الوہیت
۱۰۹	صاحبت
۱۲۲	نیکی علم ہے
۱۳۰	تسلیم کا مقصد
۱۳۰	انسانِ کامل
۱۳۵	امام غزالی کا فلسفہ مذہب
۱۵۳	تصحیح و فکر
۱۵۹	احساس
۱۶۷	قانونِ تہاذب اور تعمیر سیرت
۱۷۴	قرآن اور سیرت سازی
۱۹۷	قوتِ ایمانی اور ظہورِ غیب
۲۱۲	ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جلت
۲۲۸	کامیاب زندگی کا قرآنی تصور
۲۵۳	قرآن اور علاجِ خوف
۲۶۵	خوفِ زندگی
۲۷۵	دار و سکے جاننے
۲۸۳	قرآن اور علاجِ حزن
۲۹۳	زندگی میں غم کیوں ہے
۳۰۳	قرآن اور علاجِ غضب
۳۱۳	دعا کا فلسفہ
۳۲۳	دعا اور دفعِ بلا
۳۳۱	اسرارِ حج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس کتاب کے بعض مقالات ۱۹۳۷ء میں "ادارہ اشاعتِ اسلامیات" حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام قرآن اور سیرت سازی کے عنوان سے شائع ہوئے تھے پھر ششہ شدہ ان میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب ۱۹۵۷ء میں یہ ایک مکمل اور ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ گویا یوں کتاب چاہیے کہ قرآن اور سیرت، ۱۹۳۷ء کی قرآن اور سیرت سازی سے لب لباب علیحدہ جدید تالیف کی صورت میں سامنے آ رہی ہے۔

۱۹۳۷ء کے انقلاب سے ملک میں جو حالات رونما ہوئے ان کی موجودگی میں اردو کی کسی ضخیم علمی اور مذہبی کتاب کا شائع کرنا آسان نہیں رہا، پوری فضا بالیوسیوں اور تارکیوں میں گھری ہوئی رہی، اردو کو خود اس کے بولنے والے اور اس کی آنکھوں میں شہقت میں تربیت پالنے والے ویس نکالا دینے پتے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد دکن جس کے چنے چنے سے کبھی دل آویز اردو تالیفات کے چشمے اُبلاتے تھے آج ایک ویرانے میں تبدیل ہو کر رہ گیا اور اس کے ادبی اور علمی مرکز یا تو انقلاب کی موجوں میں لپٹ کر فنا ہو گئے ہیں اور یا ان میں خاک اُڑ رہی ہے۔

لیکن سخت جان ندوۃ المصنفین جس کا وجود کسی حکومت یا ریاست کے اقتدار و سطوت کے وابستہ نہیں تھا تباہی و بربادی کی تمام منزلوں سے گزرنے پر بھی اس لائق ہے کہ اس کی نگرانی میں یہ دعائیت میں ڈوبی ہوئی پرفاقت کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ فاضل شریٰ ذالک۔

"قرآن اور سیرت سازی" کے تعارف کے سلسلہ میں مولوی محمد اسحاق صاحب بی ایس ای ڈی پبلیکیشن نے "ادارہ اشاعت اسلامیات" کے مجتہد کی حیثیت سے جو دیباچہ لکھا تھا، ماضی کے مٹے ہوئے فکروں کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس جگہ ہی دیباچہ کا ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"میں صاحب علماء ہند میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، صاحب موصوف مدہب اور دنیاوی

کے زندہ پیکر ہیں اور ان کے فیضِ صحبت سے بیسیوں طالب علم صبحہ استر میں رنگے جا رہے ہیں رات دن کے اس مشغلہ سے ان کو انسانی کردار کی تعمیر کا ایسا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس کی نفسیاتی کمزوریوں اور امراض کی تشخیص کر کے قرآن کے ذریعہ ان کے بہترین علاج تجویز فرماتے ہیں، مزید برآں اپنے مقالات میں جا بجا احادیث اور صوفیائے محققین کے اقوالِ نظم و نثر سے کثرتِ استشاد فرماتے ہیں۔ اور باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) بار ایٹ لا اور جامعہ عثمانیہ میں مغربی فلسفہ کے صدر شعبہ وغیرہ سب کچھ ہیں لیکن مقالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوفِ قرآنی کے کسی رمز شناس عارف کے قلم سے یہ سطور نکلی ہیں۔

بہر حال یہ کتاب فلسفہ، تصوف اور ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔

میں اس تعارف میں اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ فاضل دیباچہ نگار نے محترم ڈاکٹر صاحب سے جن خصوصیتوں کو منسوب کیا ہے، میرے ذاتی مشاہدے میں بھی یہ تمام خصوصیات میری دلی الدین کے پیکر میں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، موصوف اس دور کے اول درجے کے روحانی فلسفی اور متکلم ہیں، اور ملتِ گم گشتہ کی نبض پر ایک ماہر فنِ طبیب کی حیثیت کے ہاتھ رکھنا جانتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساسِ کمتری، بے یقینی اور تذبذب کی ظلمتوں میں پھٹے ہوئے ہیں یہ گراں قدر تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط و مستحکم کرنے میں چرغِ راہ کا کام دیگی۔

علیق الرحمن عثمانی

یکم ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

تمہید

پیش نظر کتاب بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت مختلف موضوعوں کے اظہار خیالات پر مشتمل ہے مختلف اوقات میں مختلف تصورات کو واحد نصب العین کے زیر اثر پیش کیا گیا تھا اور اب انہیں یکجا حاضر کر دیا گیا ہے۔ لیکن نصب العین کی عینیت ہی وہ وحدت ہے جو اس کثرت میں مستحلی ہے اور انہیں ایک شیرازہ میں باندھ رکھا ہے۔ اس نصب العین کو یہاں مختصر پیش کرنا مقصود ہے، عمد حاضر کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ دین معاملہ ہے ان چندنا کامیاب، افسردہ دل، آشفہ دماغ، ضعیفوں کا جن کے ہاتھ سے دنیا نکل چکی ہے، جن میں متلع ذہنی سے مظلوظ ہونے کی نہ قابلیت باقی رہی ہے اور نہ خواہش، سیرت و شادمانی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے ہیں اور حزن و غم کے آغوش میں ان کے دن گزر رہے ہیں۔ دنیا میں کامیابی، کامرانی، مسرت و راحت کا حاصل کرنا ذہنی اصول کے عاقلانہ استعمال ہی سے ممکن ہے دینی اصول کو ان میں کیا دخل ہے۔ شاید قبر کے اس طرف ان کا کام پڑتا ہو تو ہو!

پیش نظر اوراق میں اس مغالطہ کو اس کی تمام تفصیلات میں رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصولاً بتلایا گیا ہے کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے سیرت کی تعمیر ضروری ہے اور جب تک سیرت کی تعمیر قرآنی اصول پر نہ ہو دنیا میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ چین اور طمانیت کا جمع ہونا ممکن نہیں! کامیابی محض مال یا بی کا نام نہیں، بلکہ مراد ہے طمانیت روح اور برد قلبی کا جو محض مالیات کو کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ واضح کیا گیا ہے کہ ذہنی عمل عاقل و عقل

میں روشنی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حرص و ہوس سے آزاد ہو کر علم وحی کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور حقیقت میں عاقل و بالغ وہی ہے جو ہوس و ہوس سے آزاد ہے۔

خلق اطفال اندر مست خدا نیست بالغ جز بہید از ہوی اردوی

کامیابی و کامرانی، مسرت و طمانیت اس مردِ خرد کا انعام ہے جس نے اپنی عقل کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل پر قربان کر کے اپنی ذات میں تقویٰ کے اوصاف پیدا کر لیے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کو جہاتِ دینی و دنیوی میں کافی تصور کر لیا ہے۔ ایسے اللہ بکاف عبد ہے۔

عقل سرباں کن پیش مصطفیٰ حبیبی اللہ گو کہ اللہ ام کفے

زین حسر و جاہل ہی بایہ شلنا دست در دیوانگی بایزدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد ایسے رادیہ و درخانہ نہ شد (رہائی)

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی طریقہ سے تخریجات میں کامیابی حاصل کی تھی، ان کے شکوہ و جلال سے سلاطین کا نپ اٹھے تھے، انہوں نے حریت و آزادی کا تسلط دنیا میں قائم کر دیا اور جبر و استبداد کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی اسوہ پر ایک بار پھر زندگی کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ان اوراق کا مقصد عہدِ حاضر کے نوجوانوں کو اس کی طرف دعوت دینا، اور اس کی تفصیلات کو ان پر واضح کرنا ہے۔

خود مؤلف کو اس اسوہ کی طرف کچھ سال قبل ایک عارف تامم للعرفت نے بلایا اور اپنی زبان فیضِ ترجمان سے اس کی تفصیلات کو سمجھایا اور سات سال کے دوران میں مختلف اوقات میں ہر جزی کی کئی وضاحت فرماتے رہے۔ مغربی و مشرقی فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے جس دماغ نے تربیت پائی تھی، اور جس کی عقل کو بقول اقبال "تفتید سے فرصت

لے میرا اشارہ ہے مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ کی طرف جو ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

بہت ہی اور جو بالآخر عقل کی گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز آ گیا تھا اس صاحبِ جنون نے اپنے ایک نکتہ سے کہ عقل تابع وحی ہو کر ہی اپنے بتوں سے نجات پاسکتی ہے، لات و منات کی بندگی سے آزاد ہو سکتی ہے۔ اس کو دل نیاز مند و نگاہ پاک باز کا شیدا کر دیا جو حصول معرفت کا واحد طریقہ ہے۔ اس نکتہ کے قلب میں اترنے کے بعد وہی ہوا جس کی اقبال نے خبر دی تھی۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جساں دیگر شود

اس روحانی انقلاب کے بعد جہان جیسا نظر آنے لگا اس کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اولاً اصول موضوعہ کو پیش کیا گیا ہے، ان کو اپنی ہمت اور اختیار کے استعمال سے عمل میں لانے کی تاکید کی گئی ہے، پھر انہی اصول کو مختلف مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ سیرت سازی کے لیے خوف و خزن و غضب کے دفعیہ کے لیے، کاسیب زندگی کے لیے، طمانیت و بردہ قلبی کے حصول کے لیے ان نسخوں میں سے اکثر کو معارف کے صفحات میں پیش کیا گیا، اور اہل ملک نے ان کو پسند بھی فرمایا ہے۔ یہاں یہ سب یکجا حاضر ہیں، یہ اس دل کی سوغات ہیں جو عقل کا غلام نہیں!

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے

(اقبال)

جو عقل کا غلام ہے وہ دل نہ کر قبول!

مگر زبان عقل کی ہے، تصورات و تعلقات سب عقلی ہی ہوتے ہیں اور انہی میں مفہومات روحانی کو پیش کیا جاسکتا ہے لہذا مقصود مفہوم ہے نہ کہ زبان جو محض ذریعہ ہے۔

والسلام علی من اتبع الهدی!

۲۶ مارچ ۱۹۳۵ء

میر ولی الدین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عبادت و استعانت

اے مردِ مہل تمنا ہمہ تو سے درمہن مایہ سودا ہمہ تو
ہر چند بہ روزگار درمی نگریم امروز ہمہ قوی و فردا ہمہ تو (ہوسید منہ)

انسان بلکہ تمام حیوانات کی زندگی کا پہلا قانون طلبِ منفعت و دفعِ مضرت ہے، تحفظِ ذات اور تولیدِ نسل و دلوں کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ ان چیزوں کو طلب کرے جو اس کی زندگی کے خطوطِ حیات میں مدد و معاون ہیں، اور ان چیزوں سے گریز کرے جو اس کو عدم کی طرف لے جاتی ہیں، یا قوتِ حیات کی تحدید کا باعث ہوتی ہیں۔ اشار کی ابتدائی تقسیم اسی نقطہ نظر سے کی جاتی ہے، اشار یا تو نافع ہیں یا ضار، مفید ہیں یا نقصان رساں، اچھی ہیں یا بُری! عضویت پر جب ان کے اثرات کا رقبہ ہوتا ہے تو لذت، محبت، فریفتگی یا اطاعت پیدا ہوتی ہے، یا الم، نفرت، خوف اور وحش۔ ان میں سے ایک بالطبع محبوب ہے، مرغوب ہے، تو دوسری فطرۃً غیر محبوب و نامرغوب، ایک کے حصول کا وہ کوشاں ہوتا ہے تو دوسرے سے گریزاں انسان کی زندگی کا تار پود ہی جذبات ہیں، ان کا زور مردِ افکن ہوتا ہے۔ ان کے شر و شور سے اس کو فرصت ملتی ہے اور نجات، یہاں تک کہ زندگی کے مقررہ دن ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے:

من بلغ جہاں راقصے دیدم بس مرغش ز ہوا ہو سے دیدم و بس
از صبح وجود تا شبان گاہ عدم چون چشم کشودم نفسے دیدم و بس (سہالی استرآبادی)

اپنی زندگی کے مختصر قیام میں ہر شخص اشار کی تغیر و حدوث کا اچھا مشاہدہ کرتا ہے، کائنات میں ایک دائمی تغیر جاری ہے، کوئی شے ساکن نظر نہیں آتی، سکون و ثبات فریبِ نظر معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ذرہ کائنات میں ایک ٹرپ سی نظر آتی ہے، کارخانِ وجود کو کہیں قیام نہیں، شانِ وجود ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے، قمری تجلی ہر شے کو ہر لحظہ فنا کر رہی ہے اور حالی تجلی ہر لحظہ وجود بخش رہی ہے۔

ہستی کہ عیاں نیست دو آن در کائنات
در شانِ دگر جلوہ کند ہر آنے
اس نکتہ بجز زکل یومِ ہوقی شان
گر بایست از کلام حق بر ہلنے جاہی

اشار کے اس تغیر و تبدل، سکون و حدوث، فنا پذیری و زوال کی جہت جب چشم بصیرت رکھنے والے انسان پر نمایاں ہو جاتی ہے تو اپنے اپنے فقر و احتیاج کی وجہ سے ذل و افتقار یا انبیا کی نسبت جو ان سے قائم کر رکھی تھی، وہ یکدم کٹ جاتی ہے، ذواتِ خلق کا فقر اس کی نظروں میں واضح ہو جاتا ہے، اور اس کو اس ذات کی تلاش ہوتی ہے، جو حدوث و تغیر سے منزہ ہے، جو قائم بالذات ہے۔۔۔۔۔ جو واجب و قدیم ہے، صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہری، فعال ہے۔۔۔۔۔ سائے جہان کی مالک و حاکم و مولیٰ و رب ہے۔

❖

اب مذہب یا دین کا حاصل بھی اتنا ہی ہے، کہ ذل و افتقار کی نسبت (جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ذواتِ خلق سے قائم نہ کی جائے اور احتیاج اور مرادات میں استعانت ذواتِ خلق سے نہ کی جائے، بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذاتِ اللہ ہے، یہی مفہوم ہے اس دعوتی کلمہ طیبہ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ" کا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات قابلِ عبادت و مستحقِ استعانت (الہ) نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی فقر یا احتیاج کو رفع کرنے کے لیے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الہ" قرار دیتا ہے، خواہ یہ چیز عناصر سے ہو یا عبادات سے

نباتات سے ہو یا حیوانات سے، فوق العظمت ہو یا فوق البشر، ان سے رفع احتیاج کے لیے آغوش طلب کرتا ہے، اور استعانت کے لیے ان سے ذل و افتقار کی نسبت قائم کرتا ہے، اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پر نافع اور ضار خیال کرتا ہے، اور یہی خیال اس کو اپنے سے کم تر مخلوق کے لگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

جو اس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لیے دین حق کا پیغام محمدؐ (فداہ ابی و امی) نے عالم کو سنایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر، فطرت کا شہکار ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا۔ اس کی گردن اگر جھک سکتی ہے تو اسی ایک ہم خیر، ہمہ داں و ہمہ بین و ہمہ توان ہستی کے آگے، جس کے دست قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، جو جملہ صفات کمالیہ سے متصف ہے، اور تمام عیوب سے منزہ اور مبرا ہے، یہی ہستی ہماری الہ ہے، یہی قابل عبادت ہے، یہی مستحق استعانت ہے، یہی ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہماری رب ہے، مولیٰ ہے، حاکم ہے، اسی کے ہم مخلوق ہیں، مملوک ہیں، مرید ہیں، عبد ہیں، محکوم ہیں، اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں، اور اسی سے تمام حاجات و مرادات میں بھیک مانگتے ہیں، یہی ذات غنی ہے اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں، اس کے فقیر ہو کر ہم سائے عالم سے غنی ہیں۔

یہ پیام صدقِ محض ہے، ہماری عزت نفس کے عین مطابق ہے، حق و خلق کے رابطہ کا سچا اظہار ہے! اس کو مان کر انسان حقیقی معنی میں انسان بنتا ہے، بے جگر مجاہدین کی اُمید و ہم کام کر دہی ایک اللہ ہوتا ہے، جو سائے عالم کا مالک اور حاکم ہے اب مجاہد کی زندگی کی ہر جنبش اسی مالک و حاکم کے حکم کے تحت ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام کی تعمیل میں، امر کے امتثال میں وہ ایک جان دیتا ہے، تو ہزار جان پاتا ہے۔ اس کا ضعف قوت سے، اس کی ذلت عزت سے، اس کا فقر غنا سے بدل جاتا ہے۔ موجودات عالم میں سے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ نَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ کا حکم اس کو سارے عالم سے

لے اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو۔

بے خوف کر دیتا ہے، نہ وہ کسی سے اُمید ورجا رکھتا ہے، اَلَيْسَ اللهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ اس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے، ذواتِ خلق سے اُمید و ہیم کی نسبت کتنے ہی وہ نفس مطمئنہ حاصل کر لیتا ہے، اور اپنے رب سے راضی ہو جاتا ہے، اللہ کو راضی رکھ کر وہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے، اب وہ غنی عن اشیء ہے، کوئی چیز اللہ سے برتر ہو سکتی ہے، جس کے حصول کی وہ خواہش کرے، اب سب کچھ اسے حاصل ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے لَكَيْدًا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَاْتَاكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاكُمْ عَلُوْتُمْ تَكْمِيْنَ اسی کو حاصل ہے، وہی مخاطب ہے اس قول کا: اَنْتُمْ اِلَّا عُلُوْنٌ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ!

دیکھو! الہ کے فہم نے اس کو کیل سے کیا کر دیا، یا تو وہ ایک حقیر اور ذلیل جانور کی طرح ہر ایک سے ڈرتا اور لرزتا تھا، ہر ایک کو نافع و ضار قرار دیتا تھا، سرِ عبودیت خم کرتا تھا، مدد و اعانت کا خواہاں تھا، ان ہی کی عبادت و عبودیت میں زندگی گزار رہا تھا۔ مشوش پریشان حیران بخود ضعیف اور مطلوب بھی ضعیف "ضَعْفَ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوْبِ" یا اب علم رسالت کے جاننے اور ماننے کے ساتھ ہی لا کی ٹم شیر ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنے جاہل ہاتھیوں سے قرآن کے الفاظ میں پوچھتا ہے:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَأْمُرُوْنِيْ اَعْبُدُ اَيْهَا الْجَاهِلُوْنَ؟

تا چند گے از چوب گے از سنگ تراشی بگر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

غیر اللہ کی عبادت و عبودیت کا جو اوہ گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے، عمر میں پہلی مرتبہ حریت محسوس کرتا ہے، خوف کا بھاری پتھر اس کے سینے سے اُٹھ جاتا ہے، اپنے حقیقی مولیٰ کے آگے جھک جاتا ہے، اور ان کو رحیم پاتا ہے، اَنَّكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا كِي بشارت

لہ کیا اللہ بندہ کے لیے کافی نہیں۔

تھے تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو لاجہ نہ آیا، اور نہ ٹھنڈی کر واس پر جو تم کو اس نے دیا ہے۔

تھے تم ہی بلند ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

تھے لے جا لو کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا امر کرتے ہو۔

اس کو ہر طرح مطمئن کر دیتی ہے، اب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ اپنا
 کے بعد شانِ رحمت ہی سے پیش آئینگے، ان کے علاوہ رحیم ہونے کے حاکم و حکیم ہونا، اس
 کے دل کو اور قوی کر دیتا ہے، وہ انہیں اپنے ہر امر میں متصرف سمجھتا ہے اور ان کے ہر عمل
 کو سراسر حکمت سے مملو دیکھتا ہے، ان ہی کے حکم کے مطابق ان کو اپنے کاموں میں وسیل
 بناتا ہے فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ان کا فرمان ہے كَفَىٰ بِاِلٰهِنَا اَعۡلٰمًا وَكِيلًا کہہ کر وہ آزادی وطمینان
 کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے، اب کہاں یہ اور کہاں وہ جاہل جو غیر اللہ سے دل
 افتقار کی نسبت جوڑ رہا ہے۔ صحیح ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ
 وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۗ (الفاطر ۱۷)

دین کا اجمال، عبادت و استعانت، اس کا حاصل، تحفظ توحید۔ اب اس اجمال کی کسی

تفصیل ضروری ہے۔

عبادت غایتِ تذلل کا نام ہے جس کا اظہار عبودیت حقیقی کے آگے کیا جاتا ہے۔ اس کے
 معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں، نماز کے تمام اعمال و ارکان پر غور کرو۔ عبادت
 یا اظہارِ ذلت کا مفہوم بخوبی تمہارے دل نشین ہوگا، عابد نماز کا قصد کر رہا ہے، مصلے کی
 طرف بڑھ رہا ہے، زبان پر ہے۔ اِنِّیْ ذٰہِبٌ اِلَی رَبِّیْ سَیِّدٍۭیْنِ۔ دل غیر حق سے پاک
 ہی، حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بزرگی کا مستحق نہیں سمجھتا، اور اسی فہم کے ساتھ تکبیر تحریمۃ السداکبر
 کہتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے روبرو ہو کر کہتا ہے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ
 وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنِ۔ دل پوری طرح متوجہ حق ہے، ورنہ جانتا ہے
 کہ جھوٹ کی سزا کیا ہے يُجَادِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ اب نیت میں بھی خلوص بہ حق تعالیٰ

لے برابر نہیں اندھا اور دیکھتا اور نہ اندھیرا اور اجالا اور نہ سایہ اور لو، اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے

لے میں اپنے رب کی طرف چلا ہوں وہ میری ہدایت کریگا۔

لے دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دیگا۔

ہی کے لیے نماز پڑھ رہا ہے، عاشقانہ ایمان کے پیدا ہونے کے لیے پڑھ رہا ہے، عادت کے
 تحت نہیں، انہی کے حول و قوت سے پڑھ رہا ہے، ثنا میں حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت
 و جبروت کا اظہار کر رہا ہے، اور توحید کا اقرار لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ سے ہو رہا ہے، اب حضوری
 میں دست بستہ نظر بھی کیے ذلت و مسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے، زبان پر جاری ہر لفظ
 لِلَّهِ اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ عالم میں کوئی ذات مستحق حمد نہیں، سوائے محامد و محاسن کی
 وہی ایک ذات لا شریک لہ سزاوار ہے، جب رَبُّ الْعَالَمِينَ کہتا ہے تو جانتا ہر کَلَامَاتٍ
 سِوَاہِ، ربوبیت اسی کو زیبا ہے، عالم تمام اُس کا مرہوب ہے۔ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ کہتے وقت عالم
 رحام میں داخل ہوتا ہے، رحمت و کرم کی امید دل میں پیدا ہوتی ہے، جانتا ہے کہ رحمانیت
 کا تعلق تو ساری کائنات سے ہے، رحیمیت خصوصی شے ہے، اور مومنین سے مختص کَانَ
 بِالْمُؤْمِنِينَ سَرِيحًا، مَا لِكَ يَوْمَ الدِّينِ کہتے وقت عالم خوف کا مشاہدہ کرتا ہے، روز قیامت
 حق ہے، اور یہ وہ دن ہے کہ اس کی شان میں فرمایا گیا يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا۔ اس امید
 بیم کی حالت میں عرض کرتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ حق تعالیٰ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں، ذل
 و افتقار کا رشتہ آپ ہی سے جوڑتے ہیں، وَايَاكَ نَسْتَعِينُ آپ ہی سے استعانت کرتے ہیں، جانتے
 ہیں کہ لَا فَاعِلٌ فِي الْوَجُودِ إِلَّا اللَّهُ ما سوی اللہ سے بالکل اعراض کر کے آپ ہی کی طرف بالکل
 رجوع ہوتے ہیں، ہم آپ کے سوا استعانت کی جہت سے غیر کو کیوں پکاریں جب کہ ہیں یہ
 سنا دیا گیا ہے اور ہم نے بھی تجربہ سے اس کی توثیق کر لی ہے کہ آپ کے سوا کسی میں حول و قوت
 نہیں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ اس لیے کہ وہ نہ ہیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر، اس مدد
 ثنا و اقرار عبودیت کے بعد التماس و دعا اهدنا الصراط المستقیم حق تعالیٰ راہ مستقیم کی تہا
 فرمائے، نفس و ہویٰ سے چھوٹیں، آپ کا قرب نصیب ہو، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
 غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ اہل ایمان کی راہ پر چلنا نصیب ہو جو انبیاء و

لہ میں دن نہ کر کے کوئی نفس، کسی نفس کا کچھ۔

اولیاء کی راہ ہے، یہی اہل انعام ہیں وَالَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ
وَالصَّالِحِينَ۔ مغضوبین وصالین کی راہ نہیں جنہوں نے غیر اللہ سے عبادت و استعانت کا
رشتہ قائم کر کے ہمیشہ خسارہ میں اپنے کو مبتلا کر لیا۔ اُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ الَّذِينَ خَسِرُوا
أَنْفُسَهُمْ!

اس حمد ثنا، التماس و دعا کے ساتھ وہ کلام ربانی کی چند اور آیتیں احکام خداوندی
کے معلوم کرنے، تکرار سے ان کو اپنے ذہن میں جملنے، ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں کمانے
اور حق تعالیٰ سے سرگوشی کرنے کے لیے پڑھتا ہے، اور پھر فوراً پیشی میں جھک جاتا ہے، گویا اپنے
رحمان و رحیم آقا کے پیٹھ میں مونڈی دے دیتا ہے، اس طرح اپنی ذلت کا مزید اظہار کرتا
ہے، اسی حالت میں اس کی زبان سے اس کے مولیٰ کی تقدیس و تزیین و تمجید جاری ہوتی ہے
اپنی بے باگی، فقر و ذلت کا احساس قلب میں واضح طور پر موجود ہوتا ہے، جب سر اٹھاتا
ہے تو حق تعالیٰ اسی کی زبان سے فرماتے ہیں سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ اس طرح اس کا مرتبہ
بلند کرتے ہیں۔ جو سر معبود حقیقی کے آگے جھکتا ہے، وہ مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتا، وہ
سب سے بلند ہوتا ہے، ممتاز ہوتا ہے، بے نیاز ہوتا ہے، وہ ایک لاقیمت جوہر ہوتا ہے،
یعنی من رکن الی المولیٰ و مال الیہ احرق قالہ بنورہ حتی یصیرہ جوہراً لاقیمتاً لہ
اس سرفرازی کے شکر یہ میں وہ حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے، اور پیروں پر گر جاتا ہے، پیر کی پستی پر
اور اس طرح غایت تذلل کا اظہار کرتا ہے، زبان پر آقا کی عظمت و رفعت و علو کا اقرار جاری
ہوتا ہے! اس اظہار تذلل میں وہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک پاتا ہے و جعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ
یا آنکھ کی ٹھنڈک اس کو اپنے محبوب مولیٰ کے مشاہدے سے ہو رہی ہے، یہی اس کا کمال ہے
یہی اس کی معراج ہے۔ الصلوۃ معراج المؤمنین۔

یعنی جو اپنے مولیٰ کی طرف جھکتا ہے، اور اس کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنے نور سے جلا دیتا ہے، یہاں تک
کہ وہ لاقیمت جوہر ہو جاتا ہے۔

یعنی یہی آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ (لسانی باب عشرۃ النساء)

معبود کا نہ صرف خیر محض ہونا ضروری ہے بلکہ اس کا ہمہ توان یا قادر مطلق ہونا بھی لازمی ہے، یہ اپنی لامحدود قوت اور لامتناہی طاقت کی وجہ سے ہماری حفاظت کرتا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کرتا ہے، مرادوں کو بر لاتا ہے، اس کے اعتصام کے بعد ہمیں اس کی نصرت و اعانت کا قطعی یقین ہو جاتا ہے، شرک کے مسئلہ کی توجیہ سے عاجز ہو کر نتاجیہ (Pragmatism) نے خدا کے ہمہ توان ہونے کا انکار کر دیا، لیکن جو خدا قادر مطلق نہ ہو، وہ معبود حقیقی کب قرار دیا جاسکتا ہے، جو خود شر پر غالب نہ ہو ہماری مدد کیسے کر سکتا ہے، ہمارا مولیٰ اور نصیر کیسے ہو سکتا ہے۔ شرک کی توجیہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ہم اپنے معبود کو فعال مطلق، ہمہ توان مانتے ہیں، افعال و آثار کا مرجع اسی کو قرار دیتے ہیں، حول و قوت کا اسی کو مبدی سمجھتے ہیں، اسی لیے اس سے استعانت چاہتے ہیں، اور اس کے ”نعم المولیٰ ونعم النصیر“ ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ اعتصموا باللہ ہو مولکم نعم المولیٰ ونعم النصیر!

جب قوت صرف اسی کو حاصل ہو لا قوۃ الا باللہ حرکت کا بھی وہی مبدی ہو لا حول ولا قوۃ الا باللہ تو فعل جو حرکت و قوت ہی کا نتیجہ ہے، صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہوتا ہے اور ذاتِ خلق سے اس کی بالکل نفی ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھنے ہی اس کی بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے، اور وہ لا تتحرك ذرة الا باذن اللہ کے معنی سمجھ جاتا ہے، غیر اللہ سے استعانت کی نسبت کاٹ کر اسلم عبدی واستسلم کا مصداق بن جاتا ہے!

اپنے رب سے استعانت کے طریقے کیا ہیں؟ بصیرت محمدیہ نے جن طریقوں کی تعلیم فرمائی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

اپنی حاجتوں اور مرادوں میں حق تعالیٰ سے دعا کرو۔ دعا کا حکم ہے، اور اجابت کا وعدہ

لہذا نہ جدید کے فلسفیوں کا ایک گروہ جن میں ولیم جیمس، ایچ جی ولس، ہزارڈ شاؤ وغیرہ داخل ہیں۔

۱۰۰ تمہیں اپنے مولیٰ کا اعتصام چاہیے، وہی تمہارا اچھا مولیٰ ہے، اور اچھا مددگار۔

۱۰۱ کوئی ذرہ بغیر اللہ کے حکم کے حرکت نہیں کرتا۔

ادعونی استجب لکم من تعالیٰ جو دعویٰ محض ہے، عطا محض ہے، ان میں بخل کا شائبہ نہیں، یا یوسی و محرمی
ان کی درگاہ سے نہیں، تشریح کے لیے فرما رہے ہیں۔ لا تائسوا من روح اللہ۔ وہ حکیم بھی ہیں،
ان کا ہر فعل حکمت رکھتا ہے، وہ ہمارے خیر کو ہم سے بہتر جانتے ہیں، اگر وہ ہماری کسی دعا کو قبول
نہیں فرما رہے ہیں تو اسے نہ قبول فرمانے ہی میں ہمارا فائدہ ہے، اسی لیے کہا گیا ہے منع
عطاء مرد کا کمال اس میں ہے کہ ان کے منع کو عطا جانے، کسی عاشق نے اسی جذبہ کے
تحت کہا ہے:

اگر مراد تو اسے دوست نامرادی است مراد خویش دگر بار من نخواہم خواست
سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے لا ابالی علی ای حال اصبر علی ما
اکره او علی ما احب لانی لا ادری الخیر لہما۔ حق تعالیٰ خود ہیں تعلیم فرما رہے ہیں اور
ایک نہایت دقیق نکتہ کی تعلیم فرما رہے ہیں:-

عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ اَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ

يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (البقرہ - ۱۰)

اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف کہنے لگتا ہے، ہمہ آں باد کہ او خواہد آن مباد کہ ما خواہیم اور خواہ
شبلی نے عارف کی تعریف ہی اس طرح کر دی کہ ”عارف اوست کہ منع نزد او دست تراز
عطا باشد“ یہیں سے رضا کا مقام شروع ہو جاتا ہے، جو استعانت کا بلند ترین طریقہ ہے۔
بہر حال اگر حق سبحانہ تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت سے بندہ مومن کی دعا کو قبول نہیں فرماتا
تو اس کے قلب کی حفاظت فرما دیتے ہیں، مطلوب کی جانب سے خیال پلٹ دیتے ہیں

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ مجھے اس امر کی پروا نہیں کہ میں کس سال میں صبح کروں گا، ایسی حالت
میں جس کو میں پسند نہیں کرتا، یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لیے بھلائی
کس حالت میں ہے۔

اللہ شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں، اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز، اور وہ بری ہو
تمہارے حق میں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حکایت شکایت، جزع فزع کی طرف مائل نہیں کرتے، رضا کے مقام میں پہنچا دیتے ہیں، اور وہ لکل اجل کتاب کہہ کر حق تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے، اجابت دعا کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مطلوب تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ اس کی دعا کو رد نہیں فرماتے بلکہ اس کی کسی بلا کو دور کر دیتے ہیں، گو اس کو بدل کا علم نہیں ہوتا، ایک آخری صورت یہ بھی ہے کہ دعا اگر وہ دنیا میں نہیں پاتا تو آخرت کے لیے یہ ذخیرہ کیا جاتا ہے

ان العبد یروی فی صحائفیوم قیامت کے دن بند اپنے اعمال نامہ پر وہ نیکیاں

القیامت حسنات لا یعرفھا فیقال دیکھو، جن کو وہ نہیں پہچانیگا۔ اس سے کہا جائیگا کہ یہ

انھا بدلن سوالک فی الدنیا اس سوال کا بدل ہیں جو تو نے دنیا میں کیا تھا۔

لم یقدہ فضاہ فیھا (حدیث) لیکن تیرے مقدر میں دنیا میں ان کا لانا نہ تھا۔

ہر صورت اجابت دعا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ وعدہ مطلق ہے، مقید نہیں کہ اسی وقت اور اسی صورت میں پورا کر دیا جائے، جس وقت اور جس صورت میں کہ بند نے دعا مانگی ہے، فافہم۔ اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کیوں رسول عربیؐ نے اس کی تعلیم فرمائی تھی۔

اللہوا کفنی کل مہم من حیث شئت وکیف شئت وانی شئت ومن این شئت

استعانت کا دوسرا طریقہ اپنے کاموں میں حق تعالیٰ پر توکل کرنا ہے، اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو، محض علم نہیں، یعنی تحقیق ہو، محض تعقل نہیں، یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ اگر یہ بات ہمارے تحت شعوری نفس میں اتر گئی ہو، کہ فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہیں، کہنے والے خود بدولت ہیں، افعال و آثار کا مرجع خود ہیں، حول و قوۃ کا سبب خود ہیں، اور پھر اس کا بھی یقین ہو کہ ایمان کے بعد وہ رحیم بھی ہیں۔ کان بالمومنین رحیما۔ ولی ہیں، واللہ ولی المؤمنین۔ تو ہم اپنے تمام امور ان کو تفویض کرنے میں خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، اور اس تفویض کے ساتھ ہی فکر سے آزاد ہو جائیں گے، طمانیت و مسرت سے ہمارے

قلوب بھر جائیگی، اور کسی مست محبت کے الفاظ میں کہہ اُٹھیں گے۔

وكلت الی المحبوب امری كلہ فان شاء احيانی وان شاء اتلفانی

توکل اپنی حول و قوۃ سے بری ہونے ہے، اعتصام باللہ ہے۔ ذوالنون نے توکل کی تعریف اسی طرح کی ہے: التوکل ترک تدبیر النفس والاغلام من الحول والقوۃ، اور سری سقطی نے بھی ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے التوکل الاغلام عن الحول والقوۃ، ان تعریفوں کا ماخذ حدیث نبوی: لا حول ولا قوۃ الا باللہ اور قول عز و جل لا قوۃ الا باللہ توکل قلبی عمل ہے، یعنی قلب میں یقین جاگزیں ہو کہ مجھ میں اور کسی شے میں نہ اثر ہے نہ قوت ہے، نہ حرکت ہے، مجھ میں اور ہر شے میں اثر و قوت و حرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں، وہ جس طرح میرے خالق ہیں میرے افعال کے بھی خالق ہیں، خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ۔ میرے اقتضائے فطرت کے عین مطابق افعال کی تخلیق فرما رہے ہیں، میرا اقتضا، میرا اختیار ہے، لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جا سب سے ہو رہی ہے۔ اس لیے اسبابِ قطعیہ کے استعمال و اختیار کا مجھے حکم ہے، حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں جانتا ہوں کہ اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو تو جماع کو ترک نہیں کر سکتا، بھوک کی تشفی کے لیے نوالہ کا اٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اتارنا قطعی ضروری ہے، توکل یہاں تک عمل و تعطل کا نام نہیں، علم و حالت کا نام ہے، قلبی کیفیت کا نام ہے، اس یقین کا نام ہے کہ ہاتھ میں قدرت، حرکت، فعل سب حق تعالیٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہیں تو نوالہ منہ تک نہ پہنچے، ہاتھ شل ہو جائے، کھانا بھی چھن جائے، نظر ان کے فعل پر ہے، فضل پر ہے۔ اپنے زور بازو پر نہیں، کسب پر نہیں، دست بکا رول بیار! توکل ترک اسباب نہیں ترک رویت اسباب پر

میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔

مے توکل اپنے نفس کی تدبیر کو چھوڑنا اور اپنی حول و قوت سے نکل آنا ہے۔ مے حضرت شاہ میر قبلہ

مبادیات کو سمجھ جانے کے بعد رزق کے مسئلہ پر ذرا غور کرو۔ رزق کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ۚ وَهُوَ يُرْزِقُكُمْ وَمَا تَعْدُونَ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَتُحْسِنُ الصَّلَاةَ وَاللَّهُ يَرْزُقُكُمْ وَمَا تَحْسِبُونَ ۚ (رکوع ۱۱، حق تعالیٰ ان لوگوں کو بھی رزق دیتے ہیں، جو غفلت و معصیت میں مبتلا ہیں، فسق و فجور میں چور ہیں، پھر جو ان کی اطاعت و رعایت کرتے ہوں، وہ کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔ دیکھو جو درخت بوٹتا ہے وہی سینچتا بھی ہے! خلقت کو وہی مدد دیتا ہے، جو ان کا خالق ہے، مخلوق کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان کا خالق ان کو کافی ہے اَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدًا ۚ۔ ایجاد ان سے ہے، دوام امداد بھی ان ہی سے ہے، تخلیق ان سے ہوئی، رزق کا دینا بھی ان کے ذمہ ہے، اس کی مثال انسان اپنے نفس میں پاتا ہے، یہ جب کسی کو گھر پر دعوت دیتا ہے تو ان کے لیے غذا کا بھی انتظام کرتا ہے، حق تعالیٰ نے جب ہمیں اپنی مشیت و ارادے سے پیدا کیا ہے تو رزق کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، ان ہی کے خوانِ کرم سے ہمیں برگ و لوہا حاصل ہے، حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہم ان کے عبد ہیں، غلام ہیں، اب آقا پر غلام کا تفقد ضروری ہے، جس طرح کہ غلام پر آقا کی اطاعت واجب ہے، اگر ہم ان کے ہو رہیں، ان کے سوا نہ کسی کی عبادت کریں نہ کسی سے حاجت و مراد براری چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے وہ اپنا حق ادا نہ کریں؟ اس کی بشارت اس آیت کریمہ میں ملے ہے

مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۚ

يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ

۱۔ اور زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ پر نہیں۔ ۲۔ اور آسمان میں ہر روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو تم سے آسمان و زمین کے رب کی کہ یہ بات تحقیقی ہے جیسے کہ تم پہ لیتے ہو۔ ۳۔ مثالیں اِلْوَالِئِهَا اسکندری کی ہیں۔

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ
حَسْبُهُ .
ہر اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

رزق کا وعدہ قطعی، صرف ہمیں اپنا حق عبادت و عبودیت ادا کرنا ہے، پھر نامکن ہے کہ وہ ہمیں اپنے
گھر بلائیں اور پھر ہم اپنے احسانات سے محروم رکھیں، جو بخشی کریں اور پھر مدد نہ کریں، ہمت
کریں اور اپنے کرم سے محروم رکھیں، اپنا حق (عبادت) ہم سے طلب کریں اور ہمارا (حق) رزق
ہمیں نہ دیں؛ وہ کریم ہیں ان سے معاملہ کر کے ان کی خدمت ادا کر کے کون خسارہ میں مبتلا ہے
من الذي سألك فحرمته و لجا اليك فاهملته او تقرب اليك فأبعدته
او هرب اليك فطردته؟ (از اسبوع حضرت غوث اعظمؒ)

اسی خیال کے تحت کسی عاشق نے کہا ہے۔ "گمان تو انیت کہ از رزق چارہ نیست
اما رزق راز تو چارہ نیست" ۷

بدنہالی روزی چہ باید دوید تو بنشین کہ روزی خود آید پدید

ایک دوسرے عاشق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے :

ہیں توکل کن ملرزاں پاو دست رزق تو بر تو ز تو عاشق ترست

بہر حال اتباع نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن
اجسلاو فی الطلب کو پیش نظر رکھ کر اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقل
سبب یا قطعی علت نہیں، شاہ عبدالحق محدث دہلوی "شارج فتوح الغیب" نے مسئلہ کو
اجمالاً خوب ادا کیا ہے "بعد از طلب می یابی اما نہ بطلب می یابی" یہی مفہوم اس شعر میں ادا
ہوا ہے :-

بجستجوئے نیاید کے مراد دلی کے مراد سیاید کہ جستجو دارد

لہ وہ کون ہے جس نے تجھ سے سوال کیا، اور تو نے اس کو محروم رکھا، یا تجھ سے ملتی ہو اور تو نے اس کو بیکار
چھوڑا، یا تجھ سے ملاپ چاہا اور تو نے اس کو دور کر دیا، تیری طرف دوڑ کر آیا، اور تو نے اس کو دھتکار دیا۔
یعنی دنیا کمانے میں دل تو ڈکڑ کوشش نہ کرو۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جستجو کو مراد یا بی کی مستقل علت قرار نہ دینا چاہیے کیونکہ معارف فضل پر منحصر ہے، ہاں جستجو ضرور کی چلے، عادت الہی یہی ہے کہ حرکت میں برکت دیتے ہیں۔

استعانت کا تیسرا طریقہ مصیبتوں میں صبر کرنا ہے۔ دنیا دار الحزن ہے، دار الحزن ہے، "سجن" یا قید خانہ جو غم کی وادی ہے، شیطان کی دکان ہے۔ جس میں سوا شر و فساد کے کچھ نہیں،

أَفِ لِلدُّنْيَا وَأَيَّامِهَا فَانْهَ الْلَحْرْنَ مَخْلُوقَه
هُم مَهَلًا تَقْضَى سَاعَةً عَنْ مَلِكٍ فِيهَا أَوْ سَوْقَه

درویش ہو کہ شاہ، امیر ہو کہ گدا سب غم و ہم میں مبتلا ہیں ہدف بلا ہیں، لقد خلقنا الانسان في كبد - چونکہ حق تعالیٰ ہی ہماری غم سے آزمائش کرتے ہیں مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، رگلاتے ہیں اور ہنساتے ہیں وَأَنَّهُ هُوَ أَصْحَابُكَ وَأَنْتَ كُنِي - مارتے اور جلاتے ہیں وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتٌ وَأَحْيَا - اور غنی کرتے اور فقیر کرتے ہیں وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ وَأَقْنَىٰ - اس لیے حق تعالیٰ ہی ہمیں مصائب سے بچنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، اور وہ طریقہ صبر ہے، کیا حکیمانہ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْحُونَ

ایمان والو موجودہ مصائب پر صبر کرو، دو سروں کے ساتھ صبر راستگی سے کام لو (صابروا) اور ایسے کاموں میں ثابت قدم رہو جس کا وقت ابھی نہیں آیا (رابطوا) اور اللہ سے ڈرو اسی میں تمہاری فلاح و بہبودی ہے، یہی نجات کا راستہ ہے، صرف صبر اور حق تعالیٰ ہی کے حکم پر صبر لیا کہ رَبِّكَ أَوْرَقٌ تَعَالَىٰ هِيَ كَلِمَةٌ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ لَنْ صَبْرٌ كَرْنَسَ مَصَابٍ كِي بَرْدَا شَت سَهْلٌ هُوَ جَاتِي هِيَ، غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں، فکر کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اسباب کی راہ سے اگر انسان مصائب کو دور کرنا چاہے، غم سے گلغلا حاصل کرنا چاہے اور راحت کی امید باندھے تو سولے حسرت و یاس کے کچھ نہیں ملتا، مولانا

لے قول بھی بن معاذ - اللہ دنیا اور ایام دنیا پر افسوس ہو کہ وہ حزن و غم کے لیے بنائی گئی ہے، اس کے غم ایک گھڑی کے لیے غم نہیں ہوتے، خواہ بادشاہ کے لیے ہوں یا بازاری آدمی کے لیے۔
لے ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا۔ (الآیہ)

روم نے اسی چیز کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

گر گریزی با اُمید راتے ہم از آنجا پشت آید آفتے

ایسے کنجے بے دد و بے دامنیت جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

حق تعالیٰ سے اگر محبت ہو، اور مصیبت کو ان ہی کی طرف سے دیکھے، تو مصائب کا آسان ہونا ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم ایک تاریک کمرے میں ہو، کوئی چیز تمہیں آ لگی، اور تم تڑپ اٹھے، تمہیں معلوم نہیں کہ مارنے والا کون ہے، جب تم نے چراغ منگوا یا اور دیکھا کہ یہ تو تمہارا شیخ ہے، یا باپ ہے، یا کوئی عزیز، محبوب ہستی ہے جس سے تم کسی صورت میں آزار کی توقع نہیں کر سکتے تو تمہارا یہ جاننا بیشک تمہاری تسلی اور صبر کا باعث ہوگا۔ کیونکہ تم اس تکلیف میں بھی دقائق لطف کا معائنہ کرو گے۔ اسی طرح وَلِیْرَبَّکَ فَاصْبِرْ میں حق تعالیٰ اپنے بندہ خاص سے بطریق منت فرما رہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے لیے اس کے حکم و بلا پر صبر کر، کیونکہ ایمان کی حلاوت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ تیرا ہدف نہ بنے ۶

من ساختہ جاں را ہدف تیر بلایت!

اگر تم کو حق تعالیٰ کے بے حد مہربان، رحیم، اور ودود ہونے کا یقین ہو جائے اِنَّ اللّٰهَ بِکُمْ لَرُؤْفٌ رَّحِیْمٌ پر ایمان ہو گا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ پر اذعان ہو، اور وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ پر ایقان قائم ہو جائے، تو پھر تم اپنے دکھ درد کو پوشیدہ رحمت سمجھو گے۔ مثالوں سے اس نکتہ کو سمجھو، مشفق باپ اپنے بچے کو پچھنے لگاتا ہے لیکن دکھ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، فاسد خون جو اس کے بدن میں زہر ہے آسان طریقہ سے نکال رہا ہے، ماں اپنے چھوٹے بچے کو غلیظ دیکھنا نہیں چاہتی، صابون اور گرم پانی سے اس کو نہلاتی اس کے جسم کو رگڑتی اور مالش کرتی ہے، بچہ چیختا چلاتا ہے، دکھ محسوس کرتا ہے، لیکن ماں کا مقصد آزار پہنچانا نہیں ہوتا، تمہارا

۱۔ یہ مثال ابو العطا اسکندری نے دی ہے۔ پتھر پیرہیاں استعمال کی گئی۔

خیر خواہ طبیب تمہیں ایارح دیتا ہے، اور تم اُسے ناپسند کرتے ہو، لیکن اگر وہ تمہارے اختیار کا اتباع کرے تو شفا تم سے کوسوں بھلے گے، اگر تم کو کوئی ایسی چیز نہ دی جلتے جس پر تمہارا دم نکل رہا ہو اور تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ نہ دینا عین شفقت و مہربانی کے باعث ہے تو تم کہو گے کہ یہ نہ دینا ہی میرے حق میں دینا ہے۔ شیخ ابوالحسن شاذلی نے کیا خوب فرمایا ہے:

جان لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز نہیں عطا فرماتے تو ان کا نہ دینا ہی دینا ہے لیکن دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے جو صدیق ہے عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا

میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شائد پر بھی اسی طرح شکر فرماتے، جس طرح کہ نعمتوں پر الحمد لله علی مایساء ویتبرک

صرف ایمان کی ضرورت ہے اور شدتِ حب کی، ہر مصیبت کے وقت حق تعالیٰ کی جو تکلیف ہوتی ہے مومن کو اس تکلیف میں ایسی صلاوت نصیب ہوتی ہے کہ وہ سختیِ عم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے اور اکثر اوقات غلبہ تکلیف سے اس کو دکھ بھی نہیں محسوس ہوتا یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں نہ آرہی ہو تو زلیخا پر طعنہ کرنے والی حسین بیبیوں کے حال پر غور کرو۔ یوسف کے ہوش رُبا جمال سے وارفتہ ہو کر انہوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اور خبر بھی نہ ہوئی کہ درد کیا چیز ہے۔ فَلَمَّا رَا بَيْتَهُ اَكْبَرْتَهُ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ۔ زبانِ حال سے وہ کہہ رہی تھیں۔

این است کہ خوں خوردہ دل بردہ بسرا بسم اللہ اگر تاب نظر است کہے را شاید یہی معنی ہیں عرفا کے اس قول کے کہ "انسِ قرب سے اور اکالم مفقود ہو جاتا ہے۔ ایمان اور محبت میں پختہ ہونے کے بعد تم کو بیماریوں، بلاؤں، فاقوں میں وہ اسرارِ لطف و رحمت نظر آنے لگیں گے کہ تم کہہ اٹھو گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا اِحْفَظِ الْجَنَّةَ

۱۔ شاید تم کسی چیز کو برا مانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔
 ۲۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا اس چیز پر جو تمہاری معلوم ہو، اور جو خوش نظر آئے۔
 ۳۔ پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ۔

بالمکارۃ و محقت النار بالشہوات۔ بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ان سے ربط قائم کر لیتا ہے، اور سمجھوں سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے فانی ہو جاتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر سیرت سازی کے لیے کوئی اور شے نہیں، غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیاں دور ہوتی ہیں، قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے مدوح کا تجلیہ ہو جاتا ہے۔ بلاؤں غم کی وجہ سے اگر تم نے اپنے امراض قلبی کا معالجہ کر لیا، استقامت پیدا کر لی، تو یاد رکھو کہ غم نے تمہیں فوزِ عظیم کے حاصل کرنے میں مدد دی، اور ایسے غم پر ہزاروں خوشیاں قربان ہیں، وہ خوشیاں جن کی وجہ سے تم شہوتوں میں گرفتار تھے، ہو آؤ ہوس کے شکار تھے، ظلمتوں میں گھرے ہوئے تھے اور نور سے دور تھے! حق تعالیٰ سے تمہارا کوئی ربط نہ تھا، شیطان تمہارا قرین تھا، تم پر مسلط تھا، اور اس وعید کے تم مصداق تھے:-

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نَقِيضٌ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ۚ

بلا کے اسی فلسفہ سے واقع ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ افضل عیش (بہترین زندگی) ہم نے صبر میں پائی، حضرت ابو بکر صدیقؓ بیمار ہوئے، لوگوں نے عیادت کی اور کہا کیا ہم طبیب کو بلاؤں؟ فرمایا، طبیب نے مجھے دیکھ لیا۔ کہا کہ پھر کیا کہا؟ فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ اِنِّي فَقَالَ لِي مَا اُرِيدُ، معروف کرخی فرمایا کرتے تھے یس بصالح فی دعواہ من لم یلذذ بضرب مولاہ جو اپنے مولا کی ضرب سے متلذذ نہیں ہوتا وہ سچا غلام نہیں، اپنے دعویٰ عبودیت میں صادق نہیں، بعض عارفین کی جیب میں یہ لکھا رہتا تھا وَأَصْدِرُ لِحِكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے اور محض اس خیال سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھومتے رقص کرتے۔ رسول اللہؐ نے اس آیت پر

لے جنت تو ان باتوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں، اور دوزخ شہوتوں، خواہشوں سے گھری ہوئی ہے۔ لہذا اور جو کوئی آنکھ چرائے رگن کی یاد سے، ہم اس پر مقرر کردیں ایک شیطان پھر وہی ہے اس کا ساتھی۔ لہذا وہی کرتا ہوں جو میں چاہوں۔ لہذا اپنے رب کے حکم پر صبر کرو کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سلسلے ہے۔

وہد فرمایا تھا اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، اس لیے سلف کے بھڑ
بزرگ تعزیتِ مصائب یوں کیا کرتے تھے اصبر لحکمہ ربک اس کے ساتھ اس قول نبی
صلعم کا سنا دینا بھی مومن کی خاص تسلی کا باعث ہوگا:

اذا احب الله عبدا ابتلاه جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو مصیبت

فان صبرا لاجتباہ وان مرضی میں مبتلا کرتا ہے۔ اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ اور

اصطفاه۔ راضی ہے تو برگزیدہ بنا لیتا ہے۔

اب ایک کئی نفسیاتی قانون پر غور کرو، انسان کے لیے مصیبتوں اور آفتوں کا برداشت
کرنا اس وقت کسی قدر آسان اور سہل ہوتا ہے جب اس کو کسی اچھے بدل کی توقع ہوتی
ہے۔ مثلاً اگر میں اپنے وطن سے دور، اہل و عیال سے مجھ کو کسی جگہ تمام دن محنت و مشقت میں
گزار رہا ہوں، تو واقعی میرے لیے یہ ایک مصیبت ہے، لیکن میں اس کو مصیبت نہیں
سمجھتا، کیونکہ مہینے کے ختم پر مجھے اس کا معاوضہ معقول تنخواہ کی صورت میں مل جاتا ہے،
یہ میرے غموں کو بھلا دیتا ہے، میرے زخموں کے لیے مرہم کا کام دیتا ہے۔ اسی اصول کو
پیش نظر رکھ کر ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو قرآن کریم میں اس شخص سے کی جا رہی
ہیں جو مبتلائے مصیبت ہے اور صبر کر رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کی ساری
بھلائیاں صبر ہی میں رکھی ہیں!

امام احمد رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے کہ قرآن میں صبر کا ذکر نوٹے جگہ آیا ہے، ہم یہاں
چند بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو صابر کے حق میں آئی ہیں۔ اگر وہ ان کو پیش نظر رکھے ان
پر یقین و اذعان کے ساتھ تفکر کرے تو صحیح اُٹھے کہ "بلا از دوست عطا است و از عطا
نالیدن خطا است!"

صبر سے ہم حق تعالیٰ کے محبوب بنتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ لہ۔ اور جو

لہ اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حق تعالیٰ کا محبوب ہوا اس کو کس چیز سے حزن ہو سکتا ہے اور کس چیز سے خوف؟ صابر کو
 حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ** اور معیت سوکھی معیت نہیں
 جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں وہ کیسے ذلیل ہو سکتا ہے، کیسے مقہور ہو سکتا ہے، خلق اس کا
 کیا بگاڑ سکتی ہے؟ لاطاقة لمخلوق مع قدرة الخالق؛ صبری سے امامت و پیشوائی
 نصیب ہوتی ہے **وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يُهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا** خلق کی ہدایت کا
 منصب سپرد ہوتا ہے، صابر کے لیے اس کا صبر اعدا کے مکر و فریب کے مقابلہ میں ایک
 زبردست سپر ہے۔ **وَإِنْ تَصَابِرُوا وَاسْتَقْوُوا لَيُضْرِكَنَّ كَيْدَهُمْ شَيْئًا**۔ بالآخر ان پر غالب ہونا
 اس کے لیے یقینی ہے **فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ**۔ اس کا اپنے مطلب پر فائز ہونا ضروری
 ہے۔ **وَمَتَّ كَلِمَةَ رَبِّكَ الْحَسَنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا** یعنی تیرے پروردگار نے
 جو وعدہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا، یعنی دشمنوں سے نجات اور ملک و حکومت کے
 عطا کرنے کا وعدہ صبری کی وجہ سے ایفا ہوا، صابرین کے لیے غیر محدود اجر کا وعدہ ہے
إِنَّمَا يُؤْتِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ سلیمان بن قاسم نے کہا ہے کہ ہر عمل کا ثواب
 معلوم ہے، مگر صبر کا اجر "بغیر حساب" ہونے کی وجہ سے نامعلوم و ناقابل علم! حق تعالیٰ نے
 صابروں کے لیے اپنی رحمت، ہدایت اور صلوة یکجا جمع کیے ہیں۔ اور یہ اکٹھے ان کے
 سوا کسی اور کو نہیں دیے **وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا
 إِلَيْهِ رَاغِبُونَ**۔ **أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ**۔
 اگر درد گریزا، سریع الزوال، فانی درد صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے اور

۱۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ۲۔ اور کیسے ہم نے ان میں سے پیشوا جو بتاتے تھے ہمارے
 حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے ۳۔ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کے مکے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گا
 ۴۔ پس صبر کرو کیونکہ متقین کا انجام نیک ہوتا ہے۔

۵۔ اور بشارت دو صابرین کو جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو دہکتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی طرف رجوع
 کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے صلوات ہیں اور رحمت اور یہی ہدایت
 یافتہ ہیں۔

اس کی برداشت ناممکن بھی نہیں کیونکہ ناقابل برداشت تکلیف کسی کو دی بھی نہیں جاتی تو دیکھو اس کے معاوضہ میں کیا مل رہا ہے؟ کن چیزوں کا وعدہ ہو رہا ہے؟ اور کون وعدہ کر رہا ہے؟ کس کی زبانی وعدہ کیا جا رہا ہے؟ اگر تمہارے قلب میں ایمان کی شمع روشن ہے، اگر وہ "غلاف" میں نہیں باندھ دیا گیا ہے، اور نہ ہا نہیں ہو گیا ہے، اگر وہ ادراک کی قوت رکھتا ہے، اور ان حقائق کا ادراک کر رہا ہے تو کیا درد اس کے لیے ایک نعمت بے بہا نہیں، وہ اس سے ملتا نہیں ہوگا، اس کا مشاق نہ ہوگا، اور فرط اشتیاق میں یہ چیخ اس کی زبان سے نہیں نکلیگی۔

زہرِ غمِ دوستِ جرمِ شکرِ نیت این تیر نصیبِ ہر جگر نیت
بد کے دب آں حبیبِ جانی شیریں بود آنچہ تلخ می دانی!
اب غور کرو اس حدیث کے مفہوم پر:-

یتعاهد اللہ عبداً بالبراءۃ حق تعالیٰ اپنے بندے کی بلا کے ذریعہ خبر گیری کرتے
كما یتعاهد الوالد الشفیق ہیں اسی طرح جس طرح کہ مہربان باپ اپنے بچے کی
وَلَدًا خبر گیری کرتا ہے

صحابہ کرام کے یہی ادراکات تھے، اور ان ہی کی قوت سے انہوں نے اپنا سارا تن من دین اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہم
صبر کا ادب یہ ہے کہ زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جائے، سوئے حق تعالیٰ کے
اپنی مصیبت کا کسی سے گلہ نہ کیا جائے اِنَّمَا اشکو انبی وحرینی الی اللہ
دردم نہاں بہ زطیبیان مدعی باشد کہ از خزانہ غیبم دو اکتند

۱۔ ابو سعید سے مرفوعاً روایت ہے، دل چار طریقہ کے ہوتے ہیں (۱) اجرد (برہنہ) اس میں چراغ سا جلتا ہے، یہ مومن کا دل ہے، (۲) غلف جس کو غلاف میں باندھ دیا گیا ہو، یہ کافر کا دل ہے (۳) شکوے والا (دھما) یہ خالص منافق کا دل ہے (۴) تسفیح وہ دل جس میں ایمان و نفاق دونوں موجود ہیں، یعنی زبانی ایمان کا دعویٰ اور دل میں اس کا یقین نہیں۔ ۵۔ میں تو کھوتا ہوں اپنا اضطراب و غم اللہ کے سامنے۔

غور تو کرو کہ مخلوق سے شکوہ کرنے کے کیا معنی ہیں، یہی نہ کہ ایک صیغہ کریمہ کا ایک غیر صیغہ کریمہ ہے۔
 شکوہ کیا جا رہا ہے، ایسا شخص کبھی حق تعالیٰ کی اطاعت کی تلاوت اپنے دل میں نہ پائیگا،
 اس صبر یہ ہے کہ مصیبت کو چھپایا جائے، من کنوز البرکتان المصائب وما صبر
 من بئس لہ (حدیث انس مرفوعاً) لیکن مصیبت میں یا درد کی حالت میں زبان سے ہائے
 دے نکل جائے تو یہ منافی صبر نہیں بشرطیکہ ان سے شکوہ شکایت مقصود نہ ہو اور محض
 استراحت منظور ہو، کیونکہ کراہنے سے توجہ درد کی طرف سے ہٹ کر اس میں ایک قسم
 کی کمی محسوس ہوتی ہے، اسی لیے "انین" (نالہ) کی دوسری قسم کے متعلق حکم ہے کہ لا یکرہ و
 لا یقدح فی الصبر یعنی صبر کے منافی نہیں، اور پہلی قسم کو بہ روایت امام احمد قادیان صبر
 قرار دیا گیا ہے۔

بلا اور مصیبت کے وقت صبر کے معنی یہی ہیں کہ توافقی بالقضا کیا جائے، گو فطری
 طور پر درد و حزن ہو رہا ہو اور ہو گا کیسے نہیں یہ تو اقصائے بشریت ہے۔ انسان کامل،
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے انتقال پر فرما رہے تھے انا بفراقک یا ابراہیم
 حسونون (تیرے فراق نے اے ابراہیم ہمیں محزون کر رکھا ہے) لیکن عقلی صدمہ نہ ہونا چاہیے
 یعنی اس مصیبت کے واقعہ کو بے محل اور قبل از وقت خیال نہ کیا جائے، اس کے ساتھ
 توافقی کیا جائے، زبان پر ہو ۶

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود!

اور دل میں یہ خیال ہو ۶۔

جہاں دار داند جہاں داشتن

اب حکم کے تحت اسباب قطعہ کا استعمال جائز ہے بلکہ ضروری ہے، اور انسان
 کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ بغیر چارہ کار اختیار کرنے کے خاموش نہیں رہتی لیکن

نہ نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے جس نے اپنے مصائب کو ظاہر کر دیا اس نے صبر نہیں کیا۔

اسباب کے استعمال میں نظر اسباب پر نہ ہو سبب پر ہو تو اسباب میں اثر پیدا ہوتا ہے۔ علاج کا یہ طریقہ استعمال کیا جائے اس کے تمام اجزاء کو سمجھ کر ان کی پابندی کی جائے تو رفتہ رفتہ رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے، جو راحت کبریٰ ہے، دنیا میں جنتِ عالیہ ہے۔ استعانت کا چوتھا طریقہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے۔

انسان کی زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی، سنج بھی ہے اور راحت بھی، ظلمت بھی ہے اور نور بھی۔ قنوطیہ نے اپنی کوری عقل سے دنیا کے مبدہ ہی کو شر قرار دیا، اور بالآخر ہمہ شیطنت (Pandiaabolism) کے نظریے کے حامی بن گئے۔ ان کے تجربے میں دنیا بدترین دنیا ثابت ہوئی۔ سوائے غم و حزن کے کوئی شے انہیں حقیقی نظر نہ آئی، اس کے برخلاف رجائیت نے اس دنیا کو بہترین دنیا قرار دیا، غم و الم ان کی رائے میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہیں۔ تضاد سے لذت کی کیفیت میں اشتداد پیدا کرتے ہیں، حقیقی نہیں اعتباری ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں غم بھی حقیقی ہے، اور خوشی بھی حقیقی، ان میں سے کسی ایک کو التباس قرار دینا خود کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔ حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے، اس کی تصدیق ہر شخص اپنے تجربے سے ہر روز کر رہا ہے، وہ نہ بلا کو قائم پاتا ہے نہ نعمت کو ہر دم سے گزر رہا ہے، خوشی کے احساس کا انکار کر سکتا ہے، نہ غم کے ادراک کا، بلا و نعمت کا پایا جانا ان کا محسوس ہونا ہے اور ہمیں باہر کھلے کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ موجود ہونا دراصل محسوس ہونا ہی ہے (ESSBIST PEROCHI) بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماءِ جلالی بھی ہیں اور جالی بھی اور یہ ہر وقت مصروفِ عمل ہیں، ایک لمحظ کے لیے معطل اور بیکار نہیں۔ خیر و شر، رنج و راحت، لذت و الم، نعمت و بلا انہی کی تجلیات کا نتیجہ ہیں اور حقیقی ہیں۔

لے تصوریت کا ہانی اٹھارویں صدی مسیحی کا ایک نہایت فریب اور تیز فہم فلسفی ۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء
ماہ کے دھڑہ سے انکار کیا۔ کائنات غیر مادی روحانی شے ہے اور محض لغوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بلا سے نجات چاہتا ہے، اور نعمت میں اضافہ، بصیرت
 محمدی نے دونوں کے لیے قلبی طریقے بتائے ہیں، بلاؤں میں صبر اور نعمتوں میں شکر قلب النسانی
 میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرتے ہیں، اس کو ایک طرف تو نالہ، فریاد، ماتم، سینہ
 کو بی، یاس و قنوط سے نجات دیتے ہیں، اور دوسری طرف کبر، عجب، فخر، غرور، تجتر سے
 چھڑاتے ہیں، ان سلبی و مضر جذبات سے نجات پا کر وہ قوت، ہمت اور عمل کا مخزن بن جاتا،
 اور اس کے لیے کائنات کی تسخیر آسان ہو جاتی ہے، اس کی توانائیاں رائیگاں نہیں
 جاتیں صحیح جانب لگ جاتی ہیں، اور وہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہیں
 مصیبت میں صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ ارادہ بالکل شکستہ نہ ہو جائے، ہمت
 بالکل ٹوٹ نہ جائے، بلا کا بہا درمی سے مقابلہ کیا جائے، جو اس بجائوں میں چیز صبر
 سے حاصل ہوتی ہے، اور نعمت میں خطرہ اس بات کا لگا رہتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو
 بھول نہ جائے، جو تمام حسات و محامد کا منبع ہیں اور اس طرح اس منبع سے دور نہ ہو جائے
 اور ظلمتوں میں گرفتار نہ ہو جائے، شکر سے یہ خطرہ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ شکر کی حقیقت
 یہ ہے کہ نعمت کو حق تعالیٰ کی جانب سے دیکھا جائے، اپنی ذات یا خلق کی طرف
 اس کی نسبت نہ کی جائے، کیونکہ دراصل حق تعالیٰ ہی صنار ہیں اور نافع، نفع و
 ضرر انہی کے دستِ قدرت میں ہیں، گو جو اس کی نگاہ کو یہی نظر آتا ہے، کہ نعمت
 خلق ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی ہے، لیکن چشم بصیرت جانتی ہے کہ یہ محض بمنزلہ اسباب
 و آلاتِ نعمت ہیں، قاسم، مجری و فاعل و مسبب حق تعالیٰ ہی ہیں، وَمَا بِكُمْ مِنْ
 نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ جب انسان اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے
 تو وہ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، یہ ان کا قطعی وعدہ ہے، کسی استثناء کی گنجائش
 نہیں۔ لَٰئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَٰئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ جَابِتِ دَعَا، رِزْقٍ وَغْنَا، تَوْبَهُ وَمَغْفِرَتِ كَا اِنْخَصَا
 لے اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم (نعمتوں میں) اضافہ کرتے ہیں۔

اپنی مہنی پر رکھا ہے، لیکن شکر کے عوض زیادتی نعمت کا حصول بلا تکلف ہے، اسی لیے حضور
انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مَنْ نَزَلَتْ إِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا۔ جس کسی پر نعمت کا نزول
ہو اس کو چاہیے کہ شکر ادا کرے۔

سید مرسلان و مرسلِ راز داد فرمان بشکر نعمت و ناز
گلِ نعمت بوائے ہر کہ شگفت شکر آں روز و شب بیاید گفت
اس عظیم الشان صداقت کو جس پر نعمتوں کا بقا منحصر ہے اصح العرب و اعجم صلی اللہ
علیہ وسلم نے ایک اور نغیاتی طریقے سے ادا فرمایا ہے۔

النعمۃ وحتیۃ قیدھا نعمت ایک وحشی جانور ہے، شکر کی زنجیروں
بالتشکر۔ سے اس کو باندھ رکھو

خاتم ملکِ وحی و خاتمِ دین شکر فرمود برنجیف و سین
باز نعمت چو بہت وحشی را صید از قیدِ شکر کن اورا
چوں گزاری تو شکر نستیزد در شوی ناسپاس بگریزد

نغیاتی کا یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ انسان کو جب نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ
خوش ہوتا ہے، لیکن چند روز بعد یہ نعمت اپنی مانوسیت کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو
دیتی ہے، اب اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، اس کے وجود سے اس کو کوئی خاص
فرق اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوتا، اور باوجود ناز و نعم میں گھرے ہونے کے وہ ضیق محسوس
کرتا ہے، لیکن اگر یہ مفقود ہو جائے، یا ہاتھ سے چھین لی جائے تو اب اس کو اس کی قدر
ہوتی ہے، قدرِ نعمت بعد زوال اسی صداقت کا اظہار ہے، علاوہ ازیں احساسِ نعمت کا
مفقود ہونا گویا نعمت ہی کا مفقود ہونا ہے، اگر نعمت سے مجھے خوشی نہ ہو، کوفت ہو، تعب
ہو تو یہ میرے لیے نعمت نہیں زحمت ہے، ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں معلوم ہو گا
کہ از دیا در نعمت میں شکر کا کتنا دخل ہے۔ نعمت کے شعور سے نعمت کا بقا ہے، شعور کا فقدان

نعمت کا فقدان ہے، اسی لیے احساسِ نعمت کو زندہ رکھنا چاہیے، اور یہی چیز شکر سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری شکر کو "جالب" حافظا" کہتے تھے، کیونکہ وہ موجودہ نعمتوں کی "حافظ" اور مفقود نعمتوں کی "جالب" ہے۔ شکر سے نعمت سلب و نقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے، اور چونکہ شعور میں نعمتوں کے ادراک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی نعمتوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگتا ہے جو اس کے قبل نظر سے پوشیدہ تھیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکر سے نعمتوں میں قطعی اضافہ ہوتا ہے۔ الشاکر یتحقق المرید (شاکر زیادتی کا مستحق ہے) ایک نفیاتی صداقت ہے، اسی لیے ہمارے اسوۂ حسنہ کو جب بھی کوئی امر خوشی کا پیش آتا تو شکر الہی کی ادائیگی کے لیے سجدہ میں گر جاتے۔ (رواہ احمد)

انسان کی کچھ عجیب فطرت ہے، نعمتوں کو بہت جلد بھول جاتا ہے اور مصیبتوں کا ہمیشہ شکوہ کرتا رہتا ہے، کسی عرب شاعر نے اس پر خوب تہدید کی ہے۔

يَا أَيُّهَا الظَّالِمُ فَفَعَلْ وَالظَّالِمُ مَرْدُودٌ عَلَىٰ مَنْ ظَلَمَ
إِلَىٰ مَتَىٰ وَحَتَّىٰ مَتَىٰ تَشْكُو المَصِيبَاتِ وَتَنْسِي النِّعَمَ

ذرا ہیں اپنی ان نعمتوں کو دہرانا چاہیے جن کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، پہلے "نعمتِ نفع" کو لیجیے، پھر "نعمتِ دفع" کو دونوں بیٹھا رہیں۔ "نعمتِ نفع" میں آدمی اپنے صحیح و سالم قد و قامت پر نظر کرے، صحت و عافیت پر غور کرے، ان لذتوں کا خیال کرے جو کھلنے پینے اور جنسی خواہشوں کی تکمیل میں اس کو میسر ہیں، پھر نعمتِ دفع کے سلسلہ میں یہ دیکھے کہ وہ اپنا بیچ نہیں، ہزاروں بیماریوں سے محفوظ ہے، دشمنوں اور مخالفوں کے شر سے مامون ہے، صاحبِ ایمان پھر نعمت کو ایک اور لفظِ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کو "نعمتِ توفیق" بھی حاصل ہے اور نعمتِ عصمت بھی! نعمتِ توفیق یہ کہ

ہمارے اپنے فعل میں ظلم روا رکھنے والے مجھے معلوم ہے کہ ظلمِ ظالم پر لوٹ کر آتا ہو۔ کب تک اور کہاں تک تو مصیبتوں کا شکوہ کرتا رہیگا اور نعمتوں کو کھلانا چاہیگا؟

اس کو ایمان توحید، صدق و استقامت حاصل ہے، نعمتِ عصمت یہ کہ وہ کفر و شرک، نفاق و ارتداد، بدعت و فسق و غفلت سے محفوظ رکھا گیا ہے، اگر ان نعمتوں کی وہ تفصیلات میں جلے، ان کی جزا پر نظر کرے، اپنی صلاحیت و استعداد پر غور کرے، یہ دیکھے کہ اس کو ان نعمتوں کا کیا حق ہے، تو بے اختیار چیخ اٹھے۔

بے لطف تو من قرار تو انم کرد احسان تو شمار تو انم کرد

گر برتن من زباں شود ہر موئے یک شکر تو از ہزار تو انم کرد (ابوسعید منہ)

یعنی ہے ان تُعَدُّ مَا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو گن نہ سکو گے) اب ان لا تعداد احسان کا شکر انسان کیسے ادا کر سکتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ شکر ادا کرنے سے اپنے عجز کا جان لینا ہے، ادا کرنے کے ساتھ ہی ایک اور شکر لازم آتا ہے، کیونکہ شکر کی توفیق بھی تو حق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے، اور یہ توفیق خود ایک بڑی نعمت ہے، جس کا شکر ضروری ہوا، پھر اس شکر کا شکر، دہلم جراً الیٰ نہایت۔ اس لیے احسان و منت باری تعالیٰ کا مشاہدہ خود شکر ہے، ان کی نعمتوں کا اعتراف خود شکر ہے۔ ان کے حصول کے بعد مرضیات حق پر قائم رہنے کی دعا خود شکر ہے، ان پر حق تعالیٰ کی ثنا خود شکر ہے۔

حق تعالیٰ سے استعانت کے دوسرے طریقے اجمالاً یہ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ گناہوں

کے صدور پر توبہ کریں حق تعالیٰ مغفرت سے ہماری استعانت فرماتے ہیں۔ اِنَّكَ اَنزَلْتَ الْوَابِعِينَ غُفُورًا۔ وہ رجوع کرنے والے کو معاف کرتے ہیں، کتنا تسکین بخش اور محبت آمیز پیام ہے اِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ میں معاف کر دیتا ہوں اس کو جس نے توبہ کی، ایمان لایا، نیک عمل کیے اور پھر اس راستہ پر چلا، توبہ و ندامت سے گناہ کی سیاہی قلب سے محو ہو جاتی ہے۔ گناہوں سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے نیکیوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور تائب حق تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ۔

ہم نے اوپر تفصیل سے دکھلایا ہے کہ توبت والا اصلہ صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت

ہیں۔ لا قوۃ الا باللہ۔

ہماری خوف ورجا کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے تیاہ کے ساتھ ہی حق تعالیٰ ہمیں مخلوق سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں اور اس غنا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس قاتل جذبہ کے خنجر سے آزاد ہو جاتے ہیں جس نے سنگ پستوں کی زندگی کو سکون و طمانیت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ہے۔ یہ خوف کا جذبہ ہے جس نے ان کو سوتے جاگتے ہر وقت پریشان، مضطرب و حواس باختہ کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انہیں ہر کونہ میں ایک دام دکھائی دیتا ہے اور ہر گوشہ میں ایک درندہ!

اگر ہم اس امر میں حق تعالیٰ سے استعانت چاہیں کہ وہ ہمیں یاد رکھیں اور ہم سے راضی رہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم حق تعالیٰ کو یاد رکھیں اور ان کے ہر حکم و فعل سے راضی ہو جائیں فا ذکر و فی اذکر کھو۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کرونگا، اسی لیے حکم فرمایا کہ اذکر و اللہ ذکرًا کثیرا۔ اور ہمارے راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رضوا عنہ۔

آنا کہ رضائے حق بجاں می جویند در راہِ رضاے او بسر می پویند
ہر یک ہم آں کند کہ حق فرماید حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

اوپر جو کچھ ہم نے کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب یا دین مشتمل ہر دو اجزا پر عبادت و استعانت پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے قلوب سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو جاتی ہے۔ اس قلب کی عظمت کا کیا کہنا جس سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی ربوبیت و معبودیت ممکن ہو گئی ہے، جس کے الہ قطعاً اللہ ہیں، یعنی جس کے معبود، جس کے مسجود، جس کے مطلوب، جس کے مقصود قطعاً اللہ ہیں، جس کے رب جس کے مستعان قطعاً اللہ ہیں! اس قلب میں توحید کا جلوہ ہے، ایمان کا نور ہے، وہ نورانی قلب ہے، حق تعالیٰ کا محبوب ہے اور حق تعالیٰ

اس کے ذیل ہیں، کفیل ہیں، ولی ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، حنیظ ہیں اور ہادی ہیں۔
 اس ضمن میں چند تعریفات یاد رکھو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہے۔ ذات اللہ ہی کو الہ قرار
 دینا یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید
 ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہو جاتی ہے،
 جس ذات پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و
 تصدیق سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔ ایمان میں دو
 چیزیں ہیں اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صرف
 اللہ وحدہ لا شریک لہ کی الوہیت کی تصدیق ہے، توحید میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت و
 ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔ اس
 کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد
 ہے۔ یہ مثل شرک کے دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے، اور اس لیے ناقابلِ معافی
 اور بدعت بھی بُری بلا ہے۔ یہ دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا ہے، جو دین کی بات نہیں
 اس کو دین سمجھنا ہے۔ غیر شریعت کو شریعت بتلانا افراتفر علی اللہ ایک گونہ ادعائے نبوت
 ہے، بدعتی کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے، کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے، پھر توبہ کیوں کہے گا۔
 اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔
 قبل ایمان کفر و شرک سے توبہ لازم ہے، پھر ایمان یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
 کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار جس سے غیر اللہ کی معبودیت اور ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی
 معبودیت و ربوبیت متکثر ہو جائے۔ اب نفاق، ارتداد، بدعت، فسق و فجور سے
 احتراز ایمان اور عمل صالح پر استقامت، یہ ہے دین یا بندگی جس کے متعلق عارف
 روم نے کیا خوب کہا ہے سے

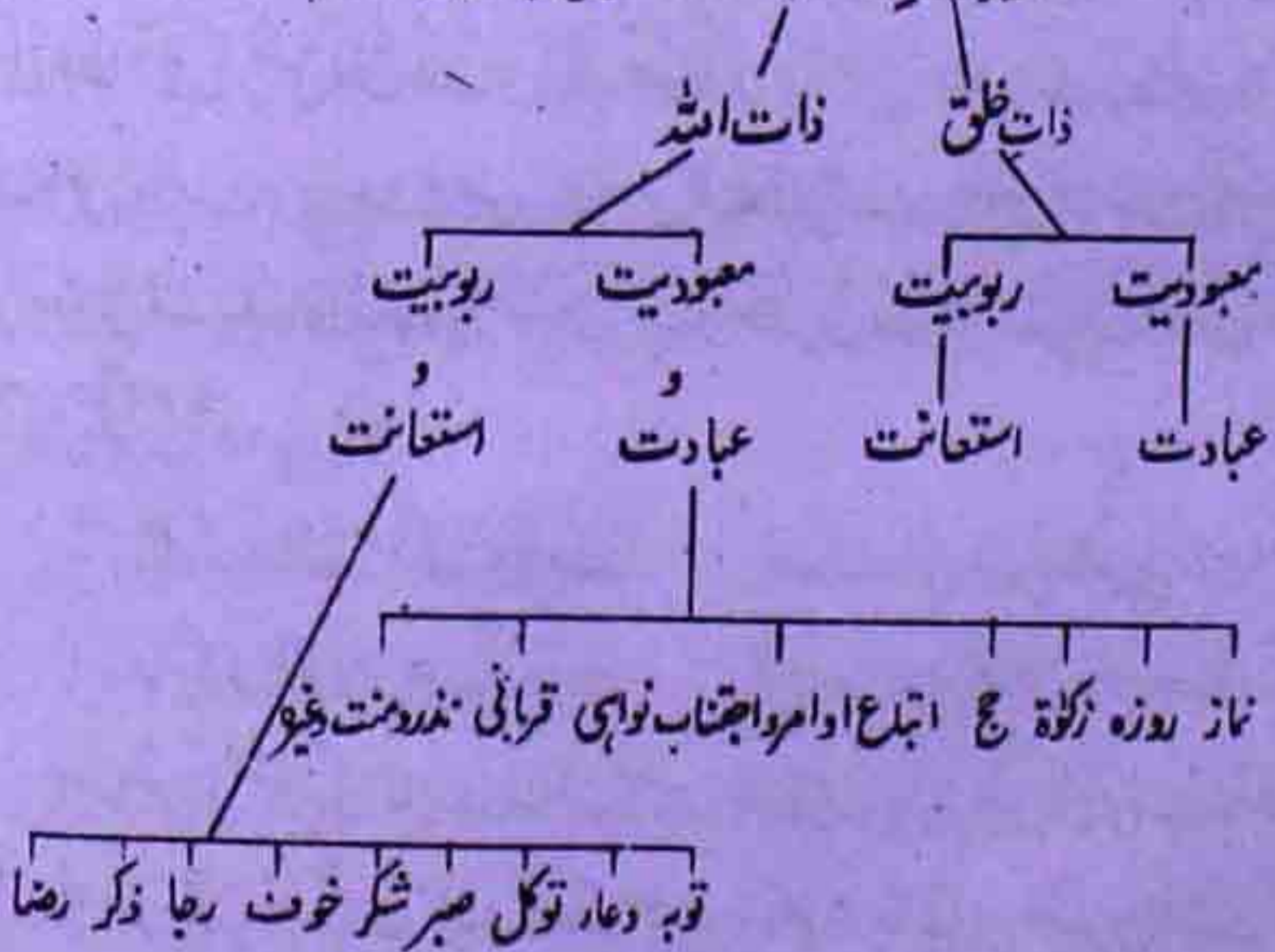
گر تو خواہی حرمی و دل زندگی بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی مقصود بہر بندگی است زندگی بے بندگی شرمندگی است
 جز خضوع و بندگی و اضطراب اندر میں حضرت ندارد اعتبار
 ہر کماند عشق یابد زندگی کفر باشد پیش او جز بندگی
 ذوق باید تا دید طاعات ہر مغز باید تا دید دانہ شجر
 قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ
 وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (یوسف ۱۲۶)

ضمیمہ

مندرجہ ذیل نقشہ سے دین کے سارے اجزاء کی تلخیص پیش نظر ہو جاتی ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ



توحید الوہیت

سیری بہ حریم جان و دل منزل کن قطع نظر از صورت آب و گل کن
 جز معرفت الہیچ است ہمہ بگذر ز ہمہ معرفتے حاصل کن: (سیری غزنی)

تخلیق عالم کی غایت کیا ہے؟ جن دانش پیدا کیوں ہوئے؟ ۶۹ از آمدن و رفتن ماسوئے کو
 فلسفیوں کو اپنے کودک عقل کے ساتھ کھیلتا چھوڑ کر (ذُرُّهُ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ) ہم اس اسکا
 سوال کے جواب کے لیے قرآن کریم کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مبدیہ علم حقیقی کا اور جو رب و شک
 ظن و تخمین، قیاس و وہم سے منزہ ہے! ہمیں ہمیں وہ نور ہدایت نصیب ہوتا ہے جس کو عقل نظری
 ہمیں عطا نہیں کر سکتی! اِنَّ هُدٰى اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰى! ہمیں مومن کے لیے یقین و اذعان کا ذخیرہ
 ہے۔ ہمیں ہدایت و ہدایت کا جلوہ ہے ہمیں علم حقائق ہے اور ہمیں طمانیت و تسکین۔ وَاَنَّ
 هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ ذٰلِكُمْ وَصَّوْكَمُ فِيْهِ
 لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ! (پ ۶۷)

علمی کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی اس واللہ کہ ہیرا بی ازاں تثنیہ ہی ست
 جائیکہ بود جلوہ حق حاصل وقت تابع شدن حکم خرد بولہی ست (شاہ ولی اللہ)

جن دانش کی تخلیق کی غایت صاف و سلیس الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے مَا خَلَقْتُ
 الْبَشَرَ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ عبادت کے معنی ہیں توحید۔ چنانچہ امام المفسرین حضرت ابن عباس
 کا قول ہے کہ قرآن کریم میں جس جگہ بھی عبادت کا ذکر آیا ہے اس کے معنی توحید کے ہیں۔ گو یا محاورہ قرآن

اسے یہ مقالہ رسالہ بران دہلی اکتوبر، نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔
 وہ راہیں ہمیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو امنیے تاکید حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔
 سے بخاری حدیث و قد عبد القیس۔

میں عبادت ہر جگہ توحید کے معنی میں آئی ہے "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے معنی ہونگے تو صدک و تطیعک اور ایا ای فاعبدون کا مفہوم ہوگا کہ میری ہی توحید تمہارے سینوں میں بس جائے۔ عبادت کی تعبیر توحید کے لفظ سے کرنے میں خوبی یہ ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عبادت صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے جو واحد لا شریک ہے۔ اس سے شرک کی قطعی نفی ہو جاتی ہے جس کو کسی دوسری جگہ کھول کر اس طرح بیان کیا گیا ہے **وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا** (۳۴) ہمیں اپنی عبادت و معرفت کے لیے پیدا کیا ہے، ہماری زندگی کا مقصود یہی عبادت و بندگی ہے۔ یہی عرفان یہی توحید ہے، تمام انبیاء نے اسی توحید الوہیت کو پیش کیا۔ یہی ان کی بعثت و دعوت کا اصل مقصود تھا۔

خواہم کہ ہمیشہ درہولے تو زیم خاک کے شوم و بزیر پلے تو زیم! (قاسم)
مقصود من خستہ زکونین توئی از بہر تو میرم و ہرے تو زیم!
تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا کہ **يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ** یعنی اے قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوائے تمہارا کوئی معبود و رب نہیں! **يَا آئِن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ** یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو! حضرت نوح نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا: **أَنِ اعْبُدُونِي** اور یہ عبادت اسی توحید و تقویٰ و اطاعت پر مشتمل ہے! حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب نے بھی انہی الفاظ سے کہ **يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ** سے اپنی قوم کو توحید کی طرف بلا یا۔ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو یوں مخاطب کیا **اعْبُدُوا اللَّهَ وَالْقَوَّةَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ** اور مشرکین سے اپنی برادری اس طرح ظاہر فرمادی: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ** (۹۴) انہوں نے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہ وصیت فرمادی تھی کہ **إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمْ الدِّيَارِينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** (۶۷)

اے تم اللہ ہی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک مت کرو۔ اے میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ان میں سے جو اللہ نے پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے۔ اے میرے بیٹو، اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا!

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہل فرعون کو یہی بات پہنچائی تھی کہ تم صرف اللہ ہی کو پوجو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی تعلیم، اسی دعوتِ توحید کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ نبی البنی الحاتم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حق تعالیٰ نے آپ کی ذات پر اس دعوتِ التوحید کو ختم فرمادیا، آپ کو ارشاد ہوا: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ الْأَكْبَرُ أَحْسَنُ وَبِئَاتٍ كَمَا هُمْ يَظُنُّونَ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ** (پ ۶۴)

عرض توحید الوہیت پر سارے انبیاء کے اولین و آخرین کا اجماع ہے، جو بھی رسول آیا وہ توحید کی دعوت لے کر آیا۔ **وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي**۔ (پ ۶۴)

اسی لیے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ** اسلام کا دعوتی کلمہ ہے جس میں توحید الوہیت اور رسالتِ محمدیؐ کو پیش کیا جا رہا ہے جن کا جان کر اقرار کرنا ایمان کے لیے ضروری ہے، فرضِ اول ہے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** صفت ہے اور باجماع اہل علم اس کے معنی "معبود" کے ہیں اور اس پر آیاتِ قرآنی دلیل ہیں ان میں سے بعض پر غور کرو۔

(۱) **وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهُ**
یعنی وہی ذات پاک آسمان اور زمین کا معبود ہے۔

(۲) **أَوْ هُوَ إِلَّا فَعْبُدُوا اللَّهَ عِندَ مَا تُشْرِكُونَ**
یعنی کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟

(۳) **وَجَادُوزَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَى قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَى**
ہم نے بنی اسرائیل کو دریائے پارا تار دیا پس ان لوگوں کا ایک قوم پرگڑبھا جو اپنے چند بتوں کو گئے پتھر

لے آپ کہ دیجیے کہ لوگوں میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھجا ہوا ہے جس کی بادشاہی کی تمام آسمانوں اور زمین میں اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سوا اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وہی نہیں بھیجا کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کیا کرو۔

أَصْنَاهُمْ لَهُمْ قَالُوا يَوْمَئِذٍ أَجَعَلْ
ہیں کہنے لگے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایک معبود اپنا
لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمُ آلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ
ہی مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے
قَوْمٌ يَجْهَلُونَ (پ ۱۶)

(۱۳) وَالنَّظَرَ إِلَى إِلَهِكِ الَّتِي ظَلَمْتَ
اور تو اپنے معبود کو دیکھ جس پر توجہ ہوا بیٹھا تھا ہم
عَلَيْهِ عَاكِفًا لِيُخْرِقَنَّ نَمَقًا لِنَسِيفَتِهِ
اس کو جلادینگے پھر اس کو دریا میں بکھیر دینگے بس
فِي الْيَمِّ نَسْفًا إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ
تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی
الَّتِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ
عبادت کے قابل نہیں، وہ علم سے تمام چیزوں کو
شَيْءٍ عِلْمًا
اعاطیے ہوئے ہے۔

(۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ اگر تم ایک کلمہ کا اقرار کر لو تو تمام عرب تمہارا
مطیع ہو جائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزار کر کے لگے۔ ابوہل نے خوش ہو کر کہا کہ بتلائیے وہ کلمہ
کیا ہے، ہم ایسے دس کلمے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ فرمایا دس نہیں بس ایک ہی کلمہ ہے لَا إِلَهَ إِلَّا
اللَّهُ۔ یہ سنتے ہی ان سب کو طیش آیا، کہنے لگے "أَجَعَلَ الْإِلَهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا شَيْءٌ
مُجْتَابٌ" (پ ۱۰۶) یعنی اس نے تو اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بہت ہی
عجیب بات ہے۔ (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ الہ سے مراد معبود ہے اور لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ سے اسی
توحید الوہیت کو پیش کیا جا رہا ہے جس کو سائے انبیاء نے پیش کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
وہی مستحق عبادت ہے اسی کی عبادت کی جانی چاہیے۔ اسی سے فقر و ذلت کی نسبت جوڑنی چاہیے۔
افراد عبادتِ اللہ ہی تمام پیغمبروں کے پیام کا حاصل ہے یعنی صرف اللہ ہی الہ ہے، غیر اللہ بحیثیت
إِلَهٍ قَلْبٌ مِّنْهُ فَمَا هُوَ جَلٌّ ۝

دل عاشق روتے تست با عہدِ دست
جاں طالب وصل تست از روزِ نخت
آن کس کہ ز جُست وصل تو هیچ نیافت
و آن کس کہ ترا یافت دگر هیچ نخت

توحید فی العبادت کی ضد تشریک فی العبادت! موحداً اللہ ہی کو اللہ مانتا ہے، یعنی اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے اور مشرک غیر اللہ کو بھی اللہ مانتا ہے اور اس کی بھی عبادت کرتا ہے۔ سورہ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر یعنی ابراہیم، اسمٰعیل، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، یسع، یونس علیہم السلام کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ نفوس قدسیہ حق تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو مشرک کرتے تو ان کی ساری طاعتیں باطل ہو جاتیں کیونکہ مشرک کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں۔ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (پ ۱۵۶)

تصریحات بالا سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس عالم میں انسان کی تخلیق عبادت معرفت کے لیے ہوئی ہے، اسی لیے تمام انبیاء و رسل توحید ہی کی دعوت کے لیے مبعوث ہوئے، انہوں نے بنی نوع انسان کو توحید فی العبادت کی طرف بلایا، مشرک سے ڈرایا، ہر ایک نے پاؤں بند فرمایا۔
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ -

نقطہ ادوارِ عالم لا الہ انتہائے کارِ عالم لا الہ!

اور جب مقصود زندگی توحید فی العبادت ہے تو ہمیں عبادت کے مفہوم پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔ مشرک کی ماہیت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے تاکہ جس مقصد کے لیے ہم پیدا ہوئے ہیں اس کے تحقق میں کامیاب ہوں اور کامیاب عمل ہونا بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں! یاد رکھو کہ یہ دور روزہ پر فریب زندگی اپنے مختلف ادوارِ طفلی و جوانی و پیری کی مخصوص نعمتوں اور بلاؤں سے گزر کر بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور آخری دور میں پہنچ کر ہم بیدل کے الفاظ میں کہہ اٹھتے ہیں :-

طفلی کہ زمانِ بازی می آراست	دامن افتابند
انگاہ جوانی کہ داغش پیداست	گل کرد و نماند
آنوں پیری نفس شماری دارد	بیدل چه علاج
ز بس نسخہ ہم آخر ورق چند بجاست	باید گرداند

لیکن ورق لٹنے کے بعد فقط ختم نہیں ہو جاتا۔ اب دنیوی زندگی کے اعمال کی جزا و سزا کا دور شروع

ہوتا ہے اور یہ بدی ہے، اس کی انتہا نہیں، یہاں تو سکھ ہی سکھ ہے یا پھر دکھ ہی دکھ۔ توحید پر خاتمہ
ہو تو سوائے سکھ کے کچھ نہیں اور اگر شرک پر دم توڑا تو سوائے دکھ کے کچھ نہیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیم
اور حضرت داؤد نے اپنی اولاد کو نصیحت فرمائی تھی کہ **فَلَا تَعْمُدُنَّ إِلَّا وَآنْتُمْ مُسْلِمُونَ!**
اب ذرا عبادت کے تضمینات پر تفصیل سے غور کرو۔

لغت میں عبادت نام ہے "غایت تدلل" کا یعنی نہایت درجہ کی خاکساری و نیاز مندی کا
اور شرع میں عبادت مراد ہے بندوں کے ان افعال و اقوال و احوال سے جن کا تعلق خاص طور پر حق
تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے ساتھ ہوتا ہے۔ عبادت اسلم جنس ہے اس کی بہت ساری انواع ہیں
(۱) عبادت اعتقادی: یہ اصل ہے سب انواع کی، اس کا دوسرا نام "توحید الوہیت" ہے،
جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ مجاورہ قرآن میں عبادت کے معنی اسی توحید کے ہیں۔ یہ اس امر کا اعتقاد ہے کہ
ایک اللہ ہی اللہ یعنی معبود رب واحد ہے، وہی خالق ہے، اسی کی سب خلق ہے اور اسی کا امر وہی
مالک ہے وہی حاکم، اسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر ہے، وہی مولیٰ ہے۔ اسی طرح الوہیت کے دوسرے
لوازم کا اعتقاد۔ لہذا دعا، نداء، استغاثہ، استعانت، التجار، رجا، خوف سب صرف اللہ ہی سے
ہوں، غیر اللہ سے نہ ہوں۔

(۲) عبادت لفظی: کلمہ توحید لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ محمد رسول الله کا زبان سے اقرار جس نے
دل سے اس کا اعتقاد رکھا لیکن زبان سے اقرار نہ کیا تو اس کا خون و مال محفوظ ہوگا اور جس نے

لَهُ ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا
بالجنة التي كنتم توعدون، نحن اولياءكم في الحياة الدنيا وفي الآخرة ولكم فيها ما تشتمون
انفسكم ولكم فيها ما تدعون، نزلا من عنده الرحيم ربي ۱۱۸۶ بن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ
ہے، پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اترینگے، کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ سنج کر دو، اور تم جنت پر خوش رہو، جس کا تم
سے وعدہ کیا جا یا کرتا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں اور عقبی میں بھی رہینگے اور تمہارے لیے جس چیز کو تمہارا
ہی چاہیگا موجود ہے اور نیز تمہارے لیے اس میں جو مانگے موجود ہے۔

لَهُ انتم من يشرك بالله فقد حرم الله عليه الجنة وما دار النار رب ۱۱۸۶ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ
شرک قرار دیا سو اس پر اللہ جنت کو حرام کر دیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

زبان سے کہا گردن سے معتقد نہ ہوا تو اس کا خون و مال تو بیخ گیا لیکن وہ منافق ہے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

(۳) عبادتِ بدنی: جیسے قیام و رکوع و سجود نماز میں۔

(۴) عبادتِ صوم و افعالِ حج و عمرہ جیسے طواف، ذبح، نحر، حلق وغیرہ

(۵) عبادتِ مالی: حق تعالیٰ کے امتثال امر میں انفاق مثلاً زکوٰۃ، صدقہ۔

اسی طرح واجبات و مندوبات کی افعال و اقوال، اموال و ابدان میں اور انواع ہیں جو عبادت میں داخل ہیں، ان کا حصر یہاں ضروری نہیں، صرف اہماتِ عبادت کی یہاں تصریح کر دی گئی۔ کلی طور پر یوں سمجھو کہ نبی نفع کے لیے مخلوق جو کام کرتی ہے وہ عبادت ہے۔ اگر اس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے (أَذِنَ بِالله) ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، اگر اس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی وہ (مَالَهُ يَأْذِنَ بِالله) ہے تو وہ غیر اللہ کی عبادت ہے۔

خوب سمجھ لو کہ شرک واقع ہوتا ہے عبادت کے ان ہی افعال اور عقائد میں۔ بنی نوع انسان کے اکثر افراد عبادت ہی کے معاملہ میں شرک میں گرفتار ہوتے رہے۔ انہوں نے غیر اللہ کو اپنا الٰہ یا معبود قرار دیا، اپنے نفع کے لیے ان کی مرضی کا اتباع کیا یعنی اپنا نفع و ضرر سمجھا، باعتبار نفع و ضرر ان کی تعظیم کی، وقت حاجت ان سے فریاد رسی چاہی، ان سے استعانت کی، ان کو پکارا ان سے التجا کی، استغاثہ کیا، رجا و خوف کا تعلق ان سے رکھا، ان کی نذر و نیاز میں اپنے مال کا ایک حصہ صرف کیا اور ذبح و نحر سے ان کا تقرب چاہا۔ غرض فقر و قلت کی نسبت ان سے جوڑی، ان کے سامنے خضوع کیا اور جب انہیں کرام نے انہیں افراد عبادت اللہ کی دعوت دی، توجیہ فی العبادت کی تلقین کی انہیں للکاراکہ

تا چند کہ از چہب گرازنگ تراشی بگذر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

تو ان مٹکرین نے از راہ تکبر و عناد پلٹ کر پوچھا اَجِثْنَا لِلْبَعْدِ اللهُ وَحْدَهُ وَذَكَرْنَا مَا كَانَ بَعْدَهُ
اباؤنا؟ رپٹ ۵۶ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہم سے یہ کہو کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے

باپ داد کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ أَجْعَلُ الْآلِهَةَ الْهَاءُ وَاحِدًا، إِنَّ هَذَا الشَّيْءُ عَجَابٌ (پہلے ۱۰) یعنی بڑے تعجب کی بات ہے کہ سب معبودوں کو اس شخص نے تو ایک معبود کر ڈالا۔

دیکھو ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے، مگر تھے اس پر ایمان رکھتے تھے، ان کو اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ (پہلے ۱۳) زمین و آسمان کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْغَيْرُ الْعَلِيمُ۔ رزاق بھی وہی ہے۔ محی و ممیت بھی وہی اور مدبر امر بھی وہی: قُلْ مَنْ يُرْزَقُ مِنْ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ (پہلے ۱۹) اسی کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہی ہر شے کی پناہ گاہ ہے: قُلْ مَنْ يَبْدَأُ فَالْكَوْثُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ، سَيَقُولُونَ اللَّهُ قُلْ فَأَنِّي تُسْحَرُونَ (پہلے ۵۶) وہی آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک اور رب ہے: قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، سَيَقُولُونَ اللَّهُ، قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ (پہلے ۵۶) زندگی گزارنے کے قانون میں اپنے کو آزاد سمجھتے تھے، ہدایت رب کا محتاج نہ جانتے تھے۔

فرعون جس کو کفر میں اتنا غلو تھا اس کے متعلق بھی حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی زبانی کہلوا یا ہر۔ لَقَدْ عَلِمْتَمَا أَنْزَلَ هَؤُلَاءِ أَوَّلَ آيَاتِ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بِصَافَرٍ (پہلے ۱۲۶) تو یہ خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات فاص آسمان و زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لیے ذرا نوح ہیں، اور تمام مشرکین کے بائیں میں ابلیس لعین تک نے کہا۔ اِنِّي اخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ۔ نیز رب النظر فی اور رب بما اغویتنی؟

صاف ظاہر ہے کہ ان مشرکین کا جرم "اشراک فی الذات" نہیں تھا، یعنی یہ اللہ کی ذات کے برابر کسی غیر کو واجب الوجود یا ازلی وابدی نہیں مانتے تھے، اور نہ ان کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکار تھا۔ سوالے ثنویہ کے دنیا میں کوئی فرقہ اس کا قائل ہی نہیں ملتا۔ مشرکین کہ تو حیدر بوبیت تک، کے مقرر

تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی خالقیت اور رزاقیت، مالکیت و حاکمیت و ربوبیت کو مانتے تھے اور غیر اللہ کو حق تعالیٰ ہی کا مربوب، مرزوق، مخلوق، مملوک و محکوم جانتے تھے چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے۔ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكَ هَوْلًا مَلَكًا وَمَلَكًا يَعْنِي "اے اللہ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی شے کا مالک نہیں۔"

اس طرح وہ نہ صرف حق تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر رہے ہیں بلکہ اسی کو مالک و حاکم قرار دے رہے ہیں اور اسی کی ربوبیت کے قائل ہو رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس اعتراف و خودبارگی اور اس کی الوہیت و ربوبیت کے انہیں کافر و مشرک کیوں ٹھہرایا گیا، ان کے تمام نیک اعمال کیوں ضبط اور برباد قرار دیے گئے۔ خلود فی النار کی وعید ان کو کیوں سنائی گئی؟ ان کا یہ ایمان بالمشہد کیوں ان کی جان و مال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ کر سکا؟ اس ایمان کے باوجود اعداء اللہ کیوں قرار پائے؟ ان کو کذاب، مسحور، ظالم کیوں کہا گیا؟ ان کا شمار "مملکین" میں کیوں ہوا؟ انہیں بے عقل حیوان بلکہ ان سے بدتر کیوں ثابت کیا گیا؟ اِنْ هُمْ إِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا؟ کا فیصلہ ان کے متعلق کیوں فرمایا گیا؟

اس کا جواب تم اوپر پڑھ چکے ہو وہ ایک لفظ میں صرف یہ ہے: اَشْرَاكٌ فِي الْعِبَادَةِ: ہر قوم اور ہر امت کے لیے ایک نبی مبعوث ہوا اور اس نے "توحید فی العبادت" ہی کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اِنْ اَعْبَدُوْا اللّٰهَ (پ ۶) حَضْرًا تُوْرًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے بھی لوگوں کو افراد عبادت الہی کی طرف بلایا کہ جس طرح تم افراد ربوبیت کے میسر ہو، اللہ ہی کو رب جانتے ہو، اسی طرح اللہ ہی کو معبود جانو۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قائل ہو جاؤ اس کے معنی و مقصدی پر عمل کرو، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، تمہاری ساری عبادت سر اوعلانیہ قلبی و قلبی طور پر فالص اللہ کے واسطے ہو۔ استعانت ہو یا استغاثة، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت یا پستش کی کوئی سی شکل صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہو

اس وقت غیر کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ آئے! تم اللہ ہی کے فقیر ہو، ذل وافتقار کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لو، جھوٹے معبودوں سے اپنی بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لو، ان سے نفع و ضرر کی توقع مطلقاً چھوڑ دو، اللہ تمہارے لیے بہر حال کافی ہے۔ **الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ أَسْخَاءٌ**۔ انہیں صرف اللہ ہی کا ہو کے رہنا چاہیے۔ **إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** باخلق آشنا نہ شود مبتلائے تو بیگانہ باشد از ہمہ کس آشنائے تو

میخواہم از خدا بد عاصد ہزاران جاں تا صد ہزار بار بمیرم ہائے تو

مشرکین نے اس پیغام کو سن کر کہا دیکھو ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانتے بلکہ ان کو اللہ ہی کا مخلوق اور بندہ مانتے ہیں اللہ ہی کو مالک و حاکم و رب سمجھتے ہیں مستقل معبود بھی اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے بتوں کو اللہ ہی کی ہلک سمجھتے ہیں، ہم ان کو محض اپنا شفیع (دکیل اور سفارشی) جانتے ہیں۔ ہم ان کی عبادت اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت کی وجہ سے ہماری سفارش یا شفاعت اللہ تعالیٰ کے پاس کر سکتے ہیں **هُوَ الَّذِي يَشْفَعُ لَكُمْ إِذَا أَنْتُمْ تَعْبُدُونَ** ان کی عبادت ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی و غصے سے چھڑا کر اس کا قرب عطا کر سکتی ہے۔ **مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ** (پ ۱۵۶) یہی ان کا کذب، کفر اور شرک تھا! **إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ** (پ ۶) **سُبْحٰنَكَ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ** (پ ۶)

اب ذرا اسی موقع پر تحقیق کر لو کہ ان مشرکین کے معبود کون تھے جن کو وہ شفیع اور مقرب سمجھ رہے تھے؟ امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے ان کی تحقیق کی رو سے بت پرستوں (ہابدان اوثان) کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں کیونکہ انبیاء میں سب سے پہلے نبی جن کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور حیب انہوں نے ان بت پرستوں کو توحید معبودیت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا **اعبدوا الله واتقوا واطيعوا** (پ ۱۵۶) تو ان بت پرستوں نے ان کی دعوتِ شب ورون کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ

لَا تَدْرِيْنَ إِلَهِيَّتِكُمْ وَلَا تَدْرِيْنَ وَدَّاءَ وَلَا سَوْءَاءَ وَلَا يَعْزُبُكَ وَيَعُوقُ وَتَسْرًا يَعْنِي تَمَّ لِنِي

معبودوں کو پہر گز نہ چھوڑنا اور نہ ود کو اور سوع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نہ سر کو چھوڑنا

اب ان کے یہ معبودانِ باطل و دوسوع وغیرہ کون تھے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے نشان دہی کی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ

تھے، ان کی موت کے بعد ان کے بیٹھنے کی جگہ پر ان کے نشان قائم کیے گئے، ان کا بھی وہی

نام رکھا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ان نشانوں کی پریش شروع کر دی گئی۔ اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح

یہ بزرگ زندگی میں مجاب الدعاء رہے ہیں، روزِ حشر بھی مقبول الشفاعت رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ

کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان ہی کے حال کی خبر ہمیں اس آیت میں دی گئی ہے:

يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا

نَصْرُ لَهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ

هُوَ لَا يَشْفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ قُلْ

أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ اللَّهُ بِمَا لَا تَعْلَمُونَ فِي

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بَشِيرًا

وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ (پ ۷۶)

یعنی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت

کرتے ہیں جو شان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو فزع

پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے

سفارشی ہیں آپ کہہ دیجیے کہ کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر

دیتے ہو جو خدا کو نہیں معلوم، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین

میں وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔

اس تحقیق سے صاف ظاہر ہے کہ بت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بتوں کو معبود

نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی بت پرستی کا فشار اولیا و انبیاء وغیرہ کی تعظیم تھی۔ انہوں نے اپنے بتوں

کو انہی کی صورت پر تراشا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع سمجھ کر اپنا سر نیا زان کے سامنے

جھکتے تھے۔ اس طرح وہ اصل میں ولی پرست، اصنام پرست اور بتی پرست تھے! اب ذرا فخر رازی کی

عبادت بھی سن لو جو اوپر کی آیت کی توجیہ و تفسیر میں انہوں نے لکھی ہے۔

انهم وضعوا هذه الاصنام والاولئان یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اولئان اپنے انبیاء و

علی صوم انبیاءہم واکا برہم ورتلوا اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ

انھم متی اشتغلوا بالعبادة هذا التماثل جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہونگے تو یہ اکابر
 فان اولئك الاکابر تکتون شفعاء ہم اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے اس کی نظر
 عند الله تعالى ونظيره في هذا الزمان اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں
 اشتغال کثیر من المخلوق بتعظیم قبور سے مشغولیت ہے اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان
 الاکابر علی اعتقاد انھم اذا عظموا قبورهم قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے
 فانھم یكونون شفعاء لهم عند الله شفیع ہونگے۔

اوپر کی توضیحات سے مندرجہ ذیل چار امور صاف طور سے لازم آتے ہیں۔ انہیں خوب
 ذہن نشین کر لو:-

(۱) زمانہ قدیم کے بت پرست حقیقت میں انبیاء پرست اور اولیاء پرست تھے جن تعالیٰ نے
 انہیں "مشرک" قرار دیا۔

(۲) وہ خود اس امر کے قائل تھے کہ بت ہمارے بالاستقلال معبود نہیں بلکہ بالاستقلال ہمارا
 معبود اللہ ہی ہے اور یہ صرف ہمارے سفارشی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو شفیع یا سفارشی
 جان کر بھی اس کی عبادت کرنا موجب شرک ہے (یعنی کسی کو سفارشی یا شفیع بھنا یہ شرک نہیں
 ہے بلکہ ان کی عبادت اس لیے کرنا کہ ہماری سفارش کریں گے یہ شرک ہے۔

(۳) جو افعال عبادت ان مشرکین سے صادر ہوئے اگر کسی کلمہ گو سے بھی صادر ہوں تو اس
 پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کا دعویٰ اسلام اور اس کی کلمہ گوئی اطلاق شرک سے
 مانع نہ ہوگی چنانچہ اسی وجہ سے امام رازی نے گور پرستوں کو بت پرستوں کا نظیر قرار دیا۔
 (۴) جب غیر اللہ کو شفیع جان کر ان کی عبادت کرنا شرک ہوا تو پھر ان کو بالاستقلال عالم
 میں متصرف جان کر پوجنا تو بدرجہ اولیٰ شرک ہوگا۔ مثلاً اولیاء و انبیاء سے اولاد مانگنا، رزق کی
 کشادگی چاہنا، قضاء حاجات کی دعا کرنا وغیرہ۔

۱۔ تفسیر کبیرہ ص ۳ ص ۵۵۲ سورہ یونس تحت آیہ ہولاء شفعاء عند الله۔

مشرکین کی عبادت بس یہی تھی کہ وہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و مشفع اور نافع و ضار بنان کر ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے اور

(۱) ان سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے۔

(۲) اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان سے منتیں مانگتے

ان کے لیے جانور ذبح کرتے اور ان کے ارد گرد پھرتے یا طواف کرتے تھے۔ گو وہ حق کی ربوبیت

کے قائل تھے اور اس کو خالق و رازق، محی و ممیت، مدبر زمین و آسمان مانتے تھے: فایومن

اکثرہم باللہ الا وہم مشرکون!

اب قرآن کریم کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ نداء، دعا، استغاثہ، استعانت، نذر، طواف وغیر

سب افعال عبادت ہیں، جب حق تعالیٰ ہی معبود رب واحد و احد ہیں تو پھر ان افعال کا تعلق

صرف انہی سے ہونا چاہیے اور کسی غیر سے نہیں اَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تَشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا (۳۶) یہی ہے "افراد

عبادت اللہ فاعبدوا اللہ مخلصاً للدين، الا للہ الدین الخالص" (۱۵۶) مشرکین نے ان کا تعلق

غیر اللہ سے روار کھا تھا اور اسی لیے انہیں تہدید کی گئی تھی کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی

تم جانتے ہو کہ حق تعالیٰ کا کوئی ندا، ہمسر نہیں پھر تم کیوں غیر اللہ کی عبادت کی کہ ان کو معبود قرار دے

کہ انہیں حق تعالیٰ کا ہمسر بنا رہے ہو، تمہارا یہ عقیدہ کہ اگر تم ان کا تقرب ندا و دعا، نذر و نیاز، ذبح و نحو

طواف و عکوف کے ذریعہ حاصل کرو گے تو یہ تمہیں حق تعالیٰ کے "قرب" کر دینگے اور تمہارے شفع بن

جائینگے قطعاً باطل ہے کفر بحت ہے، شرک محض ہے!

دعا عبادت ہے دعا (دعوت، دعا، دعویٰ) کے معنی ندایا پکارتے ہیں۔ اس پر الم لغت کا اجماع ہے۔

چنانچہ امام رابع نے اپنی مفردات میں تصریح کی ہے کہ الدعاء کالنداء یعنی دعا ندا کے معنی میں ہے۔ صراح

میں بھی دعا بمعنی خواندن ہے۔ مدارک میں ندا اور دعا کا فرق و امتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا ہے: النداء

ما یسمع والدعاء فدا یمسم وقد لا یمسم۔ اس سے دعا و نطق کسائی قرار پاتی ہے۔ مجمع البحار میں بھی کیا گیا

لے سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے ہیں، یاد رکھو عبادت جو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔

کہ الدعاء الغوث یعنی دعا فریاد کرنا اور دہائی مانگنا ہے اور بطور شہادت آیت اَدْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ مِثْلَ مَا تَدْعُونَ اس کے معنی اس طرح کیے ہیں: ای استغیثوا اذا نزل بكم الضر یعنی جب تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو مجھ سے فریاد رسی چاہو۔ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی وَاخِرُ دَعْوَاهُمْ اَنْ اَقْرَبُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ دعا کے معنی پکارنے کے ثابت ہوتے ہیں۔ نیز اس آیت سے لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ اگر یہاں دعا کے معنی عبادت کے لیے جائیں (جیسا کہ بعض کا زعم ہے) تو لازم آتا ہے کہ صحابہؓ ایک دوسرے کی عبادت کرتے تھے۔ وحاشا ہر عن ذلك۔ دعا شرع میں عبادت کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس سے عجز عباد اور قدرت رب العباد کا اظہار ہوتا ہے، مانگنا، گڑگڑانا، عجز کا ظاہر کرنا لوازم عبودیت سے ہے جس طرح عظمت و کبریا، ہیبت و قدرت، جلال و استغنا لوازم عبودیت سے ہیں۔ لوازم عبودیت ظاہر ہے کہ عبادت ہیں۔ چنانچہ صاحب تفسیر نیشاپوری نے اُجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ کے ذیل میں خوب تصریح کر دی ہے۔

اعلم ان الدعاء مصدر، دعوت ادعو، وقد تكون اسما تقول سمعت دعاء كما تقول سمعت صوتا، وحقيقة الدعاء استدعاء العبد برب جل جلاله العناية والاستمداد والمعونة، وقال جمهور العقلاء: ان الدعاء من اعظم مقامات العبودية وانه من شعائر الصالحين وداب الانبياء والمرسلين والقران ناطق بصحة عن الصديقين والاحاديث مشيونة بالدعية لما ثورته بحيث لا يصاغ للاسكار ولا مجال للعناد (مطبوعہ ایران شمشاد، ص ۱۹۳)

م خلاصہ یہ کہ دعا مصدر ہے اور کبھی اسم بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں نے دعا کو سنا جس طرح کہ آواز کو سنا اور دعا کی حقیقت یہ ہے کہ عبد اپنے رب سے استدعا کرتا ہے اور اس مدد و معونت و حمایت کا خواستگار ہوتا ہے۔ جمهور عقلاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دعا بلند ترین مقامات عبودیت سے ہے یہ صالحین کا شعار اور انبیاء و مرسلین کا طریقہ رہا ہے۔ قرآن ناطق ہے کہ وہ صدیقین سے ثابت ہے، اور احادیث ادعیہ ما ثورہ سے بھری ہوئی ہیں، یہاں مجال انکار نہیں۔

جب دعا عبادت ہے تو پھر غیر اللہ سے دعا کرنا شرکِ صریح قرار پائیگا۔ لیکن قرآن کریم نے مخلوق سے مدد و معونت اور استغاثہ اس صورت میں جائز رکھا ہے کہ جب ایسے امور میں کیا جائے جو ان کی قدرت و قوت کے احاطہ میں ہوں، دیکھو قرآن میں اس اسرائیلی کا قصہ مذکور ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی قبلی کے خلاف استغاثہ کیا تھا۔ فَاسْتَعَاثَ الَّذِي مِنْ شَيْعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ (پ ۵۶) کسی دوسری جگہ دین کے کاموں میں مدد چاہنا اور مدد دینا واجب قرار دی گئی ہے: قَرَأْنِ اسْتَعَاثُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ النَّصْرُ (پ ۱۶) اسی طرح نیکی اور تقویٰ میں استغاثت کا حکم دیا گیا ہے: تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (پ ۶) جب مظلوم کسی ظالم کے خلاف حاکم کے پاس فریاد کرتا ہے، یا بیمار حکیم سے کہتا ہے کہ تم میرا علاج کرو یا کسی مقدمہ میں وکیل سے مدد لیجاتی ہے تو اس طرح کی استغاثت و استغاثہ منع نہیں۔ ایسا دنیویہ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مامور بہ ہے۔ لیکن بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب بالذات مؤثر نہیں حق تعالیٰ ہی ان میں اثر پیدا کرتے ہیں، ہر چیز اپنے اثر کے ظہور میں اللہ تعالیٰ کے اذن کی محتاج ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے کہ اشیاء کی وجود بخشی کے وقت ہی ان میں اثرات رکھ دیے گئے ہیں اور اسی راہ سے وہ اثر کرتی ہیں اور اب حق تعالیٰ کے حکم و امر کی حاجت نہیں، یا ان میں یہ قوت ہے کہ کبھی بھی اپنے آثار و احکام سے تخلف نہ کریں! دیکھو جب حضرت ابراہیم آگ میں ڈالے گئے تو حق تعالیٰ نے آگ میں اثر اِحراق پیدا نہ کیا اور نہ جلے!

غرض آثارِ اشیاء حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور بار بار صفت اشیاء پر بستے رہتے ہیں۔ اسی طرح مخلوق میں فعل کی جو قدرت ہوئی، ہر وہ فعل کے وقت ہی عنایت ہوتی ہے اور اس سے فعل کا صدور ہوتا ہے، یہ نہیں کہ فعل کی قدرت پہلے ہی سے مخلوق میں موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے افعال پر قادر ہے اور خالق کا محتاج نہیں، ورنہ یہ لازم آئیگا کہ تمام مخلوقات وجود میں آنے

لے۔ جوہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے موسیٰ سے اس کے مقابل میں جو کہ ان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی۔ لے۔ آ۔ وہ تم سے دین کے کام میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمہ مدد کرنا واجب ہے۔ لے۔ نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہو اور گناہ اور زیارتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔

کے بعد حق تعالیٰ سے مستغنی ہوں اور بے پرواہ، مستقل ہوں اور غیر محتاج، واللہ لازم باطل فالملزوم مثلہ
ما علی قاری فی شرح فقہ اکبر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ثم اعلم ان اعادة العبد التي تفكر ان يعني جان لینا چاہیے کہ بندہ کا ارادہ جو فعل کے ساتھ
فعله وقد اتته عليه حال صنع ہوتا ہے اور اس فعل کی قدرت وقت وقوع فعل،
مخلوٹھان مع الفعل لا قبله ولا بعده دون فعل کے ساتھ ہی مخلوق ہوتے ہیں پہلے ہوتے

یعنی ارادہ، قدرت اور فعل سب مخلوق الہی ہیں، یہی عقیدہ ہے اہل سنت و جماعت کا، اور معنی ہے
اس آیت صریح پر: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (پہ ۶۷) نیز اس آیت پر مَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ
يَّبْتَغِيَ اللّٰهُ (پہ ۲۶) نیز اِقْوَةَ اِلَّا بِاللّٰهِ پر۔

اس طرح عقیدہ کی تطہیر ہونے کے بعد ہی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا نہ کوئی معیث
ہے اور نہ غیاث، نہ کوئی معین ہے اور نہ مستعان، ہماری ہر فریاد رسی علی الاطلاق حق تعالیٰ ہی سے
ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک منافق تھا جو مسلمانوں کو دق کیا کرتا تھا
حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا چلو حضرتؓ سے استغاثہ کریں۔ آپ نے سن کر فرمایا کہ مجھ سے استغاثہ نہ کرنا چاہیے
استغاثہ تو اللہ ہی سے کرتے ہیں (رواہ الطبرانی) اگر کسی فیر کے ہاتھ سے کوئی چیز حاصل ہو جائے تو
وہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت، کیونکہ حقیقت اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کا اسم مبارک غیاث و معیث ہی
تاہم امور اختیار یہ میں خلق سے استعانت جائز ہے مگر اسی عقیدہ کے ساتھ جس کا ابھی ذکر ہوا۔

جن امور میں سوا حق تعالیٰ کے کسی اور کو قدرت نہیں ان میں کسی اور کو پکارنا اور ان سے
استغاثہ کرنا، یا اعانت چاہنا حرام یا شرک ہے جیسے رزق کا دنیا، مینہ کا برسانا، بیمار کو شفا بخشنا، ہدایت
کرنا، گناہ کا بخشنا وغیرہ۔ اب پہلے بعض ان آیات قرآنی پر بھی غور کر لو جن سے دعا کا عبادت ہونا صاف

لَهُ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ - ۱۱۰ وَهُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ

بَعْدَ مَا قَطَرْنَا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ - ۱۱۱ وَ اِذَا مَرَضْتَ فَهُوَ يَشْفِيكَ - ۱۱۲ اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ - ۱۱۳ وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰهُ - ۱۱۴ وَفِي مَطَرٍ عِبَادِي يَدْعُوْنَ

ثابت ہوتا ہے۔

دیکھو حق تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا کا حکم فرما رہے ہیں۔ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۗ إِنَّهُ
 لَرَبُّ الْمُتَعَبِّينَ (پ ۱۳۷) دوسری جگہ ارشاد ہے: ۗ وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ
 قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (پ ۱۳۷) ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں سے
 دعا چاہتے ہیں ماسی سبب سے دعا عبادت ہے۔ اس کی مزید توثیق اس امر سے ہوتی ہے کہ غیر کو
 پکارنے سے منع فرما رہے ہیں فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا (پ ۱۱۶) وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ
 (پ ۱۳۷) پھر دعا کو اپنے ہی لیے مخصوص کر رہے ہیں۔ لَدَعْوَةِ الْمُحْتَمِلِ (پ ۸۷) اس طے شرح اشہاء و
 لغیا دعا کو حق تعالیٰ اپنی ہی ذات کے لیے مخصوص فرما رہے ہیں اور اپنے سوا کسی کو اس کے
 نہیں قرار دے رہے ہیں یعنی منادی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں! پھر دعا کا حکم دے کر اس کو صاف
 طور پر عبادت قرار دیا گیا ہے: اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (پ ۶)

اسی طرح جب دعا کا عبادت ہونا آیات قرآنیہ سے ثابت ہوا تو اب احادیث نبویہ پر
 ایک نظر ڈالو، جو دعا کو عین عبادت قرار دے رہی ہیں۔

(۱) عن ثعمان بن بشير قال قال رسول الله صلعم: الدعاء هو العبادة ثم قرأ
 قال ربكم ادعوني استجب لكم (رواه احمد والترمذي ابوداؤد والنسائي وابن ماجه) یعنی دعا
 عبادت ہی تو ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ادعوني استجب لكم۔ اس آیت کے پڑھنے سے
 مراد یہ ہے کہ دعا کے عبادت ہونے کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کا حکم کیا ہے۔

(۲) عن انس قال قال رسول الله صلعم الدعاء مح العبادة (رواه الترمذي) یعنی
 دعا مغز ہے عبادت کا، جس طرح مغز شے، شے کی حقیقت ہوتا ہے اسی طرح دعا یعنی خضوع و خشوع و
 تذلل کے ساتھ پکارنا عبادت کی حقیقت ہے اور اس لیے مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کے ساتھ جو عیب
 الدعوات ہیں۔

۱۱۷۰ - ۱۱۷۱ - ۱۱۷۲ - ۱۱۷۳ - ۱۱۷۴ - ۱۱۷۵ - ۱۱۷۶ - ۱۱۷۷ - ۱۱۷۸ - ۱۱۷۹ - ۱۱۸۰ - ۱۱۸۱ - ۱۱۸۲ - ۱۱۸۳ - ۱۱۸۴ - ۱۱۸۵ - ۱۱۸۶ - ۱۱۸۷ - ۱۱۸۸ - ۱۱۸۹ - ۱۱۹۰ - ۱۱۹۱ - ۱۱۹۲ - ۱۱۹۳ - ۱۱۹۴ - ۱۱۹۵ - ۱۱۹۶ - ۱۱۹۷ - ۱۱۹۸ - ۱۱۹۹ - ۱۲۰۰ - ۱۲۰۱ - ۱۲۰۲ - ۱۲۰۳ - ۱۲۰۴ - ۱۲۰۵ - ۱۲۰۶ - ۱۲۰۷ - ۱۲۰۸ - ۱۲۰۹ - ۱۲۱۰ - ۱۲۱۱ - ۱۲۱۲ - ۱۲۱۳ - ۱۲۱۴ - ۱۲۱۵ - ۱۲۱۶ - ۱۲۱۷ - ۱۲۱۸ - ۱۲۱۹ - ۱۲۲۰ - ۱۲۲۱ - ۱۲۲۲ - ۱۲۲۳ - ۱۲۲۴ - ۱۲۲۵ - ۱۲۲۶ - ۱۲۲۷ - ۱۲۲۸ - ۱۲۲۹ - ۱۲۳۰ - ۱۲۳۱ - ۱۲۳۲ - ۱۲۳۳ - ۱۲۳۴ - ۱۲۳۵ - ۱۲۳۶ - ۱۲۳۷ - ۱۲۳۸ - ۱۲۳۹ - ۱۲۴۰ - ۱۲۴۱ - ۱۲۴۲ - ۱۲۴۳ - ۱۲۴۴ - ۱۲۴۵ - ۱۲۴۶ - ۱۲۴۷ - ۱۲۴۸ - ۱۲۴۹ - ۱۲۵۰ - ۱۲۵۱ - ۱۲۵۲ - ۱۲۵۳ - ۱۲۵۴ - ۱۲۵۵ - ۱۲۵۶ - ۱۲۵۷ - ۱۲۵۸ - ۱۲۵۹ - ۱۲۶۰ - ۱۲۶۱ - ۱۲۶۲ - ۱۲۶۳ - ۱۲۶۴ - ۱۲۶۵ - ۱۲۶۶ - ۱۲۶۷ - ۱۲۶۸ - ۱۲۶۹ - ۱۲۷۰ - ۱۲۷۱ - ۱۲۷۲ - ۱۲۷۳ - ۱۲۷۴ - ۱۲۷۵ - ۱۲۷۶ - ۱۲۷۷ - ۱۲۷۸ - ۱۲۷۹ - ۱۲۸۰ - ۱۲۸۱ - ۱۲۸۲ - ۱۲۸۳ - ۱۲۸۴ - ۱۲۸۵ - ۱۲۸۶ - ۱۲۸۷ - ۱۲۸۸ - ۱۲۸۹ - ۱۲۹۰ - ۱۲۹۱ - ۱۲۹۲ - ۱۲۹۳ - ۱۲۹۴ - ۱۲۹۵ - ۱۲۹۶ - ۱۲۹۷ - ۱۲۹۸ - ۱۲۹۹ - ۱۳۰۰ - ۱۳۰۱ - ۱۳۰۲ - ۱۳۰۳ - ۱۳۰۴ - ۱۳۰۵ - ۱۳۰۶ - ۱۳۰۷ - ۱۳۰۸ - ۱۳۰۹ - ۱۳۱۰ - ۱۳۱۱ - ۱۳۱۲ - ۱۳۱۳ - ۱۳۱۴ - ۱۳۱۵ - ۱۳۱۶ - ۱۳۱۷ - ۱۳۱۸ - ۱۳۱۹ - ۱۳۲۰ - ۱۳۲۱ - ۱۳۲۲ - ۱۳۲۳ - ۱۳۲۴ - ۱۳۲۵ - ۱۳۲۶ - ۱۳۲۷ - ۱۳۲۸ - ۱۳۲۹ - ۱۳۳۰ - ۱۳۳۱ - ۱۳۳۲ - ۱۳۳۳ - ۱۳۳۴ - ۱۳۳۵ - ۱۳۳۶ - ۱۳۳۷ - ۱۳۳۸ - ۱۳۳۹ - ۱۳۴۰ - ۱۳۴۱ - ۱۳۴۲ - ۱۳۴۳ - ۱۳۴۴ - ۱۳۴۵ - ۱۳۴۶ - ۱۳۴۷ - ۱۳۴۸ - ۱۳۴۹ - ۱۳۵۰ - ۱۳۵۱ - ۱۳۵۲ - ۱۳۵۳ - ۱۳۵۴ - ۱۳۵۵ - ۱۳۵۶ - ۱۳۵۷ - ۱۳۵۸ - ۱۳۵۹ - ۱۳۶۰ - ۱۳۶۱ - ۱۳۶۲ - ۱۳۶۳ - ۱۳۶۴ - ۱۳۶۵ - ۱۳۶۶ - ۱۳۶۷ - ۱۳۶۸ - ۱۳۶۹ - ۱۳۷۰ - ۱۳۷۱ - ۱۳۷۲ - ۱۳۷۳ - ۱۳۷۴ - ۱۳۷۵ - ۱۳۷۶ - ۱۳۷۷ - ۱۳۷۸ - ۱۳۷۹ - ۱۳۸۰ - ۱۳۸۱ - ۱۳۸۲ - ۱۳۸۳ - ۱۳۸۴ - ۱۳۸۵ - ۱۳۸۶ - ۱۳۸۷ - ۱۳۸۸ - ۱۳۸۹ - ۱۳۹۰ - ۱۳۹۱ - ۱۳۹۲ - ۱۳۹۳ - ۱۳۹۴ - ۱۳۹۵ - ۱۳۹۶ - ۱۳۹۷ - ۱۳۹۸ - ۱۳۹۹ - ۱۴۰۰ - ۱۴۰۱ - ۱۴۰۲ - ۱۴۰۳ - ۱۴۰۴ - ۱۴۰۵ - ۱۴۰۶ - ۱۴۰۷ - ۱۴۰۸ - ۱۴۰۹ - ۱۴۱۰ - ۱۴۱۱ - ۱۴۱۲ - ۱۴۱۳ - ۱۴۱۴ - ۱۴۱۵ - ۱۴۱۶ - ۱۴۱۷ - ۱۴۱۸ - ۱۴۱۹ - ۱۴۲۰ - ۱۴۲۱ - ۱۴۲۲ - ۱۴۲۳ - ۱۴۲۴ - ۱۴۲۵ - ۱۴۲۶ - ۱۴۲۷ - ۱۴۲۸ - ۱۴۲۹ - ۱۴۳۰ - ۱۴۳۱ - ۱۴۳۲ - ۱۴۳۳ - ۱۴۳۴ - ۱۴۳۵ - ۱۴۳۶ - ۱۴۳۷ - ۱۴۳۸ - ۱۴۳۹ - ۱۴۴۰ - ۱۴۴۱ - ۱۴۴۲ - ۱۴۴۳ - ۱۴۴۴ - ۱۴۴۵ - ۱۴۴۶ - ۱۴۴۷ - ۱۴۴۸ - ۱۴۴۹ - ۱۴۵۰ - ۱۴۵۱ - ۱۴۵۲ - ۱۴۵۳ - ۱۴۵۴ - ۱۴۵۵ - ۱۴۵۶ - ۱۴۵۷ - ۱۴۵۸ - ۱۴۵۹ - ۱۴۶۰ - ۱۴۶۱ - ۱۴۶۲ - ۱۴۶۳ - ۱۴۶۴ - ۱۴۶۵ - ۱۴۶۶ - ۱۴۶۷ - ۱۴۶۸ - ۱۴۶۹ - ۱۴۷۰ - ۱۴۷۱ - ۱۴۷۲ - ۱۴۷۳ - ۱۴۷۴ - ۱۴۷۵ - ۱۴۷۶ - ۱۴۷۷ - ۱۴۷۸ - ۱۴۷۹ - ۱۴۸۰ - ۱۴۸۱ - ۱۴۸۲ - ۱۴۸۳ - ۱۴۸۴ - ۱۴۸۵ - ۱۴۸۶ - ۱۴۸۷ - ۱۴۸۸ - ۱۴۸۹ - ۱۴۹۰ - ۱۴۹۱ - ۱۴۹۲ - ۱۴۹۳ - ۱۴۹۴ - ۱۴۹۵ - ۱۴۹۶ - ۱۴۹۷ - ۱۴۹۸ - ۱۴۹۹ - ۱۵۰۰ - ۱۵۰۱ - ۱۵۰۲ - ۱۵۰۳ - ۱۵۰۴ - ۱۵۰۵ - ۱۵۰۶ - ۱۵۰۷ - ۱۵۰۸ - ۱۵۰۹ - ۱۵۱۰ - ۱۵۱۱ - ۱۵۱۲ - ۱۵۱۳ - ۱۵۱۴ - ۱۵۱۵ - ۱۵۱۶ - ۱۵۱۷ - ۱۵۱۸ - ۱۵۱۹ - ۱۵۲۰ - ۱۵۲۱ - ۱۵۲۲ - ۱۵۲۳ - ۱۵۲۴ - ۱۵۲۵ - ۱۵۲۶ - ۱۵۲۷ - ۱۵۲۸ - ۱۵۲۹ - ۱۵۳۰ - ۱۵۳۱ - ۱۵۳۲ - ۱۵۳۳ - ۱۵۳۴ - ۱۵۳۵ - ۱۵۳۶ - ۱۵۳۷ - ۱۵۳۸ - ۱۵۳۹ - ۱۵۴۰ - ۱۵۴۱ - ۱۵۴۲ - ۱۵۴۳ - ۱۵۴۴ - ۱۵۴۵ - ۱۵۴۶ - ۱۵۴۷ - ۱۵۴۸ - ۱۵۴۹ - ۱۵۵۰ - ۱۵۵۱ - ۱۵۵۲ - ۱۵۵۳ - ۱۵۵۴ - ۱۵۵۵ - ۱۵۵۶ - ۱۵۵۷ - ۱۵۵۸ - ۱۵۵۹ - ۱۵۶۰ - ۱۵۶۱ - ۱۵۶۲ - ۱۵۶۳ - ۱۵۶۴ - ۱۵۶۵ - ۱۵۶۶ - ۱۵۶۷ - ۱۵۶۸ - ۱۵۶۹ - ۱۵۷۰ - ۱۵۷۱ - ۱۵۷۲ - ۱۵۷۳ - ۱۵۷۴ - ۱۵۷۵ - ۱۵۷۶ - ۱۵۷۷ - ۱۵۷۸ - ۱۵۷۹ - ۱۵۸۰ - ۱۵۸۱ - ۱۵۸۲ - ۱۵۸۳ - ۱۵۸۴ - ۱۵۸۵ - ۱۵۸۶ - ۱۵۸۷ - ۱۵۸۸ - ۱۵۸۹ - ۱۵۹۰ - ۱۵۹۱ - ۱۵۹۲ - ۱۵۹۳ - ۱۵۹۴ - ۱۵۹۵ - ۱۵۹۶ - ۱۵۹۷ - ۱۵۹۸ - ۱۵۹۹ - ۱۶۰۰ - ۱۶۰۱ - ۱۶۰۲ - ۱۶۰۳ - ۱۶۰۴ - ۱۶۰۵ - ۱۶۰۶ - ۱۶۰۷ - ۱۶۰۸ - ۱۶۰۹ - ۱۶۱۰ - ۱۶۱۱ - ۱۶۱۲ - ۱۶۱۳ - ۱۶۱۴ - ۱۶۱۵ - ۱۶۱۶ - ۱۶۱۷ - ۱۶۱۸ - ۱۶۱۹ - ۱۶۲۰ - ۱۶۲۱ - ۱۶۲۲ - ۱۶۲۳ - ۱۶۲۴ - ۱۶۲۵ - ۱۶۲۶ - ۱۶۲۷ - ۱۶۲۸ - ۱۶۲۹ - ۱۶۳۰ - ۱۶۳۱ - ۱۶۳۲ - ۱۶۳۳ - ۱۶۳۴ - ۱۶۳۵ - ۱۶۳۶ - ۱۶۳۷ - ۱۶۳۸ - ۱۶۳۹ - ۱۶۴۰ - ۱۶۴۱ - ۱۶۴۲ - ۱۶۴۳ - ۱۶۴۴ - ۱۶۴۵ - ۱۶۴۶ - ۱۶۴۷ - ۱۶۴۸ - ۱۶۴۹ - ۱۶۵۰ - ۱۶۵۱ - ۱۶۵۲ - ۱۶۵۳ - ۱۶۵۴ - ۱۶۵۵ - ۱۶۵۶ - ۱۶۵۷ - ۱۶۵۸ - ۱۶۵۹ - ۱۶۶۰ - ۱۶۶۱ - ۱۶۶۲ - ۱۶۶۳ - ۱۶۶۴ - ۱۶۶۵ - ۱۶۶۶ - ۱۶۶۷ - ۱۶۶۸ - ۱۶۶۹ - ۱۶۷۰ - ۱۶۷۱ - ۱۶۷۲ - ۱۶۷۳ - ۱۶۷۴ - ۱۶۷۵ - ۱۶۷۶ - ۱۶۷۷ - ۱۶۷۸ - ۱۶۷۹ - ۱۶۸۰ - ۱۶۸۱ - ۱۶۸۲ - ۱۶۸۳ - ۱۶۸۴ - ۱۶۸۵ - ۱۶۸۶ - ۱۶۸۷ - ۱۶۸۸ - ۱۶۸۹ - ۱۶۹۰ - ۱۶۹۱ - ۱۶۹۲ - ۱۶۹۳ - ۱۶۹۴ - ۱۶۹۵ - ۱۶۹۶ - ۱۶۹۷ - ۱۶۹۸ - ۱۶۹۹ - ۱۷۰۰ - ۱۷۰۱ - ۱۷۰۲ - ۱۷۰۳ - ۱۷۰۴ - ۱۷۰۵ - ۱۷۰۶ - ۱۷۰۷ - ۱۷۰۸ - ۱۷۰۹ - ۱۷۱۰ - ۱۷۱۱ - ۱۷۱۲ - ۱۷۱۳ - ۱۷۱۴ - ۱۷۱۵ - ۱۷۱۶ - ۱۷۱۷ - ۱۷۱۸ - ۱۷۱۹ - ۱۷۲۰ - ۱۷۲۱ - ۱۷۲۲ - ۱۷۲۳ - ۱۷۲۴ - ۱۷۲۵ - ۱۷۲۶ - ۱۷۲۷ - ۱۷۲۸ - ۱۷۲۹ - ۱۷۳۰ - ۱۷۳۱ - ۱۷۳۲ - ۱۷۳۳ - ۱۷۳۴ - ۱۷۳۵ - ۱۷۳۶ - ۱۷۳۷ - ۱۷۳۸ - ۱۷۳۹ - ۱۷۴۰ - ۱۷۴۱ - ۱۷۴۲ - ۱۷۴۳ - ۱۷۴۴ - ۱۷۴۵ - ۱۷۴۶ - ۱۷۴۷ - ۱۷۴۸ - ۱۷۴۹ - ۱۷۵۰ - ۱۷۵۱ - ۱۷۵۲ - ۱۷۵۳ - ۱۷۵۴ - ۱۷۵۵ - ۱۷۵۶ - ۱۷۵۷ - ۱۷۵۸ - ۱۷۵۹ - ۱۷۶۰ - ۱۷۶۱ - ۱۷۶۲ - ۱۷۶۳ - ۱۷۶۴ - ۱۷۶۵ - ۱۷۶۶ - ۱۷۶۷ - ۱۷۶۸ - ۱۷۶۹ - ۱۷۷۰ - ۱۷۷۱ - ۱۷۷۲ - ۱۷۷۳ - ۱۷۷۴ - ۱۷۷۵ - ۱۷۷۶ - ۱۷۷۷ - ۱۷۷۸ - ۱۷۷۹ - ۱۷۸۰ - ۱۷۸۱ - ۱۷۸۲ - ۱۷۸۳ - ۱۷۸۴ - ۱۷۸۵ - ۱۷۸۶ - ۱۷۸۷ - ۱۷۸۸ - ۱۷۸۹ - ۱۷۹۰ - ۱۷۹۱ - ۱۷۹۲ - ۱۷۹۳ - ۱۷۹۴ - ۱۷۹۵ - ۱۷۹۶ - ۱۷۹۷ - ۱۷۹۸ - ۱۷۹۹ - ۱۸۰۰ - ۱۸۰۱ - ۱۸۰۲ - ۱۸۰۳ - ۱۸۰۴ - ۱۸۰۵ - ۱۸۰۶ - ۱۸۰۷ - ۱۸۰۸ - ۱۸۰۹ - ۱۸۱۰ - ۱۸۱۱ - ۱۸۱۲ - ۱۸۱۳ - ۱۸۱۴ - ۱۸۱۵ - ۱۸۱۶ - ۱۸۱۷ - ۱۸۱۸ - ۱۸۱۹ - ۱۸۲۰ - ۱۸۲۱ - ۱۸۲۲ - ۱۸۲۳ - ۱۸۲۴ - ۱۸۲۵ - ۱۸۲۶ - ۱۸۲۷ - ۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ - ۱۸۳۰ - ۱۸۳۱ - ۱۸۳۲ - ۱۸۳۳ - ۱۸۳۴ - ۱۸۳۵ - ۱۸۳۶ - ۱۸۳۷ - ۱۸۳۸ - ۱۸۳۹ - ۱۸۴۰ - ۱۸۴۱ - ۱۸۴۲ - ۱۸۴۳ - ۱۸۴۴ - ۱۸۴۵ - ۱۸۴۶ - ۱۸۴۷ - ۱۸۴۸ - ۱۸۴۹ - ۱۸۵۰ - ۱۸۵۱ - ۱۸۵۲ - ۱۸۵۳ - ۱۸۵۴ - ۱۸۵۵ - ۱۸۵۶ - ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ - ۱۸۵۹ - ۱۸۶۰ - ۱۸۶۱ - ۱۸۶۲ - ۱۸۶۳ - ۱۸۶۴ - ۱۸۶۵ - ۱۸۶۶ - ۱۸۶۷ - ۱۸۶۸ - ۱۸۶۹ - ۱۸۷۰ - ۱۸۷۱ - ۱۸۷۲ - ۱۸۷۳ - ۱۸۷۴ - ۱۸۷۵ - ۱۸۷۶ - ۱۸۷۷ - ۱۸۷۸ - ۱۸۷۹ - ۱۸۸۰ - ۱۸۸۱ - ۱۸۸۲ - ۱۸۸۳ - ۱۸۸۴ - ۱۸۸۵ - ۱۸۸۶ - ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ - ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ - ۱۸۹۱ - ۱۸۹۲ - ۱۸۹۳ - ۱۸۹۴ - ۱۸۹۵ - ۱۸۹۶ - ۱۸۹۷ - ۱۸۹۸ - ۱۸۹۹ - ۱۹۰۰ - ۱۹۰۱ - ۱۹۰۲ - ۱۹۰۳ - ۱۹۰۴ - ۱۹۰۵ - ۱۹۰۶ - ۱۹۰۷ - ۱۹۰۸ - ۱۹۰۹ - ۱۹۱۰ - ۱۹۱۱ - ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ - ۱۹۱۴ - ۱۹۱۵ - ۱۹۱۶ - ۱۹۱۷ - ۱۹۱۸ - ۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ - ۱۹۲۱ - ۱۹۲۲ - ۱۹۲۳ - ۱۹۲۴ - ۱۹۲۵ - ۱۹۲۶ - ۱۹۲۷ - ۱۹۲۸ - ۱۹۲۹ - ۱۹۳۰ - ۱۹۳۱ - ۱۹۳۲ - ۱۹۳۳ - ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ - ۱۹۳۶ - ۱۹۳۷ - ۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ - ۱۹۴۰ - ۱۹۴۱ - ۱۹۴۲ - ۱۹۴۳ - ۱۹۴۴ - ۱۹۴۵ - ۱۹۴۶ - ۱۹۴۷ - ۱۹۴۸ - ۱۹۴۹ - ۱۹۵۰ - ۱۹۵۱ - ۱۹۵۲ - ۱۹۵۳ - ۱۹۵۴ - ۱۹۵۵ - ۱۹۵۶ - ۱۹۵۷ - ۱۹۵۸ - ۱۹۵۹ - ۱۹۶۰ - ۱۹۶۱ - ۱۹۶۲ - ۱۹۶۳ - ۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ - ۱۹۶۹ - ۱۹۷۰ - ۱۹۷۱ - ۱۹۷۲ - ۱۹۷۳ - ۱۹۷۴ - ۱۹۷۵ - ۱۹۷۶ - ۱۹۷۷ - ۱۹۷۸ - ۱۹۷۹ - ۱۹۸۰ - ۱۹۸۱ - ۱۹۸۲ - ۱۹۸۳ - ۱۹۸۴ - ۱۹۸۵ - ۱۹۸۶ - ۱۹۸۷ - ۱۹۸۸ - ۱۹۸۹ - ۱۹۹۰ - ۱۹۹۱ - ۱۹۹۲ - ۱۹۹۳ - ۱۹۹۴ - ۱۹۹۵ - ۱۹۹۶ - ۱۹۹۷ - ۱۹۹۸ - ۱۹۹۹ - ۲۰۰۰

(۳) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم: من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (رواہ الترمذی) یعنی جو اللہ سے نہ مانگے اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے جب اللہ سے نہ مانگنا غصہ کا باعث ہوتا ہے تو اس سے نہ مانگ کر اوروں سے مانگنا تو اور زیادہ غصیب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا اللہ تعالیٰ کو کس قدر محبوب ہے۔

جب دعا کا عبادت ہونا ثابت ہو گیا تو اب صاف ظاہر ہے کہ غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہے، شرک فی العبادت ہے۔ اس مقصد کے لیے آیات قرآنیہ کا پیش کرنا ضروری نہیں لیکن مزید قوت کے لیے چند آیات پر غور کر لو:

(۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِنْ الظَّالِمِينَ یعنی مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ نقصان پہرا کر تو ایسا کرنے تو تو بھی اسی وقت ظالموں میں ہو جائیگا۔ (پ ۱۶۶)

طلبِ منفعت و دفعِ مضرت کے لیے غیر اللہ کو درود سے پکارنا، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو ان سے عرض کرنا اور اس طرح ان کی پرستش کرنا بڑے ظلم و ستم کی بات ہے کیونکہ جس اللہ کی قدرت میں بندہ کا نیک و بد نفع و نقصان سب کچھ ہے اس پروردگار کو چھوڑ کر، اس سے منہ موڑ کر ایسی ہستیوں کی طرف متوجہ ہونا اور ذلت و فقر کی نسبت ان سے جوڑنا جو نہ کسی کے نفع پر قادر ہیں اور نہ نقصان پر اس سے بڑھ کر دنیا میں ظلم و ستم کیا ہو سکتا ہے! شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے، إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (پ ۱۱)

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے بعض مفسرین نے "دُونِ اللَّهِ" اور "غَيْرِ اللَّهِ" کی توجیہ میں اصنام و اوثان کا ذکر کر دیا ہے۔ اس لیے بعض شرک پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ شرک اس وقت ہوگا جب بتوں سے دعا کی جائے۔ انبیاء و اولیاء سے دعا کرنا، مرادیں مانگنا شرک نہیں۔ یہ صریحاً غلط ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) علمِ اصول کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ "العبرة بعموم الالفاظ لا بخصوص اللواری" یعنی اعتبار

عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص موارد کا، غیر اللہ اور دون اللہ دونوں عام الفاظ ہیں۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں سب ان میں داخل ہیں، خواہ ولی نبی ہو یا بھوت پری۔ چنانچہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَكُم بِهِمْ قُلُوبُ الَّذِينَ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ اِنَّهُمْ اِلٰهَةٌ مِنْ دُونِ كَالْمَلَائِكَةِ وَالْمَسِيحِ وَعِزْرٍ۔ یعنی ان لوگوں کو پکارو جن کو تم نے معبود سمجھ رکھا ہے اللہ کے سوا جیسے ملائکہ، مسیح و عزیر۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو ملائکہ اور انبیاء کو پکارے وہ بھی مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ویسی ہی زبرد تو بیخ کی ہے جیسا کہ بت پرستوں کی کی ہے۔ اس عموم الفاظ کے اعتبار سے صاحب جلالین نے اکثر مقامات پر دون اللہ کا ترجمہ غیر اللہ سے کیا ہے۔

(۲) جیسا کہ ہم نے اوپر تصریح کی ہے، کفار نے اپنے بت اپنے اکابر (انبیاء و اولیاء) ہی کے نام پر تیشے تھے اور ان کی بت پرستی کا خشاہد ان ہی اکابر کی تعظیم تھی، لہذا وہ دراصل بت پرستوں اور درختوں کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ انبیاء و اولیاء و صلحاء کو پوج رہے تھے۔

غرض غیر اللہ و دون اللہ سے مراد نہ صرف بت ہیں بلکہ انبیاء و اولیاء سب اس میں شامل ہیں۔ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص موارد کا۔ اور عقلاً غور کرو کہ انبیاء و اولیاء غیر اللہ ہیں کہ عین اللہ؟ جب غیر اللہ کی عبادت مشرک ہے تو صنم و دشن، بنی دلی، پیر، شہید، بھوت، پری، سب حرمت عبادت میں مساوی ہیں اور ان میں تفریق باطل ہے۔ اگر ہم تفریق کے قائل ہو جائیں کہیں کہ عبادت من دون اللہ کی حرام و مشرک ہے بخلاف عبادت اولیاء و انبیاء کے تو لازم آتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء عین اللہ ہیں اللہ لازم باطل فالملزوم مثل۔

(۱) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَاَدْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِیْبُوا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (پہ ۴، ۱۱۳) یعنی واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں سو تم ان کو پکارو، پھر ان کو چاہیے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو!

اس آیت میں اس امر کی صاف طور پر تصریح ہے کہ مشرکین اللہ کے سوا بعض اولیاء

انبیاء اور ملائکہ کو ذریعہ مضرت و جلب منفعت کے لیے پکارا کرتے تھے اس لیے ان سے کہا گیا کہ جن کو تم امداد کے لیے پکارتے ہو وہ بھی تمہارے مانند بندے ہیں محض اصنام و اوثان پر عباد کا اطلاق نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور اگر مجازاً اصنام بھی مراد لیں تو امثالکم کا لفظ اس سے ابا کریم ہے۔ اسی لیے مقاتل نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد ان عباد سے ملائکہ ہیں اور اس آیت کے مخاطب وہ ہیں جو ملائکہ کو پوجتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقبول بندوں سے دعا کرنے والا بھی مشرک ہے اور مردود، اس لیے کہ وہ من دون اللہ سے دعا کرتا ہے اور میں دون اللہ عام ہے اور اس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، مقبول ہوں یا مردود (۲) قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِي فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضَّرِّ عَنْكُمْ وَلَا جَبَدًا اُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ اِلَى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اِيْحْمَ اقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَةً وَيَخَافُونَ عَذَابًا اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا یعنی جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ان کو پکارو تو سہی سو وہ تم سے نہ تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں نہ ان کے بدل ڈالنے کا، یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ و مہونڈہ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

اس آیت میں اس نام کی خوب تصریح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں کہ کسی کی مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکے یا اس کو راحت و نعمت میں بدل دے، کوئی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کسی کی مصیبت و ضرر کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور یہ اہمق مشرک جن ہستیوں کو اچھے بُرے کا مختار جان کر پکارتے ہیں ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے امید رکھتے ہیں اور اسی کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے مراد خدا کے مقبول بندے ہیں نہ کہ اصنام و اشرار عباد، کیونکہ حق تعالیٰ سے امید درجا رکھنا، اس کے قرب کا طالب ہونا اشرار سے ممکن نہیں اور اصنام سے تو اور زیادہ غیر ممکن ہے پھر جب مقبول بندوں کو پکارنے اور ان سے اپنے مصائب کا دفعہ چاہنے والوں پر یہ عتاب ہو رہا ہے تو مردودین کے

ماننے والوں کا کیا حال ہوگا۔

تفسیر بیضاوی میں اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے۔ قل ہاد عوا الذین زعمتم انہم
الہة من دونہ کالملائکة ولسیخ و عزیز، فلا یملکون فلا یتطیعون کشف الضر
عنکم کالمرض و الفقر و لا تحویل و لا تحویل ذلک منکم الی غیرکم و لیکھو بیضاوی نے صراحت
کر دی ہے کہ ملائکہ اور مسیح اور عزیز تک "کشف ضر" یعنی مرض و فقر و قحط یا مصائب و آفات کے رفع
کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بطور خود پھیر سکتے ہیں۔ جب ان ابراہیم کا یہ حال ہوتا
ان سے کم درجہ کے لوگوں کا کیا پوچھنا!

(۳) یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضَرِبْ مَثَلًا فَاَسْمِعُوا لِمَنْ اِنَّا الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ
یَخْلُقُوْا ذَبَابًا وَّلَوْ اٰجْتَمَعُوْا لَ وَاَنْ یَّنْسَلِبُوْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَفِیْدُوْنَ مِنْهُ ضَعْفَ الطَّالِبِ
وَالْمَطْلُوْبِ فَاَقْدِرْ اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِہٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیُّ عَزِیْزٌ (۱۴۶) یعنی اے لوگو! ایک عیب
بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کو تم لوگ خدا کو چھوڑ کر
پکارتے ہو، وہ ایک مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی جمع ہو جائیں اور اگر ان سے
مکھی کچھ مین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے، ایسا عابد بھی ہے اور ایسا معبود بھی پھر ان
لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہیے تھی وہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب
ہے۔

ان آیات سے یہ امر زور و روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے
دعا مانگتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں وہ صریح گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہیں، ان کا مذہب
باطل ہے، کیونکہ

(۱) جن کی یہ عبادت کر رہے ہیں خواہ وہ اصنام ہوں یا ملائکہ عظام یا انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ
والسلام وہ ایک مکھی تک کو پیدا نہیں کر سکتے پھر ان سے کسی ایک چیز کا مانگنا اور اس کے لیے

لہ تفسیر بیضاوی ص ۷۰۲ مطبوعہ دارالطباعة عامر قسطنطنیہ ۱۳۳۳ھ

اگر گڑبانا جس کو پیدا کرنے کی ضرورت ہو کیسی جہالت ہے! جب وہ سب کے سب جمع ہو کر حفر سے حفر چیز کو پیدا کرنے کے قابل نہیں تو پھر غور کرو کہ انفرادی حیثیت سے وہ کس قدر عاجز ٹھہرتے ہیں (۱) اب رہا ان سے ایسی چیز کا طلب کرنا جس کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں سو یہ بھی باطل ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے جو چیز جس کے لیے مقرر کر دی ہے اس میں نہ وہ ایک ذرہ کا اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے ایک ذرہ کی کمی، وہ کسی چیز کو ایک مکھی سے بھی چھین کر دوسرے کو دینے کی سکت نہیں رکھتے اور نہ آپ ہی لینے کی قوت تو پھر ان سے عرضِ حاجات اور طلبِ مرادات کرنا کتنی حماقت ہے! اور آخر میں یہ بھی فرما دیا گیا کہ ان مشرکین نے حق تعالیٰ کی قدر جیسی چاہیے ویسی نہ سمجھی، اگر سمجھتے تو حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان بیچاروں سے کہ جن سے ایک مکھی تک نہیں بن سکتی کلبے کو حاجتیں مانگتے اور مرادیں طلب کرتے "خاک پڑے ایسی سمجھ پر جو بادشاہ کے روبرو فقیر سے بھیک مانگے" ۱۷

شرمت باد کہ من بسویت نگران باشم تو نہی چشم بسوے دگران (جائی)

یہاں من دون اللہ سے محض اصنام اور بت مراد لینا کسی طرح درست نہیں جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوق ہے سب اس میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں حق تعالیٰ نے انہیں قابلِ عبادت اور لائق دعا اس سے نہیں قرار دیا کہ وہ کسی شے کی تخلیق پر قادر نہیں۔ لن یخلقوا میں کوئی اصل میں نفی مستقبل کے لیے آیا ہے اور اس کی نفی موکد ہوتی ہے جس طرح تمام اہل لغت اور مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علت عام ہے تمام مخلوق کو خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء، اغنیاء ہوں یا اشقیاء ان میں سے کسی کو تخلیق کی قابلیت نہیں۔ اور یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ بت پرست اپنے بتوں کو بذاتہ معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ مقصود ان کی تعظیم سے اولیاء و انبیاء کی تعظیم تھی جن کی صورتوں پر وہ مورتیں بنائی گئی تھیں۔ چنانچہ امام رازی نے اس کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"فالقوم كانوا يعتقدون فيها انها طلسمات موضوعة على صورة الكواكب"

وانها تامل الملائكة والانبیاء المتقدمین وكانوا يعظمونها علی ان

تعظیمها یوجب تعظیم الملائكة واولئک الانبیاء لہ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو تعظیم و عبادت مخصوص بحضرت حق تعالیٰ جل، شانہ ہے اس کو انبیاء و اولیاء کے ساتھ متعلق کرنا ایسا ہی شرک ہے جیسا کہ بتوں کے ساتھ کرنا ان جوہر کی بنا پر ان آیات کی تخصیص بتوں کے ساتھ باطل ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ جس طرح بتوں سے دعا کرنا شرکِ جلی ہے بالکل اسی طرح نبی و ولی سے دعا کرنا بھی شرکِ جلی ہے۔

(۵) لَدَعْوَةِ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْمَعُونَ لَهُمْ يَتَنَبَّأُونَ بِالْحَقِّ سِوَا

كُفِّيهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ كَأَنَّهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دَعَا الْكَاذِبِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ (پہ ۸۶) سچا پکارنا

اسی کے لیے خاص ہے اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا کہ پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک آجائے اور وہ اس کے منہ تک آئے والے نہیں اور کافروں کی جتنی پکار یا درخواست ہے سب گمراہی ہے۔

یعنی پکارنا اسی کو چاہیے، اور دو مصیبت میں سے کسی کو چاہیے جو رفسم کے نسخہ مضر کا مالک ہو، عاجز و فقیر کو پکارنے اور اس کے ساتھ گزراگانی سے کیا حاصل آتی ہے، اس کے سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع و ضرر ہے، غیر اللہ کو اپنی مدد کے لیے بلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کے منہ پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کے کہہ کر منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے کہ قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچے والا نہیں، بلکہ اگر بائیں اس کی مٹھی میں ہوتی بھی خود چل کر منہ تک نہیں جاسکتا۔

غور کرو کہ اس آیت میں دعوت یعنی دعا کی تخصیص حق تعالیٰ ہی کے ساتھ کی گئی ہے اس لیے کہ جا رہو اور معمول ہے دعوت کا دل اپنے حامل پر مقدم ہے اور تقدیم معمول کی مدد ضروری ہے۔

اس پر علم کے بیان کا اتفاق ہر اور مفسرین کا اجماع، چنانچہ آیات تَعْبُدُوا إِلَهًا كَمَا تَعْبُدُونَ فِي دِينِكُمْ يُبْطِلُونَ اور عبادتِ
یہی صورت ہے۔ یہاں بھی حصر ہے۔ دعا کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ چاہیے اور عبادت
کا بھی۔ اسی تخصیص کو مثال سے واضح کیا گیا کہ جو حق تعالیٰ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ ان
بتوں کے مانند ہیں جو پیاس لگنے پر کنوئیں کے منہ پر جا کر پانی کو پکارتے ہیں۔ ہر ایسی پکار کو کافروں
کی پکار قرار دیا اور اس کا نتیجہ اور انجام "ضلال" یا گمراہی و بطلان و نا امیدی ٹھہرایا۔

(۶) إِذْ قَالَ لِأَسْبِيحُ وَتَكْمِمْ مَا تَعْبُدُونَ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَنْظُرُ لَهَا عَافِيَةً قَالَ

هَلْ يَسْمَعُونَ لَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ، أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يُضُرُّونَ (پ ۹۶) یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام
اور ان کی قوم کے درمیان ہوئی "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے فرمایا
کہ تم کس چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم ان ہی
پر عجبے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ تمہاری سستے ہیں جب تم ان کو پکارا کرتے ہو، یا یہ
تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں، یا یہ تم کو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں؟

ان آیات سے واضح ہے کہ غیر خدا کو پکارنا ان سے اپنی حاجتیں طلب کرنا مشرکین کا شیوہ
ہے اور یہ تو یہ ہے کہ جو شخص ایشور کو پکارتا ہے اور سے دعا کرے یا اس سے امیدِ نفع و ضرر کی
بدستغلال رکھے وہ بت پرست ہے اور جس کے ساتھ اس نے نفوذِ آلت کی نسبت قائم کر رکھی ہے
وہ اس کا "بت" ہے، حضرت سعدی نے کیا خوب کہا ہے۔

دل اندوہ مند بیدارے دست بست
کہ عاجز تراست از صنم ہر کہ نیست!

اس لیے حضرت طرخ شدتاً حیلانی نے فرمایا تھا۔ ليس الشرك عبادة الاصنام بل هو متابعتك
لهلاك وان تخذلك مع ذلك عز وجل شيئاً سواه من الدنيا وما فيها والاخرة وما فيها فما سواه
عز وجل غير ذلك فلكانت الى غيره فقد اشركت به عز وجل غيره۔

سے شکر کچھ ہی بت برستی نہیں بلکہ خواہشِ نفس کی پیروی ہے اور حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی شے کو ان کے سوا
دنیا الٰہی و ما فیہا سے متبذرتا ہے کیونکہ جو کچھ حق تعالیٰ کے سوا ہے وہ غیر الٰہ ہے، سوجب غیر کی طرف میل ہے تو گویا
وہ ہی غیر الٰہ ہے۔ (فتوح الغیب مقالہ ہفتم)

غیر حق ہرچہ دلت را بر بود سترِ راہ تو ہماں خواہد بود
غیر حق یک ذرہ کا مقصود توست تیغ لا کر کش کہ آن مجبوت توست

مشرکین کے طریقے کے خلاف موحّد کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے مانوس ہوتا ہے
ریخ و غم، درد و الم میں اسی کو پکارتا ہے، اسی سے اُمید و رجاء رکھتا ہے اسی سے سکون و بردِ قلبی
حاصل کرتا ہے۔

مرا بیگانگی از خلق با حق آشنا کردہ بطبع من کس کم ساختن بسیاری سازد!

مومن موحّد کی اسی شان کو حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں: **وَنَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا
أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِلَىٰ إِلَهِهِ رَاجِعُونَ** (پہلے ۴) یعنی "ایسے صابرین کو بشارت سنا
دیجیے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں اور ہم
سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں" غور کرو یہاں "مصیبت" اہم نکرہ ہے اور اذاب بھی عام
ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مصیبت و آفت میں، ہر درد و الم میں، ہر ریخ و غم میں حق تعالیٰ ہی کو یاد
کرتے ہیں، اسی کو پکارتے ہیں، اسی سے فریاد کرتے ہیں کہ **اللَّهُمَّ اِنك ارحم الراحمين** المشتكى و بك
المستغاث وانت المستعان ولا حول ولا قوة الا بالله" حق تعالیٰ آپ ہی کے لیے تمام تعریف
سزاوار ہے آپ ہی کی طرف ہماری شکایت ہے اور آپ ہی سے فریاد ہے اور آپ ہی مددگار ہیں، ہمیں
کوئی دوسرا نہ بچا سکتا ہے اور نہ سوائے آپ کے کسی میں حرکت ہے نہ قوت"

یارب ز تو یافت صورت آب گل من الطاف تو شد پناہ جان دل من
آسانی کار از تو بد حاصل من ہم از کرم تو صل شود مشکل من (در)

اسی آیت میں آگے صابرین کو جو بشارت دی گئی ہے اس کی تفصیل فرماتے ہیں: **أُولَٰئِكَ
عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ** یعنی "ان ہی لوگوں پر خاص خاص
رحمتیں ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے اور عام رحمت بھی ہے اور یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ" اسی

سے تفریحاً لازم آتا ہے جو مصیبت و غم کے وقت غیر اللہ کو یاد کرتے ہیں، ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور ان ہی کو اپنا مددگار اور پناہ گاہ سمجھتے ہیں وہ نہ خاص رحمتوں کے لائق ہیں اور نہ عام رحمت کے مستحق اور نہ ہدایت کے قابل یعنی درد و غم میں غیر اللہ کی طرف شکایت لے جانے والے، ان ہی کو اپنی جان و دل کی پناہ سمجھنے والے حق تعالیٰ کی نفیس کے لائق، غضب کے قابل اور ضلالت میں گرفتار ہیں! ذرا الفاظ کی نزاکت پر بھی غور کرو: **اولئک** کے بعد ضمیر مفصل لائی گئی ہے اور ہم المہتدین فرمایا گیا ہے، علماء و بیان کا اتفاق ہے کہ یہ ضمیر جہاں مبتدا و خبر میں آتی ہے مبتدا کو خبر میں منحصر کر دیتی ہے۔ اب اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہدایت سے وہی لوگ محقق ہیں جو وقتِ غم و ہنگامِ مصیبت حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں اور ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور جب ہدایت کا انحصار ان ہی پر ہوا تو ضلالت یا گمراہی ان کے غیر میں منحصر ہوئی! **ذلک** هو الخسران المبین۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی پر غور کرو۔ جب ان پر مصائب کا نزول ہوتا (اور عجوبے اشد الناس بلاء الانبیاء مصائب ان ہی پر زیادہ نازل ہوئی ہیں) تو ان کا رخ حق تعالیٰ ہی کی طرف پلٹتا، ان کے ہاتھ حق تعالیٰ ہی کے سامنے پھیلتے، ان کا سر حق تعالیٰ ہی کے قدموں پر جھکتا تھا۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش سے واقف ہو کر انتہائی حزن و الم کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:-

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (پت ۹۶)

ہمارا بڑا نقصان ہو جائیگا۔

یارب اگر ازجہل خطا شد کارم جاں از کرمت شاد بود بسیارم
 ز امید تو بس کہ دل بود بسیارم گویند کہ نیست از گنہ آزارم (قررد)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کے جو روئے تم سے عاجز اور تنگ آ کر حق تعالیٰ ہی کو فریاد کیا کہ
 آتٰی مَغْلُوبٌ فَاتَّصِرُ (پت ۸۷) میں درماندہ ہوں میرے پروردگار آپ انتقام لیجیے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تھکن، عجز و در ماندگی کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کی اور
پکایا:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ
خَيْرٍ فَعِیْرٌ (پتہ ۶۷) اس کا ہاتھ بندھوں۔

غم ناکم و از در تو با غم نہ روم جز شاد و امیدوار و خرم نہ روم
از در گم ہجو تو کیسے ہرگز نوید کسے نہ رفت و من ہم نہ روم (سود)

اور حضرت ایوب علیہ السلام نے ہجوم غم و الم کے وقت حق تعالیٰ ہی کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور التجا کی۔
اِنِّیْ مُسْنِیَ الصُّرُوۡاۡنْتَ اَرْحَمُ
السَّٰرِحِیۡنَ (پتہ ۶۸) سے زیادہ مہربان ہیں۔

یارب کریم تو گر نباشد دم خون جگر از دیدہ رود تا ابدم!
اور حضرت یونس علیہ السلام نے غم و اندوہ کی تاریکیوں میں حق تعالیٰ ہی کو پکارا کہ
لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ
كُنْتُ مِنَ الظَّٰلِمِیۡنَ (پتہ ۶۹) میں ہیں بیشک تصور وار ہوں !!

یارب ز کرم بخش تقصیر مرا مقبول کن ناہ شہگیر مرا
پیری و گناہ ماجرا است عیب لطف تو کند چارہ تدبیر مرا (سود)

اور حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے: فَلَوْلَا اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسٰۤخِیۡنَ لَلَّبِثَ فِیۡ بَطْنِۤہِۙ اِلَیۡ یَوْمِ
یُبْعَثُوۡنَ (پتہ ۹۷) یعنی اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی گھل کے
پیش میں رہتے۔ دیکھو لبث کو لام تاکید سے موکہ فرمایا گیا ہے اور مناجات تسبیح الہی کو قرار دیا
گیا ہے کہ کسی نبی، ولی کے نام کا ختم پڑھے، ان کو پکارنے اور اپنا درد و غمان کے سامنے رکھنے کو!
قرآن کریم میں ایک جگہ (پتہ ۱۲) حق تعالیٰ ہیں جنہوں کی حالت کی خبر ہے ہے ہیں
کہ جب وہ عالم شہادت، عالم برزخ اور عالم حشر کی ہزاروں مصیبتوں اور بلاؤں، آفتوں اور

مشکلوں کو اٹھا کر بالآخر جنت میں داخل ہونگے تو کہیں گے: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا
 لِنُضَيِّقَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللهُ - یعنی حق تعالیٰ ہماری ہدایت نہ کرتے تو اس مقامِ راحتِ ابدی
 تک ہماری رسائی کبھی نہ ہوتی! زندگی کے ہر قدم پر اور موت کے بعد ہر مرحلہ پر حق تعالیٰ ہی کا دست
 کرم ہماری تائید کرتا ہے اسی لیے نصیحت فرمائی: وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَ
 نِعْمَ النَّصِيرُ (پ ۶، ۱۱) یعنی حق تعالیٰ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارے کارساز ہیں کیسے اچھے
 کارساز ہیں اور کیسے اچھے مددگار! اب انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف رخ کرنا بے شرمی نہیں تو کیا ہے!

اے آنکھ قبیلہ! بناں روست ترا بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا
 دل درپے این واں نیکوست ترا یک دل داری بس است یکدوست ترا (طبی)

قرآن کریم کی ان تمام تصریحات کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی
 طرف توجہ کرتے ہیں اور نہایت اختصار کے ساتھ چند دعاؤں کو پیش کر کے واضح کرتے ہیں کہ
 درد و رنج، غم و ہم، آفت و مصیبت کے وقت سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو یاد نہ کرنا چاہیے، ان
 ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور ان ہی کا نام زبان پر آنا چاہیے اس کے بعد احتمالِ امر میں
 اسبابِ دنیویہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز
 پڑھتے، چنانچہ مروی ہے: اِذَا حَزِنَا مِنْ فِرَاقِ الصَّلَاةِ (راہ احمد) اور ظاہر ہے کہ نماز میں سوائے تسبیح و
 تہلیل، تہلیل و تقدیس کے اور کیا ہوتا ہے۔ ترمذی میں ہے کہ آپ کو جب کوئی سخت کام پیش آتا تو فرماتے:
 يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ اور دوسری حدیث میں ترمذی کی مذکور ہے کہ جب کسی امر کے متعلق
 فکر ہوتی تو آسمان کی طرف نظر کرتے اور کہتے: سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ! جب دعائیں کوشش کرتے
 تو فرماتے: يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ - آپ نے فرمایا کہ غمگین کی دعا یہ ہے: اللهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْا فَلَ تَكُنْ لِيْ
 نَفْسِيْ طَرْدًا عَيْنٍ وَاَصْلَحْ لِيْ شَأْنِيْ كُلَّهُ اِلَّا اَنْتَ - عیس کی صاحبزادی اسماء رضو حضرت

خاتہ اللہ بے بس تیری جنت ہی کا آسرا ہے، تو بے پل بھر کے نیے بھی میرے نفس کے حوالہ نہ کر اور میرے سب کام درست کر دے

عائشہ صدیقہ کی بہن تھیں) کو فرمایا، کیا تجھے چند ایسی باتیں بتلا دوں جو غم کے وقت کہا کرے؟ کہ اللہ
 اللہ بقی لا اشرك به شيئاً (سات بار) آپ نے ایک انصاری کو جن کا نام ابو امامہؓ تھا۔ غیر وقت
 نماز مسجد میں دیکھ کر پوچھا کہ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قرص کے بارے کے نیچے دبا جا رہا
 ہوں، متفکر اور پریشان ہوں۔ فرمایا صبح و شام اس دعا کو پڑھا کرو: اللھم انی اعوذ بک من الھم والھزن
 واعوذ بک من العجز والکسل واعوذ بک من الحین والبخل واعوذ بک من غلبۃ الدین وقصر
 للرجال۔ ایک مرتبہ فرمایا۔ من لزم الاستغفار جعل اللہ لہ من کل ہم فرجا ومن کل ضیق مخرجاً و
 رزقہ من حیث لا یحسب۔ یعنی جو ہمیشہ استغفار پڑھا کرے تو اللہ اس کی ہر مصیبت کو دفع کر دیتا
 ہے اور ہر تنگی سے اس کو نکال لیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان تک نہ ہو (رواہ
 احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ عن ابن عباس) ایک اور موقع پر فرمایا کہ جب کسی پر غم و مشکل لوٹ پڑے تو کہا
 کرے لا حول ولا قوۃ الا باللہ (کذا فی مشکوٰۃ)

دیکھو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ما اودى نبی ما اودیت یعنی جتنی اذیت مجھے
 پہنچی اتنی کسی نبی کو نہیں پہنچی مگر کیا کسی اذیت یا تکلیف کے وقت آپ نے کسی نبی کو یاد کیا کہ یا آدم
 ابو نوح نبینا، یا ابراہیم خلیل اللہ؟ یا ہر وقت اسی ذات پاک سے زیادہ کی جو تمام مشکلات کو رفع
 کرتی ہے جو فاسخ ہم ہے، کاشفت غم ہم ہے، جو مجیب دعوة المضطربین ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو آپ نے
 تعلیم فرمائی تھی کہ یا غلام احفظ اللہ یحفظک احفظ اللہ تجدد تجاہک، واذا سألت فاستقل
 اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ واعلم ان الامم لو اجتمعت علی ان ینفعوک بشیء لم
 ینفعوک الا بشیء کتب اللہ لک ولو اجتمعوا علی ان یضروک بشیء لم یضروک الا بشیء قد
 کتب اللہ علیک رفعت الاقلام وجفت الصحف (اخرجه الترمذی عن ابن عباس) یعنی
 لے لے کے اللہ کو یاد رکھو وہ تجھ کو یاد رکھیگا۔ اللہ کو یاد رکھو کہ تو اس کو اپنے سامنے پائیگا اور جب تو کچھ

لے یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ مصیبت زدہ یہ دعا پڑھے، اللھم فارح الھم، کاشفت الغم، مجیب دعوت
 المضطربین، رحمن الدنیا ورحیمھا، انت تو رحمنی، فارح منی برحمتہ تغنینی بھما عن رحمتی من سواک
 (رواہ الحاکم عن ابن ماجہ و ابن ماجہ عن ابی بکر صدیقؓ)

لگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے چاہ (ایاک نعبد وایاک نستعین)
 اور یقین کر لے کہ اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے فائدہ پہنچائیں جو اللہ نے
 تیرے لیے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا،
 اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر
 نہیں کی تو اس پر قدرت نہ پائیں گے، قلم اٹھالیے گئے اور خشک ہو گئیں کتابیں، دیکھو اس حدیث
 میں کس وضاحت و صراحت کے ساتھ استعانت عن غیر اللہ سے منع کیا گیا ہے اور کس طرح سمجھوں سے توڑ کر
 صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑا گیا ہے! کفی باللہ وکیلا!

از خدا خواہم وز غیر نخواہم بخدا کہ نیم بندہ دیگر نہ خدا کے درگست!
 یہ کہہ کر کہ ساری دنیا تجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتی (کیونکہ وہ ایک مکھی کی تخلیق پر بھی قادر نہیں)
 احتیاج کی ساری نسبتوں کو جو غیر اللہ کے ساتھ قائم کی جاسکتی ہیں ایک ہی ضرب میں کاٹ دیا
 گیا ہے اور پھر یہ سنا کر کہ ساری دنیا تجھے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں (کیونکہ وہ مکھی سے بھی کوئی شے چھین
 نہیں سکتی) غیر اللہ کے خوف کو سینے سے بالکل دور کر دیا گیا ہے اور اس طرح ہمیں خوف و حزن کی ان
 زنجیروں سے بالکل آزاد کر دیا گیا ہے جو غیر اللہ ہمارے جہل و شرک کی وجہ سے ہماری گردن میں
 ڈال سکتا تھا! اب میں توحید ہی کی بدولت آزادی و جرات کے ساتھ باواز بلند کر سکتا ہوں:

لوالثقلان الا نزع المجن اجمعوا یزید من ایلاما لا صغر من لہ

یکون لها رب السموات ناصر لما ظفروا منها بآدنی مضرة

کیا یہ آزادی بے خوفی یا استقلال ان شرک پسند بت پرستوں یا گور پرستوں کو حاصل ہو سکتا
 ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع و ضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت کو جوڑتے ہیں، ان ہی کے
 آگے سر نیاز خم کرتے ہیں اور ان ہی کے سامنے دست سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسول کی

لہ اگر جن و انس دونوں جمع ہو کر چھوٹی سی چھوٹی چوٹی کو جو کہ پہنچانا چاہیں اور حق تعالیٰ اس کے ناصر و مددگار ہوں
 تو وہ اس کو ادنیٰ مضرت بھی نہیں پہنچا سکتے۔

اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ

لیسأل احدکم رب حاجتہ کلھا حتی ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار

یسأل الملئوحتی یسألہ شمع ہم سے مانگے یہاں تک کہ ٹمک بھی اسی سے مانگے

نعلہ اذا انقطع (ازہو الترمذی عن انس) اور جتنی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جنہیں افسوس ہے کہ قادر یہ کی ایک بڑی

تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے۔ مصائب میں ان ہی کو پکارتی ہے، آفات کے دور کوٹے کے لیے

ان ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے) حدیث ابن عباس کو جو اوپر مذکور ہوئی اپنی فتوح

الغیب میں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ: فینبغی لکل مؤمن ان یجعل ہذا

الحديث امرأة لقلبه و شعاره و دثاره و حدیثہ فیعمل بہ فی جمیع حرکاتہ و سکناتہ حتی یسلم فی

الدنیا و الآخرة و یجد العزۃ فیہما برحمتہ اللہ تعالیٰ۔ یعنی ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث نبوی کو

اپنے قلب کے لیے آئینہ بنالے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خوبی و

زشتی راستی و کجی کو معلوم کرے، بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر اور باہر کا جامہ بنالے اور ہر وقت کے

لیے اس کو ایک سخن و حکایت ٹھہرائے کہ اپنے دل سے اس کی تکرار کرتا رہے اور اپنے تمام حرکات و

سکنات میں اس پر عمل کرے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات نفسی و آفاقی سے محفوظ رہے اور

اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے۔

شیخ جلالی توحید کے آفتاب تھے، آپ کی کتاب مستطاب "فتوح الغیب" کی ہر سطر سے توحید

کی تعلیم مترشح ہوتی ہے اور سلسلہ عالیہ قادر یہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے الفاظ میں "اجماع کتاب و

سنت و اجتناب از وقوع در مہادی بدعت" کے سوا کچھ نہیں! اسی لیے محدث دہلوی آگے چل کر

فرماتے ہیں: "پیرا فرمود کہ در سلاسل دیگر از چیز ہائے دیگر پر سند امداد میں سلسلہ از مشرعیّت زہنار

کتاب مشرعیّت مظہرہ شکایت نہ کند! تو!"

اشراک فی العلم | مشرکین کی "عبادت" کے پہلے جزد سے ہم نے صفحات بالاس تفصیل سے بحث کی کہ یہ غیر اللہ کو مقرب و شفیع، نافع و ضار جان کر ان سے اپنی حاجت کے وقت فریادری چاہتے تھے، یعنی ان کو پکارتے یا استعاذت کرتے تھے، یہی ان کا شرک تھا "اشراک فی التصرف" تھا، اگر ان ہی افعال کا ارتکاب کسی کلمہ گو سے ہو تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کی کلمہ گوئی اطلاق شرک سے مانع نہ ہوگی۔ دیکھو اس "اشراک فی التصرف" میں "اشراک فی العلم" بھی لازماً شامل ہوتا ہے۔ درد و مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارنے والا نہ صرف سمجھتا ہے کہ وہ اس درد و غم کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں بلکہ اس کا قطعی یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے اس استغاثہ اور پکار کو ہر وقت اور ہر جگہ سے سن بھی سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر سے اور بغیر مطلع ہوئے وہ اس کی مدد کر کے سکتے ہیں؟ اس طرح وہ غیر اللہ کے لیے علم غیب بھی ثابت کرتا ہے، حالانکہ علم غیب خصائصِ الہیہ سے ہے اور غیر اللہ سے قطعاً مسلوب! یہی اس کا "اشراک فی العلم" ہے! اور اس سے زیادہ ضلالت اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے! وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دَعْوَاهُمْ غَافِلُونَ (پتہ ۱) "اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو"

یہ امر کہ علم غیب خاصہ حق سبحانہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو نہیں، قرآنِ مبین میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں پہلے چند اجمالی آیات پر غور کرو۔

۱) وَ لِلَّهِ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ أُو۟رَآسَآنِو۟نِ اُد۟ر۟زِمِی۟نِو۟نِ مِی۟نِ جَب۟نِی۟ غَی۟بِ کِی۟ بَآتِی۟نِ مِی۟نِ اُن۟ کَا
اِلَی۟ہِ یُر۟جَعُ اَل۟اَم۟رُ کُلُّہٗ (پتہ ۱) علمِ خدا ہی کو ہے اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہونگے۔

۲) مختصر لفظوں میں غیب کی حقیقت سمجھ لو تاہم معنی بیحد ہی کہتے ہیں کہ غیب وہ امر ہے جس پر عقلی دلیل قائم ہو سکتی ہے نہ وہ بدیہی ہو نہ حواس کی رسائی اس تک ہو۔ (تفسیر انوار التنزیل)

اسی مفہوم کو نغیا اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَ
الْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا يَشْعُرُونَ
أَنَّهُمْ يُبْعَثُونَ (پ ۱۴)

(۲) لَمْ يَغْيِبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
الْبَصِيرَةَ وَأَسْمِعَ رِجْدَعًا (۱۱)

(۳) فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ (پ ۱۶)

مندرجہ ذیل آیات میں غیر اللہ سے علم غیب کی مطلق نفی کی جا رہی ہے۔

(۴) وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا
إِلَّا هُوَ (پ ۱۳)

خود آنحضرت صلعم نے غیب کی کنجیوں کی تفسیر ان پانچ چیزوں سے فرمائی جن کا ذکر صراحت سے سورہ لقمان
میں آیا ہے :-

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنزِلُ
الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا
تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا
تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ
إِنَّ اللَّهَ سَعِيدٌ خَبِيرٌ (پ ۱۳)

جتنے حوادث کو نیا اور وقائع غیبیہ ہیں سب ان پانچ میں داخل ہیں (۱) حوادث سماویہ کو انزال
غیث میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق آسمان سے ہے (۲) حوادث ارضی "علم ما فی الارحام" میں
داخل ہیں اور (۳) حوادث حیات کا تعلق لازماً "ما اذا تکتسب غدا" سے ہوگا اور (۴) حوادث
موت و بعد موت ظاہر ہے کہ "ما تدری نفس بائی ارض تموت" میں شامل ہیں۔ جب ان تمام حوادث

و امورِ غیبیہ کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے اور کسی فرد بشر کو عطا نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ کسی حادثہ غیب کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا اور جب (۵) علم قیامت (یعنی اس کے خاص وقت و وقوع کا علم) کسی نبی کو نہیں حالانکہ سب اس کی خبر دینے میں متفق ہیں۔ تو اور حوادثِ آتیہ کا علم بدرجہ اولیٰ ان کو نہ ہوگا۔ غرض جب ان پانچ کا علم کسی کو نہ ہوا تو اور چیزوں کا علم بدرجہ اولیٰ نہ ہوا، اسی لیے ان کو مفارح غیب کہا گیا ہے، گویا جملہ امورِ غیبیہ ان کے اندر ہیں اور یہ تمام خزائن غیب کی کنجیاں ہیں اور جب خزانہ کی کنجی ہی کسی کو نہ ملے تو اس میں سے ایک جیب بھی نہیں مل سکتا۔

(۵) وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ
اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ
إِنِّي مَلَكٌ (پ ۳ ع ۱۳)

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے تمام خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔

(۶) قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا
إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ
الْغَيْبَ لَا سُنَّكَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ
وَمَا سُنَّيَ الشَّرِّ إِنْ أَنَا إِلَّا
نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ
(پ ۳ ع ۲۳)

آپ کہہ دیجیے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی جتنا کہ خدا تعالیٰ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی، میں تو محض بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

یعنی میں ایک بندہ ناتواں ہوں اپنے لیے جلبِ نفع و دفعِ ضرر کی قوت نہیں رکھتا مگر جو میرا مالک چاہے نفع و دفع سے، پھر اس بیان کو اس طرح موکد کیا جا رہا ہے کہ اگر میں غیب کو جانتا تو جو بات بھلائی اور نفع کی ہوتی اس کو اپنے لیے حاصل کرتا۔ اور جو بات بُری اور نقصان کی ہوتی اس سے دور رہتا تا کہ وہ بُرائی مجھے نہ لگے، لیکن میں تو ایک بندہ عاجز ہوں، میں کیا جانوں کہ میرے رب میرے مالک کے علم میں میرے لیے اچھا کیا ہے اور بُرا کیا، میرے حق میں اس کا حکم کیا ہے اور کونسی

انھس التی قال اللہ تعالیٰ ان اللہ عنده ذکر کیا ہو (آخر سورہ لقمان میں) تو اس نے بڑا
علم الساعة فقد اعظم الفریۃ طوفان باندھا۔

(۳) عن الربیع بنت معوذ بن عفراء قالت ربيع بنت معوذ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے
جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فدخل مکان میں تشریف لائے جب میری شادی ہو رہی تھی
حين بنی علی مجلس علی فراشی بجلسک پھر میرے پاس مندر پر بیٹھ گئے۔ ہماری کچھ لڑکیاں
منی فجعلت جوہریات لنا یضربن بالذکوانے لگیں دن بجا کر اور ہمارے ان بزرگوں کا ذکر
ویندن من قتل من ابائی یوم بدر کرنے لگیں جو بدر میں مارے گئے تھے۔ ان میں سے
اذ قالت احدھن وفینا نبی یعلم ما ایک کہنے لگی کہ ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو جانتا ہے کہ
فی غدی فقال دعی هذه وقولی بالذکوانے فرمایا کہ ایسا مت کہہ بلکہ جو
كنت تقولین یہ پہلے کہہ رہی تھی وہی کہے جا۔

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات بزرگترین اور کامل ترین ہستی اپنی ذات مقدس سے علم
غیب کی نفی فرما رہی ہے، پھر آپ کی امت سے کسی کی یہ مجال کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ علم غیب کو اپنی جانب نسبت
کے۔ امور غیب کا علم بذاتہ کسی انسان کو حاصل نہیں وہ مخصوص ہر حق تعالیٰ ہی کی ذات کے لیے اور انسا الغیب
للہ کوئی شخص خواہ وہ نبی ہو یا ولی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ خود وہ کل کیا کرے گا: وَمَا تَدْرِي قَسْمًا ذَا انْكَسَبَ غَدًا
حدیث اول کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مناقض ہے آیت کریمہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ
مِنْ ذُنُوبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ اور نیز منافی اس آیت کے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى۔ اس لیے یہ
حدیث منسوخ ہے اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کا ایسا فرمانا محض خوف و خشیت الہی
کے لحاظ سے تھا نہ کہ واقعہ کے لحاظ سے۔

طیبی نے اس حدیث کی تشریح میں بتلایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد
اس قول سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات سے علم غیب کی نفی فرمانا چاہتے ہیں اور صاف
طور پر ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ ہرگز غیب پر مطلع نہیں، نہ اپنی تقدیر سے واقف ہیں نہ کسی

لے بخاری ۵۷ بخاری -

اور کی تقدیر سے، اپنے پوشیدہ کاموں سے واقف ہیں نہ غیر کے۔ آپ کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی نجات کا بھی یقین نہیں رکھتے اس لیے کہ یہ امر تو بہت ساری دوسری حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے اور آیات قرآنیہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ لہذا اس حدیث کو کسی آیت کا معارض قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ بلا احتمال نسخ وہ بھی دو وجوہ سے درست نہیں: (۱) نسخ کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ تاخرناسخ کا معلوم نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہاں تقدم حدیث کا اور تاخر آیت کا معلوم نہیں (۲) نسخ "احکام" میں جاری ہوتا ہے "اخبار" میں جاری نہیں ہوتا، اخبار میں نسخ کا حکم لگانا گویا شارع پر کذب کی تہمت لگانی ہے۔

دوسری حدیث تو آیت قرآنی ہی کی ترجمان ہے اس کا انکار قرآن میں انکار ہے۔ یہاں حجت یہ تراشی جاتی ہے کہ علم غیب کے اقسام میں امتیاز کیا جانا چاہیے۔ ایک علم غیب مطلق ہے دوسرے علم غیب اضافی غیب مطلق یا غیب حقیقی کا تو علم حق تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے لیکن غیب اضافی کے علم کی نسبت انبیاء و اولیاء کی طرف کی جاسکتی ہے۔

دیکھو غیب اضافی کے معنی تو یہی ہوتے کہ بعض پر ظاہر ہوتا ہے اور بعض پر پوشیدہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر لذت جماع کو لو یہ رجولیت والے پر غیب نہیں، نامرد یا عین کے لیے غیب ہے۔ یارنگوں پر غور کرو، یہ مادر زاد اندھے کے لیے غیب ہیں لیکن آنکھوں والے کے لیے غیب نہیں، یہی حال آوازوں کا ہے، سننے والے کے لیے یہ غیب نہیں مادر زاد بہرے کے لیے ضرور غیب ہے۔ اسی طرح حیدرآباد کا حال حیدرآباد والوں پر غیب نہیں، بریلی والوں کے لیے غیب ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیب اضافی کے جاننے میں کچھ اولیاء و انبیاء کی تخصیص نہیں۔ لذت جماع جو عین کے لیے غیب ہے اس کو بہر مرد خواہ وہ کافر یا مومن جانتا ہے، اسی طرح آوازوں کو بہر کان والا خواہ وہ نیک ہو یا بد جانتا ہے اور یہ مادر زاد بہرے کے لیے غیب ہیں۔ انبیاء و اولیاء کو جو قائل یا حوادث حق تعالیٰ بذریعہ وحی والہام بتلا دیتے ہیں وہ ضرور ان کو معلوم ہو جاتے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے بغیر خبر

دینے کے یہ ہرگز معلوم نہیں ہو سکتے اور حق تعالیٰ نے اس بات کی خبر نہیں دی کہ زمین و آسمان میں جتنے حوادث و واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، ان کی اطلاع کسی نبی یا ولی کو اس نے سے رکھی ہے۔ لہذا ان کے علم کا دعویٰ کسی نبی یا ولی کے لیے کرنا محض بے دلیل ہے اور آیات قرآنیہ کا صریح انکار۔ اور اس امر کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اخبار بالوحی میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، شیطان کے تصرف سے یہ قطعاً محفوظ ہے، لیکن الہام میں عصمت شرط نہیں، الہام کبھی شیطانی ہوتا ہے اور کبھی رحمانی۔ اس لیے اولیاء کرام الہام پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتے جب تک کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو۔

تیسری حدیث کی تاویل میں مرضیاتی ذہنیت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں جمیع علوم موجود ہیں اور ان سب کا علم رسول کو ہونا ضروری ہے ورنہ جہل لازم آئیگا اور جہل منافی شان رسول ہے! یہاں ایک کھلا مغالطہ ہے۔ قرآن میں جمیع علوم کے موجود ہونے سے مراد جمیع علوم دینیہ کے سوا کچھ نہیں، ان علوم کا تعلق سعادت انسانی سے ہوتا ہے جس کے حصول کا انسان مکلف ہے۔ قرآن کریم میں نہ ملائکہ کی جملہ تعداد موجود ہے نہ ذرات زمین کے اعداد اور نہ نجوم کی گنتی۔ نہ انجیرنگ کی تفصیلات اور نہ حیوانات، مصریات کی کلی توضیحات! نہ ان چیزوں کا کتاب الہی میں ہونا ضروری ہے اور نہ ہم ان کی تحصیل پر مامور ہیں اور نہ رسول پر ان کی تبلیغ ضروری اور نہ ان سے جہل منافی شان رسول! خود حق تعالیٰ نے اس امر کی توضیح کر دی ہے کہ بہت سی باتوں کا ہم نے قرآن میں ذکر نہیں کیا مثلاً، **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ** (پہ ۱۳۷) یعنی بہت سے رسولوں کا ذکر ہم نے کیا ہے اور بہتوں کا ذکر نہیں کیا!

بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا کہ **هَذَا وَفَوَيْ بِالذِّمَى كُنْتُ**

لہ ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے تھے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

تقولین محض اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو ان لڑکیوں کی باتوں کے سُننے کا اشتیاق تھا جو وہ شہداء بدر کے متعلق کہہ رہی تھیں، اہم غیب کا انکار کرنا مقصود نہ تھا۔

اس توجیہ میں بالکل اسی قسم کی ہوشمندی و ذہانت سے کام لیا گیا ہے جو ہمیں اس اہمق میں ملتی ہے جس کی ٹانگ میں تیر لگا تھا اور خون بہہ رہا تھا وہ اور اس کی عورت دونوں خون پونچھ رہے تھے اور اہمق عقل کا دشمن برابر کہے جا رہا تھا کہ خدا کرے تیر نہ لگا ہو! حضور انور صلعم تو ان لڑکیوں کی اتنی بات سن کر کہ ہم میں ایک نبی ایسا ہے جو کل کی بات جانتا ہے فرماتے ہیں کہ یہ بات چھوڑ دو اور اپنا پہلا قصہ جاری رکھو۔ اور اس کی تاویل یوں کی جا رہی ہے کہ علم غیب کا انکار مقصود نہیں! "کل کی بات جاننے کی" نفی تو قضیہ کلیہ کے طور پر خود قرآن مجید میں حق تعالیٰ فرمایا ہے: وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ قَاذًا تَكْسِبُ غَدًا۔ یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کریگا! اب اس صریح تردید کے بعد تاویل کا کونسا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ ۶ ہشمار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال کی تصدیق ان احوال و واقعات سے بھی کر لو جو

آپ کی زندگی میں رونما ہوئے۔ ان میں سے صرف تین کا ذکر یہاں کافی ہوگا۔

(۱) واقعة افك: آپ کی محبوبہ عاتکہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر لوگوں نے ہمت لگائی

آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے اس کی تحقیق و تفتیش فرمائی، اکابر صحابہ سے مشورے کیے، لیکن

حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا، آپ کے غم و حزن میں اضافہ ہوا اور تیس دن اسی حال میں گزر گئے

بالآخر حق تعالیٰ ہی نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا کہ عاتکہ صدیقہ اس ہمت سے پاک ہیں۔

(۲) واقعة بئر معونہ: اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور انور صلعم کی ہمت

میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ چند لوگ میرے ساتھ کر دیں جو میری قوم

کو دین کی تبلیغ کریں اگر وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں تو میں بھی مسلمان ہو جاؤنگا۔ آپ نے اس

کی بات کو صحیح جان کر ستر صحابہ جلیل القدر اس کے ہمراہ کر دیے۔ راستہ ہی میں اس غدار کی یوفا

قوم نے ان ہر دوں کو شہید کر دیا، جب حضور اکرم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ کو نہایت رنج

ہوا، اور ایک مہینے تک قاتلین کے حق میں صبح کی نماز میں آپ نے پدید عافرائی! (۳) سورہ تھنجر کی شان نزول۔ حضور انور کو شہد نہایت مرغوب تھا، آپ حضرت زینبؓ کے ہاں تشریف لے جا کر شہد نوش فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہیے کہ آپ کا حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ ٹھہرنا کم ہو جائے سو حج بچار کے بعد بات یہ ٹھہری کہ ہم میں سے جس کے پاس پہلے آپ کی تشریف آوری ہو وہ آپ سے کہے کہ آپ کے منہ سے تو مغافیر کی بو آتی ہے۔ آپ کے قلب مبارک میں یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ جو شہد آپ نوش فرماتے ہیں شاید ان کھٹیوں کا ہو جو مغافیر پر بیٹھی ہوں۔ چونکہ بدبو سے آپ کو نفرت ہے اس لیے شہد پینا ترک فرما دیجئے اور اس طرح حضرت زینبؓ کے پاس کی نشست کم ہو جائیگی۔ ان بیویوں کی یہ بات چل گئی اور حضور انورؐ نے قسم کھالی کہ اب شہد کبھی نہ پونے گا!

جس بات کی قرآن مبین نے صاف صریح الفاظ میں وضاحت کی، جس بات کو رسول اکرم صلعم نے خوب کھول کر بیان کیا، جس بات کی تائید آپ کی زندگی کے مختلف و متعدد واقعات سے ہوتی ہو وہ صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ ہی عالم غیب ہیں ان کے سوا مخلوقات میں کوئی ہستی عالم غیب نہیں، ان ہی کے علم عطا فرمانے پر انبیاء و اولیاء کو غیب کے بعض واقعات کا علم ہوتا ہے، یہ ان کی اختیاری چیز نہیں کہ جب چاہا معلوم کر لیا، یہ حق تعالیٰ ہی کا اختیار ہے کہ جب چاہا اور جتنا چاہا کسی نبی و رسول کو بذریعہ وحی غیب پر مطلع کر دیا! اسی بات کو حضرت سعدیؒ نے اپنے مشہور

اشعار میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ میں اس طرح ادا کر دیا ہے۔

یکے پر سید زان گم کردہ فرزند	کہ اے روشن گہر پر خرد مند!
زمصرش بوسے پر اہن شمیدی	چرا در چاہ کشفش ندیدی!
بگفتا حال من برق جہاں است	دے پیدا و دیگر دم نہان است!
گے بر طارم اعلیٰ نشینم	گے بر نشیت پلے خوردنہ بینم!
اگر درویش بر حالے باندے	دو دست از ہر دو عالم برشان دے

لے یہ نینوں واقعات صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔

اشراک فی التصرف اور اشراک فی العلم کو اچھی طرح سمجھ جانے کے بعد اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نداء و صدا کی مندرجہ ذیل تمام صورتیں قطعاً ناجائز اور حرام قرار پاتی ہیں کیونکہ یہ کفر و شرک تک پہنچا دیتی ہیں۔

(۱) درد و مصیبت کے وقت اولیاء اللہ کو اس عقیدہ سے بچانا کہ یہ ہر جگہ سے ہماری ندائے درد کو سن لیتے ہیں اور ہماری اعانت کر سکتے ہیں، یہ قطعاً اشراک فی العلم و اشراک فی التصرف ہے۔ تمام فقہانے اس کی تکفیر کی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی سے اس کا تفصیلی ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے۔

(۲) اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر ان کو پکارنا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میری فریاد کو سنیے، میری بلا کو ٹال دیجیے، میری حاجت کو رو کیجیے" یہ استغاثہ و استعانت دعا اور طلب حاجت ہے خواہ قریب سے کی جائے یا دور سے اور یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ دعا کی تفصیل میں اوپر اس کا ثبوت دیا جا چکا ہے۔ (۲) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میرے لیے دعا کیجیے کہ اللہ میری بلا کو ٹال لے اور میری حاجت کو رو کرے" یہ قطعاً بدعت ہے، قرون مشہود لہا بالخیر میں کسی نے ایسا نہیں کیا۔

امام ابو حنیفہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صاحبین کی قبروں پر آ کر کہتا ہے کہ "هل لکم من خبرہ هل عندکم من اثرانی انیتکم و نادیتکم من شہود و لیس سوالی منکم الا الدعاء، فهل دریتم ان غفلتم لے اہل قبور کچھ تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کئی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا ہوں؟ میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لیے دعا کرو، کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم فاضل ہو میرے حال سے؟" یہ سن کر امام عظیم نے اس شخص سے پوچھا "هل لجا بوا لک؟" کیا انہوں نے تم کو کوئی جواب دیا۔ اس نے کہا "نہیں" آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا "سمخا لک و تثبت یدک کیف تکلم اجساد الایستطیعون جواباً ولا یملکون شیئاً ولا یسمعون صوتاً" یعنی "پشکار ہو تم پر خاک آلود ہوں تیرے دونوں ہاتھ! بے جسم کیسے بات کر سکتے ہیں جو

جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جو کسی شے کے مالک نہیں، جو کوئی آواز بھی نہیں سن سکتے!“
 پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ یعنی حق تعالیٰ حضور انور صلعم کو مخاطب
 کر کے فرماتے ہیں ”آپ ان لوگوں کو جو قبریں ہیں کچھ نہیں سنا سکتے“

امام اعظم کے اس عتاب سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہو رہی ہے:-

(۱) اولیاء و صاحبین کی قبروں پر اگر ان سے خطاب کسی طرح جائز نہیں۔ آپ نے ایسے
 لوگوں کو بد دعا دی ہے جو اہل قبور سے دعا کے طالب ہوتے ہیں! اگر آپ کو ان جہال کا حال معلوم
 ہوتا جو اہل قبور سے رزق، صحت و اولاد مانگتے ہیں اور ان کو مستقل یا غیر مستقل طور پر قادر جانتے
 ہیں تو یقیناً ان کو کافر و مشرک و ملعون قرار دیتے اور گردن مارنے کا حکم دیتے!

(۲) مرے زسن سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ پھر بلاؤں کا مالنا، مصیبتوں کا دور
 کرنا ان سے کیا ہو سکتا ہے! اور جب یہ نزدیک سے سن نہیں سکتے تو دور کی کب سینگے؟ محققین حنفیہ
 سماع موتی کے قائل نہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشکان بدر سے جو خطاب فرمایا تھا اس
 کی توجیہ مختلف طریقوں سے کی گئی۔ بہترین توجیہ یہ ہے کہ:-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ الَّذِیْ جَعَلَ لَیْسَ بَاہِلَ السَّمَاۤءِ اِلَّا تَرٰی اِلٰی قَوْلِهِ تَعَالٰی اِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتِ
 وَ اِلٰی قَوْلِهِ تَعَالٰی وَ مَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مِّنْ فِی الْقُبُورِ۔
 یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ الَّذِیْ جَعَلَ لَیْسَ بَاہِلَ السَّمَاۤءِ اِلَّا تَرٰی اِلٰی قَوْلِهِ تَعَالٰی اِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتِ
 وَ اِلٰی قَوْلِهِ تَعَالٰی وَ مَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مِّنْ فِی الْقُبُورِ۔
 یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ الَّذِیْ جَعَلَ لَیْسَ بَاہِلَ السَّمَاۤءِ اِلَّا تَرٰی اِلٰی قَوْلِهِ تَعَالٰی اِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتِ
 وَ اِلٰی قَوْلِهِ تَعَالٰی وَ مَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مِّنْ فِی الْقُبُورِ۔

شرح مواقف میں تشریح کی گئی ہے کہ علم و قدرت و ارادہ، سمع بصر سمیت کے لیے ثابت

لہ غرائب فی تحقیق المذائب لہ شرح مواقف تذیل فی ذکر فرق بعد موقف سادس ص ۵۰، مطبوعہ نول کشور۔

کرنا فرقہ صاحبیہ کا عقیدہ ہے جو معتزلہ کا ایک گروہ ہے۔ الصالحیہ اصحاب الصالحی و مذہبہم انہم
 جود و اقیام العلم و القدیة و الارادة و السمع و البصر بالمیت و یلزمہم جواز ان یکون الناس
 مع اتصافہم بھذہ الصفات امواتا وان لا یکون الباری تعالیٰ حیاً یعنی صاحبیہ گروہ ہے
 صالحی کا اور مذہب ان کا یہ ہے کہ انہوں نے میت کے لیے علم و قدرت و ارادہ و سمع و بصر کو جائز
 قرار دیا ہے، ان کے مذہب کی رو سے تو یہ لازم آتا ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں وہ
 سب مردہ ہیں اور حق تعالیٰ بھی زندہ نہیں! اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر گورپرست
 مشائخ اسی فرقہ ضالہ کے عقیدہ پر قائم ہیں لغوذا شد من ذلک۔

غرض جب مردے سن نہیں سکتے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے کافروں کی تشبیہ عدم
 سمع میں مردوں سے دی اور اثبات سمع عقیدہ ہے صالحیہ مفسدین کا جو معتزلہ کا گروہ ہے تو پھر قبروں
 کے پاس جا کر مردوں کو پکارنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بے عقل
 پتھر کو پکارے اور اس سے دعا کی خواہش کرے! فیعل کسی پاگل سے تو صادر ہو سکتا ہے عاقل و
 ہوشمند سے کیسے ممکن ہے؟ عموماً ایسے ہی پاگل مردوں کو قبروں میں نہ صرف زندہ اور توانا سمجھتے
 ہیں بلکہ ان کو حق تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع اور مقرب بھی جانتے ہیں، اسی لیے وہ ان کی عبادت
 کرتے ہیں یعنی ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان کی قبروں کو بوسہ دیتے ہیں
 اور ان کا طواف بھی کرتے ہیں اور کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں! ذلک هو الخسران للمہین!
 یہاں غلط فہمی رفع کرنے کے لیے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو شخص حضور انور صلی اللہ
 علیہ وسلم پر دوسے درود بھیجتا ہے اس کو آپ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، آپ اس کو نہیں سنتے
 البتہ بزرگان دین اور محققین شرع متین نے اس امر کی تصریح کی ہے اور روایات مرفوعہ میں
 بھی یہ امر مذکور ہے کہ جو شخص آپ کے مزار مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے اس کو آپ بخوبی سنتے
 ہیں چنانچہ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی نے شعب الایمان میں ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ قال رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعہ من صلی علی فایا بلغۃ یعنی جو درود

بھیجتا ہے میری قبر کے نزدیک اس کو میں خود سنتا ہوں اور جو درود بھیجتا ہے مجھ پر دور سے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ یعنی بذریعہ ملائکہ اور میں خود براہ راست نہیں سنتا، ورنہ پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی جیسا کہ قبر کے پاس کے درود کے متعلق پہنچانے کا ذکر نہیں کیا!

اسی طرح ابن حجر مکی نے شرح ہمزبہ میں ذکر فرمایا ہے: اذ اصلہ وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ سماً حقیقیاً ویرد علیہ من غیر واسطۃ وان صلی وسلم علیہ من بعد لا یسمعہ الا بواسطۃ یدل علیہ احادیث کثیرة "یعنی جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو حقیقت میں سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اس کا بلا واسطہ، اور اگر کوئی دور سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو ہمیں سنتے مگر بواسطہ (یعنی فرشتے آپ تک پہنچاتے ہیں) بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

اس چیز کی شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح مشکوٰۃ میں یوں تصریح کی ہے: سخن دران ماند کہ این فضیلت رد سلام از آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص بنائراں قبر شریف اوست صلی اللہ علیہ وسلم مثل داخل در مجلس کہ سلام گوید یا عام است بر ہر کسے را کہ سلام فرستد چنانکہ در شہد و غیر آن، و ظاہر ہمین است الا آنکہ سلام زائراں بنفس شریف خود بے واسطہ سماع فرماید در و سلام نمایند و دیگران بواسطہ ملائکہ سیاحین بود

خوب سمجھ لو کہ یہ امر یعنی رد و بلوغ سلام وغیرہ روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے آیا ہے، باقی ہے اور انبیاء اگرچہ حیات و صلوات ان کی قبر میں مسلم ہے مگر تبلیغ سلام و رد جواب کی کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ المؤمن وقات

بیان بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ندائے بعید کو نبی ہو یا ولی کوئی نہیں سنتا اور ندائے قریب کا سنتا مخصوص ہے انبیاء کے لیے، کسی ولی یا غوث و قطب کو یہ نصیب نہیں!

لہ ان لله ملائکہ سیاحین فی الارض یبلغون عن امتی السلام (سفیان ثوری کی حدیث عبد اللہ بن مسعود سے رواہ النسائی و ابو عاتم فی صحیحہ)
 شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱۹ باب فضل الصلوة علی انبی صلی اللہ علیہ وسلم طبع کلکتہ ۱۲۵۳ھ

ہماری اس تصریح کے خلاف بعض کم عقل ضعیف احادیث کو پیش کرتے ہیں، اپنی ضعف عقلی اور کتاب و سنت سے عدم مزاوالت کی وجہ سے ان احادیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء ربانیے بعید کو بھی سن سکتے ہیں، نہ صرف سن سکتے ہیں بلکہ ہماری مدد بھی کر سکتے ہیں، لہذا ہمیں پکارنا چاہیے یا محمد، یا عوث، یا خواجہ، یا نقشبند، یا بدوی یا شاذلی ہماری مدد کرو۔ اس میں انہیں نہ اشراک فی العلم کا کوئی شائبہ نظر آتا ہے اور نہ اشراک فی التصرف کا! انا لله وانا الیہ راجعون!

ذرا ان کی پیش کردہ احادیث پر غور کرو "ابن سنی کتاب عمل الیوم واللیلہ میں دو روایتیں بیان کرتے ہیں۔ عبدالسد بن عمرؓ کے پیر میں چونٹیاں بھر گئی تھیں ان سے کسی نے کہا کہ آپ اپنے محبوب ترین شخص کو پکارے۔ انہوں نے یا محمد، پکارا اور کھڑے ہو کر چلنے لگے۔ یہی حال عبدالسد بن عمرو بن العاصؓ کا ہوا۔ انہوں نے یا محمد کاعزہ مارا اور ایسے ہو گئے جیسے پیر سے بندھی رسی کھل گئی ہو۔" یہ حدیث حسن حصین میں ان الفاظ میں ہے، فاذا خدمت رجلاً فلیذکوا حب الناس الیساں کو موقوفاً ابن سنی نے نقل کیا ہے اور ظفر جلیل میں تحت القائدہ یہ لکھا ہے کہ "یاد کے محبوب کو تاکہ حاصل ہو خوشی۔ پس کہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ سب سے زیادہ محبوب ہیں۔" علماء حق نے اس حدیث کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) یہ حدیث مرفوع نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا نقل ہو بلکہ موقوف ہے اور حدیث موقوف حجت نہیں خصوصاً جس وقت کہ صد آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے خلاف اور معارض ہو! چنانچہ علماء اصول نے تصریح کر دی ہے کہ قول الصحابی لیس مجتہد یعنی صحابی کا قول حجت نہیں۔ (۲) اس حدیث کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پیر کے سن ہو جانے کے وقت کسی محبوب کو یاد کرنا چاہیے، یاد کرنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور خون جوش میں آتا ہے اور نتیجہ کے طور پر "دور ہو جاتا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ ایک علاج طبی اور عمل نفسیاتی ہے اور ادویہ طبیہ و

لہذا اداس وجہ سے کہ ان کا علم فروغاً مذاہب پر منحصر ہے۔

اعمالِ نفسیاتی کو دین میں کیا دخل؟ اطباء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ صدر کا سبب اخلاطِ بلغمیہ و ریاضاتِ غلیظہ ہیں، خوشی و فرحت سے خون میں جوش ہوتا ہے اور ریاضِ تخلیل ہو جاتی ہیں۔ دوست کا یاد کرنا خوشی پیدا کرتا ہے خوشی خون میں تغیر پیدا کرتی ہے اور نتیجہ کے طور پر مرضِ رفع ہوتا ہے، اس سلسلہ علت و معلول کا تعلق نہ مذکے بعید کے سنانے سے نظر آتا ہے نہ اولیاء و انبیاء کی اعانت و مدد سے! مزید تحقیق سے مندرجہ ذیل امور قابلِ لحاظ نظر آتے ہیں:-

(۳) اس حدیث کی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم کسی نبی سے تو کیا صحابی سے بھی نہیں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی صحابی کے پیرن ہو گئے تو کسی نے کہا کہ تم اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا معلم کوئی مجہول شخص ہے اور تعلیم مجہول حجت نہیں۔ چنانچہ نووی نے اذکار میں جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں عن الہیثم بن جنش قال کنا عند عبد اللہ بن عمر فحدثت رجلاً فقال لہ رجل اذکوا حب الناس الیک فقال یا محمد صلی اللہ علیک وسلم فکنا نمشط من عقال یعنی ہم عبد اللہ بن عمر کے ہاں تھے، ان کا پیرن ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ یاد کرو احب الناس کو تو انہوں نے کہا کہ محمد رحمت کرے خدا آپ پر اور سلام نازل کرے۔ سو اسی وقت ان کا پیر کھل گیا جیسے اونٹ رسی سے کھل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس نسخہ کا تہلنے والا کون تھا۔

(۴) اس سلسلہ میں پیامِ نہایت ضروری ہے کہ ہم یاد کرنے کے صحیح معنی کا تعین کریں جنہو انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یاد کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے:-

۱۔ ایک وہ جس کا ثبوت شرعی میں ملتا ہے وہ یہ کہ آپ کے فضائلِ صحیحہ جو احادیث اور قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں ہم ان کا تذکرہ کریں جو مصائب اور آفات آپ نے ہماری ہدایت اور رہبری کی خاطر اٹھائی ہیں ان کو یاد کریں، آپ کے فضائلِ عمودہ، اخلاقِ حمیدہ، عاداتِ پسندیدہ کا چرچا کریں۔
ب۔ دوسرا طریقہ جو قطعاً خلافِ شرع ہے کہ آپ کو دور سے پکاریں، بنادیں، بددماغیوں استغاثہ کریں۔ یہ موہم شرک ہے اور قطعاً ناجائز، اس روایت سے تذکیر یا یاد کرنے کے معنی خلافِ شرع

مراد لینا مشرکانہ ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ موجد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد آپ پر درود بھیج کر کرتا ہے جو حق تعالیٰ کا تعلیم کردہ طریقہ ہے، آپ کی احادیث کا چرچا کرتا ہے جو نزولِ رحمت کا باعث ہے۔

(۵) دیکھو بعض روایتوں میں لفظاً یا مذکور ہی نہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ نہ ضروری نہیں اور تذکیر بغیر خدا کے ہی ہو سکتی ہے چنانچہ مجاہد کی روایت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ عن مجاہد فقال حدثت رجل رجل عند ابن عباس، فقال ابن عباس اذكوا حب الناس اليك فقال محمد صلی اللہ علیہ وسلم فذهب خذوا۔ یعنی مجاہد سے روایت ہے کہ ابن عباس کے پاس ایک شخص کا پیرسن ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کا خدر جاتا رہا۔ اور خطاب جو مقرون بصلوٰۃ مودہ شرعاً جائز بھی ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ درود کے پہنچانے کے لیے ملائکہ مقرر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ درود کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتی ہے۔ یا پھر شوق و محبت میں پکارا جاسکتا ہے اس میں آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ منضم نہیں ہوتا جو صریحاً شرک ہے۔

(۶) اخیر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آثار نہ قولی ہیں نہ فعلی کہ ان کی تعسیم کی جائے اور ان سے یہ ثابت کیا جائے کہ ہر تکلیف یا مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے، نیز یہ امر سلف سے ثابت بھی نہیں کہ مصیبت کے وقت ایسا کیا کرتے تھے! اور نہ یہ کسی مجتہد مسلم الاجتہاد کا کتاب ہے کہ مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے تاکہ مشکل حل ہو جائے آفت ٹل جائے اور مصیبت دور ہو جائے۔ اس کے برخلاف ہم نے اوپر قرآن کریم سے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ مصیبت کے وقت ہر نبی نے حق تعالیٰ ہی کو پکارا، ان ہی سے اعانت چاہی اور غیر اللہ کا اس سلسلہ میں خیال بھی نہ آئے دیا، باوازل بند کہا ہے

ایں بسکہ دلم جز تو ندارد کفایت تو خواہ بدہ کام دلم خواہ بدہ!

جن لوگوں کے قلوب میں غیر اللہ سے مدد مانگی ہو اور یہ ان کی طبیعتوں میں رچ گئی ہے وہ

لہ ہائی کا پہلا شعر ہے یا من ملکوت کل شیء بیوہ بہ طوبی لمن ارتضاک ذخراً لعدوہ۔

ایک دوسری حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں: "حسن حصین میں حضرت سے مروی ہے کہ آپ نے اس شخص کے متعلق جو راہ گم گشتہ ہو فرمایا کہ پکارے اعیوننی یا عباد اللہ۔" اے بندگانِ خدا تم میری مدد کرو" اس حدیث سے استناد کر کے کہا جاتا ہے کہ "ہم راہ گم گشتہ ہیں، ہم پکارتے ہیں: اعیوننی یا عباد اللہ! یا غوث! یا خواجہ! یا نقشبند! یا بدوی، یا شاذلی ہماری مدد کرو!"

حسن حصین کے الفاظ یہ ہیں: ان اراد عونا فلیقل یا عباد اللہ اعیوننی یا عباد اللہ اعیوننی یا عباد اللہ اعیوننی (ردہ طبرانی) اس حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اس پر علماءِ حق نے جو تنقید کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن حسان ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے اور زینبی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے!

(۲) اس کی سند منقطع بھی ہے، بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے اور منقطع کا حکم مثل مرسل ہے اور محدثین اور اہل اثر کی جماعت کے نزدیک یہ حجت نہیں!

(۳) اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عتبہ بن غزوآن ہے وہ مجہول الحال ہے یعنی اس کا تقویٰ اور عدل معلوم نہیں۔ چنانچہ تقریب ابن حجر میں اسی بنا پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب

اس حدیث کا ایک راوی ضعیف اور مجہول الحال ہو تو یہ نہ قابلِ اعتماد ہے اور نہ لائقِ استدلال!

(۴) جرح سے قطع نظر کر کے اگر ہم اس حدیث کو تسلیم بھی کر لیں تو ہم عقلِ سلیم کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اموات سے استعانت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ عباد اللہ سے مراد تو فرشتے ہیں جو حفاظت کے لیے معین و مقرر ہیں۔ چنانچہ فیض القدر شرح جامع لاصغیر میں اس کی یوں

توضیح کی گئی ہے: ان لله ملائکة فی الارض یسمون الحفظة یکتبون ما یقع فی الارض من درى الشجرة فاذا اصاب احدکم حرجة واحتاج الی عون بفلاة من الارض فلیقل

لہ ابن بزیۃ اور ابن مسعود کے درمیان - فیض القدر ج ۱ ص ۳۰۷ مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ

اعینونی عباد اللہ حکم اللہ فانان شاء اللہ یعان درہماہ ابن السنی والطبرانی من حدیث
الحسن بن عمر عن معروف ابن حسان عن سعید ابن ابی عریبہ عن ابی بربیدہ عن ابن
مسعود قال ابن حجر حدیث غریب و معروف قالوا منکر الحدیث وقد تضرعوا بہ و فیہ
انقطاع بین ابی بربیدہ و ابن مسعود یعنی اللہ کے کچھ فرشتے زمین میں مقرر ہیں جن کو حفظ اور
نگہبان کہتے ہیں، جو درخت کا پتہ زمین پر گرنا ہی اس کو لکھا کرتے ہیں تو جب ہم میں سے کسی کو
تکلیف پہنچے اور مدد کا محتاج ہو زمین کے کسی صاف میدان میں تو اس کو چاہیے کہ یوں
کہے کہ اے خدا کے بند و میری مدد کرو، اللہ تم پر رحم فرمائے، ایسے کہنے سے بیشک مدد حاصل ہوگی
دیکھو عباد اللہ سے مراد فرشتوں کا ہونا خود حدیث ہی سے ثابت ہے جو زندہ ہیں، اب
اہل استمداد کا اموات کو اپنی مدد کے لیے پکارنا ان کی مشرکانہ طبیعت کی ایجاد ہے، حدیث کے
اس کی اجازت کہاں نکلتی ہے ہم اوپر بتائے ہیں کہ قرآن کریم نے مخلوق سے استعانت ان
امور میں جائز رکھی ہے جو ان کی قوت و قدرت کے احاطہ میں ہوں، یہ استعانت بالمرئوبیت
یا عون ما بین العباد ہے جب کسی کا گھوڑا بھاگ جائے یا کوئی چیز کھو جائے تو اس معاملہ میں
ادنی لوگوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جس امر میں مخلوق سے استعانت کر سکتے ہیں اس میں
ملائکہ، ابدال اور جنوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ یہ زندہ مخلوق سے ان امور میں استعانت
کرنا ہے جو ان کے دائرہ قدرت میں شامل ہے۔ اب رہی وہ استعانت جو حق سے مخصوص ہے
استعانت بالمرئوبیت وہ کسی طرح اس حدیث سے ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ کسی ذی علم و
ذی ہوش نے اس کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ استعانت عن الاموات کا یہاں تو
شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

(۵) بفرص محال ہم مان لیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور اس سے بات بھی ہی
ثابت ہوتی ہے جو اہل استمداد سمجھتے ہیں! دعا و استعانت کے متعلق اوپر جو تصریحات پیش کی گئیں

لہ منکر الحدیث (میزان ذہبی)

ان کو پیش نظر رکھ کر یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ حدیث جو خبر واحد سے قرآن مبین کے معارض و مخالف ہے اور اسی وجہ سے رد کر دی جانی چاہیے کیونکہ قرآن مقدم ہے، اس کا تقدم اس کی قطعیت اس کے متواتر تنظیم ہونے اور اس کا سند کے محتاج نہ ہونے پر مبنی ہے۔

(۶) اس حدیث کے مخالف و معارض دوسری حدیث بھی اسی کتاب حسن حسین میں ملتی ہے جس کو طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے، اذا اضاع له شيئاً اوابق فليقل: اللهم دادا الضالته وهادي الضلالة انت هادي من الضلالة ارم د على ضالتي بقدرتك وسلطانك فانها من عطائك وفضلك. یعنی "جب آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا اس کا غلام بھاگ جائے تو یوں دھا کرے: "اے خدا جو پھیر لاتا ہے گم ہوئی چیز کو، اے بھولے بھٹکے کی راہ بتلانے والے تو ہی راہ بتلاتا ہے بھول اور گمراہی سے، واپس دلادے مجھ کو میری گم ہوئی چیز اپنی قدرت اور غلبہ سے کہ وہ چیز تیری بخشش اور احسان سے تھی!"

علاوہ بریں ابن عباسؓ سے جو حدیث مروی ہے اور جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس میں صاف طور پر حکم دیا ہے فاذا استعنت فاستعن بالله یہ معارض و مخالف ہے حدیث اعیونونی کے اور ظاہر ہے کہ حدیث ابن عباسؓ موافق ہے فحوائے کلام مجید کے لہذا اس کو دوسری حدیث پر ترجیح ہونی چاہیے۔

کیا غضب ہے یہ اموات کے پرستار زندہ خدا کو چھوڑ کر مردوں سے استعانت کرتے نہیں شرک تے اور اپنی بے شرمی کو رفع کرنے کے لیے کتاب و سنت سے دلائل تلاش کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں! لیکن کتاب و سنت سے تو بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مالکم من دون اللہ من دلی ولا نصیر (بقرہ ۱۰۷) دیکھو حضرت جامیؒ نے اسی بات کو کس خوبی سے ادا کر دیا ہے:-

حق فاعل و ہرچہ جز حق آلات بود تاثیر زالت از محالات بود
ہستی کہ موثر حقیقی است بکیت باقی ہمہ اولام و خیالات بود

نما اور استعانت کی تائید میں اہل استدعا ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں، سوال خود پیش

کر کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ "یا رسول اللہ! یا غوث! پکارنا بھی کیا ناجائز نہیں؟ شرک نہیں؟ ترمذی، نسائی، طبرانی، ابن خزمیہ، حاکم، بیہقی نے یہ دعا روایت کی ہے: اللھم انی اسئلك واتوجه الیک بمحبیبك المصطفیٰ عندك یا حبیبنا یا محمد انا نتوسل بک الی ربك فاشفع لنا عند المولیٰ العظیم یا نعم الرسول الطاهر۔ اللھم شفعبینا بجاہ عندك۔ اس دعا میں یا محمد کی ندا ہے اور حضرت عثمان کے زمانہ میں بھی اس دعا کو صحابہؓ نے خود پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔ تو سوال کا جواب یہ ہوا کہ یا رسول! یا غوث! پکارنا شرک نہیں جائز ہے اور ادھر بھی دو حدیثوں سے استدلال کر کے اہل استدلال نے اپنی دانست میں ثابت کر دیا ہے کہ یا غوث! یا بدوی، یا شاذلی، یا نقشبند پکارنا جائز ہے۔

اس حدیث کی تحقیق یہ ہے :-

(۱) مروی ہے ایک اندھے نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ میرے لیے حق تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مجھے اس مرض سے شفا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور چاہے تو نابینا ہی پر صبر کر کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میرے لیے دعا ہی کیجیے۔ آپ نے خود دعا نہیں فرمائی بلکہ حکم دیا کہ وضو کرے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دعا پڑھے :- اللھم انی اسئلك واتوجه الیک بنبیک نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بک الی ربی فی حاجتی هذا لتقضى لی فشفعبنی (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کی) اس نے یہ دعا پڑھی اور بینا ہو گیا۔ (کذا فی مشکوٰۃ)

(۲) یہ حدیث اعتقاد کے بارے میں قابل استدلال نہیں کیونکہ اس کا ایک راوی عثمان بن خالد متروک الحدیث ہے۔ فقہاء و محدثین کے نزدیک ایسے راوی کی نقل قابل حجت نہیں۔ چنانچہ نووی کی تقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی میں یہ مسئلہ مصرح ہے۔

لہ یا اللہ میں تم سے مانگتا ہوں اپنی حاجت اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں بذریعہ تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ نبی رحمت ہیں۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں متوجہ ہوتا ہوں اپنے پروردگار کی طرف آپ کے ذریعے سے اپنی اس حاجت میں کہ میرے حق میں حاجت روائی کی جائے۔ الہی تو ان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔

(۳) اگر ہم اس حدیث کو بفرض مجال قابل استدلال بھی مان لیں تو اس سے محض توسل ثابت ہوتا ہے نہ یہ کہ جب کوئی اس نذا اور خطاب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہے تو آپ اس کی آواز سنتے ہیں جیسا کہ اہل استدلال ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ توسل میں کیا ہوتا ہے؟ متوسل کرتا کیا ہے؟ وہ طلبِ حاجت کرتا ہے اسی ذات سے جو عطا و منع میں مستقل و منفرد ہے جو صاحبِ امر و نبی ہے، جس کے ہاتھ میں ہر شے کا "ملکوت" ہے اور طلب سے پہلے ایک سببِ اجابت کو آگے کر دیتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں قصہ ان تین آدمیوں کا آیا ہے جو ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے سب سے اچھے عمل کے ساتھ توسل کیا اور وہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اگر یہ توسل باعمالِ فاضلہ جائز نہ ہوتا یا شرک ہوتا تو حق تعالیٰ ان کی دعا کو قبول فرماتے نہ حضور انورؐ اس حکایت کے بعد سکوت فرماتے۔

لیکن اگر متوسل یہ سمجھے کہ انبیاء یا ملائکہ ایسا واسطہ اور وسیلہ ہیں کہ جن کو پکارنا اور ان پر بھروسہ کرنا ضروری ہے اور طلبِ نفع اور دفعِ ضرر کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کی تعظیم بجالانا چاہیے تو یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کے رد میں بہت ساری آیتیں نازل فرمائیں۔ کفار و مشرکین مکہ نے اللہ کے سوا اوروں کو اپنا شفیع اور حمایتی قرار دے رکھا تھا، نفع حاصل کرنے اور ضرر دفع کرنے کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، مشرکین یہود و نصاریٰ، مسیح اور عزیز اور ملائکہ کو پکارتے تھے، استغاثہ کرتے تھے حق تعالیٰ نے ان کے متعلق صاف طور پر حجت فرمادی کہ **فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضَّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا**۔

دیکھو بادشاہ اور رعایا کے درمیان عرض معروضہ کے لیے چوبدار عرض بیگی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے کانوں تک رہا یا کا درد دکھ پہنچاتے ہیں، اگر کوئی انبیاء و اولیاء کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی جناب میں خلق کی حاجتوں کو پہنچاتے ہیں، ان کے درد دکھ کو سنا لیتے ہیں اور حق تعالیٰ اخلق کی جو حاجت روانی کرتے ہیں، ان کو رزق دیتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں تو ان ہی کے واسطے سے لہذا خلق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ہی سے حاجت طلب

کریں اور وہ حق تعالیٰ سے عرض کریں جیسے کہ عرض بیگی بادشاہوں سے کرتے ہیں۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا با تفاق اہل اسلام کافر و مشرک ہے۔ بعینہ ہی دین مشرکین کا ہر جوت پرست ہیں، وہ اپنے بتوں کو انبیاء و صالحین ہی کی صورتوں پر بناتے تھے اور ان کو اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دیتے تھے جو ان کو حق تعالیٰ سے قریب کر سکتے تھے۔ (مکالمہ ص ۱۵۷ و ۱۵۸) اور یہی وہ مشرک ہے جس کی وجہ سے نصاریٰ معتوب ہوئے۔ ان کے متعلق قرآن میں لے صحت کی ہے۔ اِتَّخَذُوا الْحَبَارَہُمْ وَرُہْبَانَهُمْ اَدْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَآٰمِرًا اِلَّا یُعْبَدُ اِلٰہًا وَّاحِدًا اِلَّا ہُوَ سُبْحٰنَ عَمَّا یُشْرکُوْنَ (پہلے ۱۱) غرض حق تعالیٰ نے اس توحید کو قرآن کریم میں جا بجا بیان فرمایا ہے اور شرک کو نفع و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا ہے اور اس کی اہل صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کرے اور نہ کسی سے اُمید رکھے اور نہ کسی کو ان کے سوا اپنے کاموں میں کافی جانے ۵

موجد کہ در پائے ریزی زرش دگر آرا گامی سنی بر سرش

اُمید و ہراسش نہ باشد ز کس ہمیں است بنیاد توحید و بس

ذرا اس واسطہ یا وسیلہ کے مسئلہ پر عقلی پہلو سے بھی غور کر لو، عالم خارجی کی بادشاہت پر نظر ڈالو، یہاں بادشاہ اور رعایا کے درمیان وسائل و سائنطین ہی کے ہوتے ہیں (۱) چونکہ خود بادشاہ اپنی تمام رعایا کے احوال کی خبر نہیں رکھ سکتا اس کو ایسے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو رعایا کے حال کی خبر دیتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی واسطہ خدا اور بندوں کے درمیان فرض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حق تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ زمین و آسمان کا کوئی ذرہ ان کے علم محیط سے باہر نہیں، وہ سمیع و بصیر و علیم ہیں اور بجز ان کے ہر شے سے

لہ من جعل بینہ و بین اللہ وسائل یتوکل علیہم و یدعوہم کفر اجماعاً لان ذلک کفعل عابدی الاھنام قائلین ما نعبدہم الا لیقر بونا الی اللہ ذلنی۔ (انعام اور اس کی شرح رکوع) لہ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو رب بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو صرف یہ علم کیا گیا ہے کہ فقط ایک مہبود کی عبادت کیا کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

(۲) چونکہ بادشاہ اکیلا سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا اور نہ ہی تنہا اپنے دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، لہذا اس کو اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حق تعالیٰ کو نہ کسی ناصرو مددگار کی ضرورت ہے اور نہ کسی معین، ظہیر کی، وہ کائنات کے تمام اسباب و آلات کے خالق، رب، مالک ہیں، ان کی ذات تمام اشیاء سے غنی و بے نیاز ہے، سارا عالم ان کا فقیر و محتاج ہے، مملوک و مرہوب ہے۔

(۳) چونکہ بادشاہ اپنی رعایا کی نفع رسانی اور خبر گیری میں سستی اور غفلت کر سکتا ہے، لہذا اس کو کسی ایسے محکم کی ضرورت ہے جو اس کو اپنے فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرے لیکن اس قسم کے کسی محکم کی حق تعالیٰ کو ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود خلق پر ماں باپ سے زیادہ رحیم ہیں۔

عقائد کے ان بدہیئات کو ماننے کے بعد اگر کوئی یہ خیال کرے کہ حق تعالیٰ اور ان کے بندوں کے درمیان ان وسائط کی ضرورت ہے جو سلاطین اور رعایا کے درمیان ضروری ہیں اور وہ وسائط انبیاء اولیاء ملائک یا اور موجودات ہیں تو وہ کھلا بت پرست ہے جو اپنے اصنام اور اولیاء کو حق تعالیٰ کے دربار میں شفیع، وکیل، حمایتی، مقرب سمجھتا ہے اور اسی خاطر ان کی عبادت کرتا ہے! وہ خالق اکبر کو مخلوقِ اتر کے مشابہ سمجھتا ہے جو بغیر اپنے اعوان و انصار کے، بغیر اپنے معین و ظہیر کے کائنات کا انتظام ہی نہیں کر سکتا۔ فَلَا تَقْرَبُوا اللَّهَ بِالْأَمْثَالِ، تعالیٰ اللہ عن ذلک علواً کبیراً۔

شفاعت اسی سلسلہ میں شفاعت کا صحیح طور پر علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ شفاعت کے معنی ہیں سفارش، دنیا میں سفارش یا شفاعت کئی قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) شفاعت و جاہت: بادشاہ کے دربار کا ایک امیر، بادشاہ کے پاس ایک چور کی سفارش کرنا ہے جس کی چوری ثابت ہے، بادشاہ سزا دینا چاہتا ہے لیکن اس امیر کی سفارش سے دب کر اس چور کی تقصیر کو معاف کر دیتا ہے تاکہ امیر کی ناخوشی کی وجہ سے امور سلطنت میں خلل نہ پڑے۔

لہ ان امرد کی مزید توجیہ کے لیے دیکھو ابن تیمیہ کا رسالہ قاعدہ واسطیہ جو توسل پر ایک بے نظیر رسالہ ہے جس سے ہم نے یہاں استفادہ کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص کسی فرشتے یا نبی یا ولی کو حق تعالیٰ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھتا ہے وہ سخت جاہل اور کھلا مشرک ہے۔

(۲) شفاعتِ محبت :- اس چور کی سفارش بادشاہ کا کوئی معشوق یا منظور نظر کرتا ہے اور بادشاہ اس کی محبت سے ناچار ہو کر چور کو معاف کر دیتا ہے اور اپنا عقوبت پی جاتا ہے۔
ظاہر ہے کہ اس قسم کی بھی شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تصور نہیں کی جاسکتی۔ بندہ اپنی عبودیت کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا!

(۳) شفاعتِ بالاذن :- اس چور کی سفارش بادشاہ کی مرضی پا کر، اس کی اجازت سے کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ سفارش کرنے والا اس کا قرابتی ہو یا آشنا یا حمایتی۔ بس یہی ایک شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ممکن ہے۔ اسی کا ذکر قرآن کریم واحادیث نبوی میں آیا ہے۔ شفاعت بالاذن کے متعلق مندرجہ ذیل چند امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) شفاعت نہ ہوگی مگر حق تعالیٰ کے اذن سے! ان آیات سے اس کی توضیح ہوتی ہے :-

۱۔ یَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۚ (۱۰۵) اس روز سفارش نفع نہ دیگی مگر اس شخص کے لیے جس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اجازت دیدی ہو اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کر لیا ہو!

ب۔ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (پس ۲) ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے۔

ج۔ لَا تَعْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُرْضَى (پس ۷) یعنی ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہیں اجازت دیدیں اور راضی ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ شفاعت حق تعالیٰ کے حکم و اجازت سے ہوگی نہ شفیع کی مختاری خود رائی سے کہ اپنے جس دوست کے حق میں چاہا بغیر رضی حق کے معلوم کرنے اور بدون اجازت سفارش کر دی۔

کفار و مشرکین ہی سمجھتے تھے کہ ان کے معبودان کی سفارش کریں گے اور عذاب سے بچالینگے اس سفارش کو حق تعالیٰ باطل کر رہے ہیں اور جس سفارش کو ثابت کر رہے ہیں وہ اس بندہ محکوم کی شفاعت ہے جو اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے بدون اس کی اجازت و امر کے پیش قدمی نہیں کرتا پہلی قسم کی شفاعت "شریک" کی شفاعت ہے اور حق تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، دوسری قسم کی شفاعت بندہ محکوم کی ہے وشتان بین ذلک! جب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے اسی کے واسطے سفارش کا حکم دیں گے تو یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ واقع میں سفارش حق تعالیٰ ہی کی ہوتی اور جو شخص ان کے سامنے سفارش کرے گا وہ ان کے امر و اجازت سے کرے گا۔ ابن قیم کے الفاظ میں "وہ ذات پاک خود اپنے نفس سے سفارش کریگی یعنی اپنے آپ ہی بندہ پر رحم کرنا منظور ہوگا۔ یہی معنی ہیں قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا کے اور نیز اس آیت کے قَالَهُمْ مِنْ دُونِ رَبِّیْ وَلَا شَفِيعٌ عِنْدَ اللّٰهِ سِوَا الَّذِیْ هُوَ دَلِیْلٌ اَوْ رَحْمَةٌ لِّمَنْ یَّشَآءُ لَیْسَ لِمَنْ یَّشَآءُ عِنْدَ اللّٰهِ حَسْبٌ اَوْ اٰیٰتٍ لِّمَنْ یَّشَآءُ لَیْسَ لِمَنْ یَّشَآءُ عِنْدَ اللّٰهِ حَسْبٌ اس کی مثال ایک مگڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا جو سب سے زیادہ بودا اور کمزور ہے! تھوڑی دیر کے لیے اس آیت پر غور کرو، شرک فی التصرف اور شفاعت کو کس خوبی سے رد کیا جا رہا ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَیْمَلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ
وَمَا لَهُمْ فِیْهَا مِنْ شِرْکٍ وَّمَا لَهُمْ مِنْ ظٰلِمٍ وَّلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَ الَّذِیْ اِذِنَ لَکَ۔ یعنی
آپ غم لے لیں کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، نہ آسمانوں
میں اور نہ زمینوں میں اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا
مددگار ہے اور خدا کے سامنے سفارش کسی کی کام نہیں آتی مگر اس کے لیے جس کی نسبت وہ اجازت
دیںے (پ ۹۷) مشرک نے جس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے اس سے وہ لفع کی امید کرتا ہے اور لفع
اسی سے پہنچ سکتا ہے جس میں ان چار صفات میں سے کم از کم ایک صفت ہوتی ہے
۱۔ یا تو وہ اس شے کا مالک ہے جس کی امید یہ عابد کر رہا ہے اور جس کے لیے وہ دعا کر رہا ہے۔
۲۔ اگر مالک نہ ہو تو مالک کا "شریک" ہو۔

۳۔ اگر شریک بھی نہ ہو تو کم از کم اس کا معین و ظہیر یعنی مددگار ہو۔

۴۔ اگر معین و ظہیر بھی نہ ہو مالک کے نزدیک شفیع ہو۔ (ابن قیم)

ان ہی چار صورتوں میں عابد کو اپنے معبود سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اب حق تعالیٰ ان چاروں کی ترتیب وار نفی فرما رہے ہیں، اعلیٰ صفت سے شروع کر کے ادنیٰ صفت کی طرف رجوع فرما رہے ہیں، ملک و شہرت و مظاہرت (مددگاری) و شفاعت کی کلی نفی فرما رہے ہیں اور اس شفاعت کا اثبات کیا جا رہا ہے جس سے مشرک کو کوئی فائدہ نہیں اور یہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے اذن سے ہوگی۔ یہ آیت ایک نور ہے، برہان ہے۔ اس سے توحید کا قطعی اثبات ہوتا ہے اور شرک کی ساری جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

(۲) اذن نہ ہوگا مگر اس شخص کے لیے جس کے قول و فعل کو حق تعالیٰ پسند فرمائینگے۔

حق تعالیٰ شفاعت کا حکم اسی شخص کی نسبت عطا فرمائینگے جو قول و فعل کے لحاظ سے ان کا پسندیدہ ہوگا۔ لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ (پ ۲۶) یعنی جن کو شفاعت کا اذن دیا گیا ہے وہ بجز اس کے جس کے لیے خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے۔

(۳) کسی کا قول و عمل پسند نہ ہوگا مگر توحید و اتباع رسول۔

ابو العالیہ فرماتے ہیں کَلْتَانِ يَسْتَلِ عَنْهُمَا الْاُولُوْنَ وَالْاٰخِرُونَ، مَا ذَا كُنْتُمْ تَعْبُدْنَ وَاِذَا اجبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ۔ یعنی دو باتوں کا تمام اولین و آخرین سے سوال کیا جائیگا، تم کس کی عبادت کرتے تھے اور تم نے رسولوں کی کن کن باتوں پر عمل کیا؟ حدیث ابو ہریرہ میں آیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ من اسعد الناس بشئ اعدك يا رسول الله۔ آپ نے فرمایا من قال لا اله الا الله خالصا من قلبه اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت اہل اخلاص کے لیے ہوگی جنہوں نے کوئی شرک نہیں کیا۔ بخاری نے ابو ہریرہ سے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ شفاعتی لمن قال لا اله الا الله مخلصا يصدق قلبه لسانه ولسانه قلبه۔ اس کو امام احمد نے صحیح کہا ہے۔ مسلم نے جو روایت ابو ہریرہ سے کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

انی لختبات دعوتی شفاعت لامتی یوم القیامتہ فیہی نائلۃ ان شاء اللہ، من مات لا یشرک باللہ شیئاً۔

شفاعت کے متعلق ان تین اصول کو سمجھ جانے کے بعد شرک کا استیصال ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جس نے یہ سمجھ لیا کہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے حکم و اجازت سے ہوگی اور اسی کے لیے ہوگی جس کے قول و فعل کو وہ پسند کرتے ہوں گے اور وہی قول و فعل ان کو پسند ہوگا جو شرک و بدعت سے مبرا اور توحید و سنت کے مطابق ہو تو اب وہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا شفیع کیسے ٹھہرا سکتا ہے اور مشرکین کی طرح ھُوَلَاءِ شُفَعَاءُ وَنَا عِنْدَ اللَّهِ كَاكِبٌ قَائِلٌ مَّوَسُّوْا سُبْحٰنَ رَبِّکُمْ اِنَّہُمْ لَمِنَ السَّٰغِیۃِ اور مشرکین کی طرح اپنے قلب کو رجوع کر سکتا ہے، وہ جانتا ہے کہ انھیں ترین مخلوقات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہونگے، اپنے رب، اپنے مولیٰ و مالک کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہونگے لیکن سجدہ سے سر نہ اٹھائینگے اور شفاعت کے لیے اس وقت تک زبان نہ کھولینگے جب تک کہ حق تعالیٰ کی اجازت نہ ہوگی کہ "قل تسمع و اشفع تشفع و سل تعطہ۔ پھر آپ نے تصریح فرمادی کہ فیحدلی حدًا، کہ میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی یعنی آپ شفاعت ان ہی کی فرمائینگے جن کا قول و فعل حق تعالیٰ کو پسند ہوگا، یعنی جو شرک نہ ہوگا، جس نے صدق دل سے توحید الوہیت کا اقرار کیا ہوگا! اسی کی شفاعت کا اذن ہوگا اور اس کی شفاعت کی جائیگی اور اسی پر حق تعالیٰ رحم کرنا منظور فرمائینگے!! اسی کی بالآخر نجات ہوگی! جب اذن شفاعت دینے والے حق تعالیٰ ہی ہیں، اور قبول کرنے والے بھی وہی ہیں، مشغوع کہ کو ایسے کاموں کی توفیق دینے والے بھی وہی ہیں جس کی وجہ سے وہ مستحق شفاعت ٹھہرتا ہے تو پھر صاف ظاہر ہے کہ شفاعت درحقیقت حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے! قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا کے یہی معنی ہیں! یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے اپنے اللہ ہی کو معبود ٹھہرایا، اسی کے لیے اذن شفاعت ہوگا، اور جس نے غیر اللہ کو معبود ٹھہرایا اس کی نہ کوئی شفاعت کریگا اور نہ کوئی شفاعت اس کے.....

لہ متفق علیہ کہہ سنا جائیگا۔ شفاعت کو قبول کی جائیگی۔ انک دیا جائیگا۔

یہ مفید ہوگی۔ ان ہی متخذین شفعار کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: قُلْ اسْتَشِيرُونَ اللَّهَ بِمَالٍ يُعَلِّمُ فِي السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ مَا تَشَاءُونَ عَمَّا يُشْرِكُونَ۔ یعنی کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا کو معلوم نہیں
نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے (پارہ ۷) اس طرح ان
کے افترا و شرک کو ظاہر فرما دیا!

نذر لغیر اللہ | مشرکین کی عبادت کا ایک اور عمل جس پر پہلے مقالہ کے آخر میں بحث کرنی باقی ہے
وہ "نذر لغیر اللہ" ہے مشرکین اپنے مال کا ایک حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان کے
لیے جانور ذبح کرتے تھے، اس طرح ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے: وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِن تَأْذُرٍ آمِنٍ الْحَرَكَةُ
وَالْإِنْعَامُ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا (پارہ ۷) اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی
پیدا کیے ہیں، ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا
ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا ایک اور جگہ لڑنا ہوتا ہے:

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا يٰۤاَۤلِۤہٗۤاِۤرَہٗۤمِۤہٗۤا لَیۤسَ لَہُمۡ شَیۤءٌ مِّنۡ شَیۤءٍ مَّا کَفَرُوا۟
مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا
کَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا وَکَفَرُوا۟ مِنۡہٗۤا
ان افترا پر دازیوں کی ضرورت بازر پرس ہوگی۔

حضرت شاہ عبدالقادر ان آیات کی تفسیر میں صراحت فرماتے ہیں کہ "کافر اپنی کھیتی اور
مویشی کے بچوں میں اور تجارت میں سے اللہ کی نیاز کھلتے اور بتوں کی بھی نیاز کھلتے تھے جنہیں
وہ اپنی جہالت اور بے خبری سے معبود، یا مالکِ نفع و ضرر سمجھتے تھے حق تعالیٰ ان کے اس ظلم
اور بے انصافی اور افترا پر دازی کی مذمت فرما رہے ہیں۔

نذر و نیاز کا رواج اسلام کی "غربت" کے اس زمانہ میں اس کثرت سے ہو گیا ہے کہ ہمیں یہاں
اس کی تحقیق ضروری نظر آتی ہے۔ ہر دماغ کے مشرکین کے قلوب میں ایک نمایاں تشابہ ہوتا ہے، وہ وہی
بات کہتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزرنے والے مشرکین نے کسی بھی اور اس پر عمل
کیا تھا۔ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ مِنَ الَّذِیۡنَ مِثْلُہُم مِّثْلُہُمۡ تَشَابَہَتْ قُلُوۡبُہُمۡ (پارہ ۱۳)

نذر (نیاز) لغت میں وعدہ کرنا ہے نیکی کا ہویا بدی کا اور شرع میں کسی عبادت کا لازم کر لینا ہے جو لازم نہیں تھی۔ نذرات نذرًا اذا اوجبت علی نفسك شيئًا تبرعًا من عبادة او صدقة او غیر ذلک، (ہنایہ) تمام فقہار نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نذر اللہ کی قربت اور عبادت ہے۔ چنانچہ قاضی حسین اور متولی اور رافعی، اور سوان کے دوسرے علماء شافعیہ اور زین الدین بن نجیم اور علامہ قاسم وغیرہ علماء حنفیہ نے اپنی تصانیف میں اسی کی صراحت کی ہے اور

وَمَا تَفْقَهُمْ مِنْ نَفَقَةٍ اَوْ نَذْرٍ مِّنْ نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ (پتہ ۵) مانتے ہو تو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے۔

سے بھی یہی بات نثر شرع ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابوالمسعود میں وضاحت کی گئی ہے کہ اوند نذرتم، النذر عقد الضمیر علی شیء والتزام یعنی نذر دل میں کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کو لازم کر لینا ہے۔

جب نذر عبادت ہوئی تو غیر اللہ کے لیے اس عبادت کا بجالانا شرعاً صریح منکر ہے۔ عوام الناس بزرگوں کی جو نذر و نیاز کرتے ہیں وہ حاجت برآری کے خیال ہی سے کرتے ہیں یا تو کسی مقصد کا حصول پیش نظر ہوتا ہے یا پھر کسی بلا کا ٹالنا، گویا اس طرح وہ ان بزرگوں کو رشوت دینا چاہتے ہیں، اس خیال سے تو حق تعالیٰ کی نذر بھی روا نہیں کہ وہ ذات مقدس بھی اخذ رشوت سے پاک ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا تنذروا فان النذر لا یعنی من القدر شيئًا وانما يستخرج به من الخيل (متفق علیہ) یعنی نذر نہ مانو اس لیے کہ نذر تقدیر کے نوشتے کو نہیں مٹا سکتی، اس کے ذریعہ تو فقط بخیل کا مال نکالا جاتا ہے۔ طبی نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کر دی ہے کہ "جس نذر سے روکا گیا ہے وہ نذر مقید ہے جس کا مٹنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تقدیر کے لکھے سے بچا لیتی ہے، جیسا کہ بہت لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور ہم اپنے زمانہ کی کتنی جماعتوں کو اسی اعتقاد پر پالتے ہیں۔"

غرض عوام جو بزرگوں کی نذر کرتے ہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ تمہاری اس نذر کا مقصد کیا ہے؟

۱۔ تقرب اور عبادت؟ یہ تو صرف شکر ہے۔

۲۔ مقصود یابی اور حاجت براری؟ یہ بھی شکر و حرمت دونوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ ایصالِ ثواب؟ ہاں یہ جائز ہے، لیکن یہاں نیت کی تصحیح سخت ضروری ہے، غور کرو،

تمہیں خود اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیے، خود ثواب کمانے پر مائل ہونا چاہیے اس کو چھوڑ کر تمہیں

دوسروں کو ثواب پہنچانے کی فکر زیادہ دامن گیر معلوم ہوتی ہے اور پھر تمہارے آباؤ اجداد اس امر کے

زیادہ مستحق ہیں کہ تم انہیں ثواب پہنچاؤ، اس کا تم کو زیادہ خیال نہیں ہوتا، پیروں اور شہیدوں

کی نیاز اور فاتحہ التزام کے ساتھ کرتے ہو، ذرا اپنے قلب کی طرف ابھان کی روشنی میں دیکھو، کیا

تمہاری غرض یہ تو نہیں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال میں برکت ہوگی، بال بچے تندرست اور

عافیت سے رہینگے، تجارت میں خسارہ نہ ہوگا، زمانہ کے لکڑکوب سے نجات ملیگی یا اگر تم اس غرض

سے نذر و نیاز بزرگوں کی کیا کرتے ہو (مثلاً حضرت پیر کی گیارہویں یا کندوری دسترخوان یا سرنی)

تو مشرک کی طرح تم ان بزرگوں کو اپنا محبوب و بنارہے ہو، ان کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ رہے ہو، اور یہ

کھلا شکر ہے! اس کی تصریح قرآن و حدیث سے اوپر تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ علامہ قاسم شارح

درر کے اس بیان پر غور کرو۔

النذر الذی ینذرہ اکثر العوام کان یقول یا سیدی فلان یعنی برولیتا اوتبیا ان رد غائبی

او عوفی وریضی او قضیت حاجتی فلك من الذهب او الفضة او الطعام والشراب او الزيت کذا

فہذا باطل بالاجماع لان نذر مخلوق وھو لا یجوز لان النذر عبادة والعبادة لا یكون لمخلوق

وللمنذر ولمیت والمیت لا یملك وانسان ظن ان المیت ینصرف فی الامر کفر الا ان قال: یا اللہ

انی نذرت لك ان فعلت معی کذا ان اطعم الفقراء الذین بیاب السدہ النفیة او الاحمام

الشافعی ونحوہ فیجوز حیث یکون فیہ ففعا للفقراء والنذر لله۔

یعنی وہ نذر جو عوام الناس کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ اے میرے بزرگ کسی ولی یا نبی کو مخاطب

کر کے، اگر میرا غائب واپس آجائے یا بیمار اچھا ہو جائے، یا میری حاجت برائے تو آپ کے لیے اتنا سونا

یا چاندی یا طعام و شربت یا تیل بطور نذر پیش کرونگا۔ سو یہ باطل ہے بالاجملع، اس لیے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور یہ جائز نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کی رہا نہیں، جس کے لیے نذر مانی ہے وہ میت ہے اور میت کسی چیز کا مالک نہیں، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نذر ماتے والا یہ بھی خیال کرے کہ میت کو کاموں میں اختیار حاصل ہے تو وہ کافر ہو جائے۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ "یا اللہ میں نے تیری نذر کی کہ اگر تو میرے ساتھ یہ معاملہ کرے تو میں سدہ نقیبہ والے فقیروں کو کھانا کھلاؤنگا، یا امام شافعیؒ کے دروازے والوں کو کھانا دوںگا" تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں نفع ہے فقیروں کا اور نذر ہے اللہ عزوجل کی۔"

دیکھو اس بیان کا تجزیہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور واضح طور پر پیش ہو جاتے ہیں۔

۱۔ عوام کا لانعام جو نذر اپنے پیروں بزرگوں کی حاجت براری کی خاطر کرتے ہیں وہ بالاجملع باطل ہے اور قطعاً شرک ہے، کیونکہ

۲۔ مخلوق کی نذر کسی معنی میں جائز نہیں اس لیے کہ وہ عبادت ہے اور سوائے خالق کے کسی کے

لیے روا نہیں۔

۳۔ عوام کی غرض بزرگوں کی نذر و نیاز سے یہی ہوتی ہے کہ آفات و بلیات سے وہ محفوظ رہیں، مال و دولت میں اضافہ ہو، صحت و عافیت حاصل ہو، اگر وہ زبان سے اس امر کا اقرار بھی کریں کہ ہمیں صرف ایصالِ ثواب ہی منظور ہے تو بھی وہ اپنے نفس کو دھوکہ دے رہے ہیں، انہیں ایمان داری کے ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

۴۔ یہ بھی کہنا درست نہیں کہ یہ فلاں ولی یا نبی کی نذر ہے بلکہ انہیں یہ کہنا چاہیے کہ یہ

اللہ کی ہے اور ثواب اس کا فلاں کو پہنچے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی نبی یا ولی کی نذر مانی بھی جائے تو وہ منقطع

نہیں ہوتی کیونکہ لاوقاء لنذر فی معصیۃ یعنی نذر معصیت کی وفا ضروری نہیں۔ اور ظاہر ہے

۱۔ یہ حدیث مسلم بن عمران بن حصین سے مروی عامرونی ہے۔

کہ عبادت غیر اللہ معصیت ہے اور نذر منجملہ عبادات ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ ومن نذر ان یعصیہ فلا یعصیہ جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر کی اس کو چاہیے کہ اطاعت کرے اپنی نذر پوری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر کرے وہ نافرمانی نہ کرے۔"

توحید الوہیت کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ دعوتی کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی رو سے اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے قرار پاتے ہیں، اللہ کے معنی ہیں مجبوت رب، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے معبود ہیں اور ہمارے رب، اللہ تعالیٰ کے سوا ہمارا نہ کوئی معبود اور نہ کوئی رب یا مستعان۔ توحید الوہیت میں یہی "توحید معبودیت" و "توحید ربوبیت" شامل و داخل ہیں۔ شرک واقع ہوتا ہے عبادت و استعانت ہی کی راہ سے، یعنی اگر غیر اللہ کی عبادت کی جائے، یا اس سے استعانت کی جائے تو شرک پیدا ہوتا ہے۔ دیکھو قول "انما هو الہ واحد و انبی بری مما تشرکون" (پ ۸۶) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شرک الوہیت ہی کی راہ سے پیدا ہوتا ہے، عباد اللہ و لا تشرکوا بہ شیئا سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے اور قل انما ادعوا ربی و لا اشرك بہ احدا سے واضح ہوتا ہے۔ غیر اللہ کو پکارنا (دعا و نداء) شرک ہے، ایاک نعبد و ایاک نستعین کی تعلیم دے کر عبادت و استعانت کو بطریق حصر حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور اس طرح توحید الوہیت کی کامل حفاظت کر دی گئی۔

توحید الوہیت کے اس معنی کو پیش نظر رکھ کر مشرکین عرب کی عبادت پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اپنے صنم و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و ضعیف جان کر ان سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے اور اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے۔ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں بتلایا گیا کہ استغاثہ استعانت، دعا و نداء نذر و نیاہ از سب افعال عبادت ہیں۔ لہذا ان افعال کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی سے ہونا چاہیے۔ مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے رکھا تھا اسی لیے انہیں تہدید کی گئی کہ "فلا تجعلوا لله اندادا وانتم تعلمون" پس ان کا شرک بھی

غیر اللہ کی عبادت اور اس سے استعانت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ حق تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ ان کی ذات ہی میں کسی غیر کو شریک کہتے تھے۔

غیر اللہ کی عبادت ہی شرکِ محض اور کفرِ بحت ہی، یہ شرکِ اکبر انسان کے خون و مال کو حلال کر دیتا ہے اور اس کو "فخذ فی النار" بنا دیتا ہے، جب کسی کے کانوں تک توحید کی دعوت پہنچ چکی اور اس پر حجت کا قیام ہو گیا اور اس کے باوجود وہ شرک پر جابر رہا اور کفر کا اعلان کرتا رہا تو وہ کافر مشرک ہو گیا، اب اس کی نجات کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کرے اور توحید پر ایمان لائے اور اگر نام کا مسلمان ہے تو تجدیدِ اسلام کرے۔

احادیثِ نبویہ میں کلمہ توحید کے چند قیود و شرائط بیان کیے گئے ہیں، مثلاً کسی قسم کا شبہ الوہیتِ الہی میں نہ کرے، متکبر نہ بنے، جائز نہ ہو، یہ کلمہ اس کو گناہوں سے روکے وغیرہ۔ انسان حیبان پر غور کرتا ہے تو اس کو اپنی ہلاکت کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا کیا ذکر جو غیر اللہ کی عبادت بجالا کر کھلے شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ ائمہ اربعہ نے تارکِ صلوٰۃ، مانعِ زکوٰۃ، یا تارکِ اذان یا نمازِ عید سے قتال کرنا واجب قرار دیا ہے کیونکہ یہ شعائرِ اسلام ہیں، پھر اہل شرک و کفر سے قتال کا کیا ذکر؟ بعض نے تو اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔ جب نماز، روزہ، حج یا زکوٰۃ کے ترک کرنے سے کفر لازم آتا ہے تو ترکِ توحید و اخلاص سے کس طرح شرک لازم نہیں آئے گا۔ امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلك عصموا منی دماءہم و اموالہم الا بحق الاسلام وحسابہم علی اللہ!

مقالہ کے دوران میں جو آیتیں شرک و کفر کے رد میں پیش کی گئیں ان کو عرب ہی کے مشرکین کفار اور عابدینِ اصنام و اوثان کے حق میں سمجھنا غلطی ہے۔ ان کا اطلاق ہر زمانہ کے مشرکین پر ہوتا ہے، ہر زمانہ کے مشرکوں کے درمیان ایک ہی امر جامع مناسبت ہے اور وہ شرکِ بائیس ہے لہذا حکم ایک ہی ہو گا کیونکہ جامع موجود ہے اور فارق معدوم، چنانچہ اصول فقہ کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ العبرة

لہ اسی کو پیش نظر رکھ کر شاید اقبال نے کہا ہے جو می گویم مسلمانم بلذم ذکہ وانتم مشکلات لا ادرہ۔ (دارمغان حجاز)

بعموم الا لفاظ لا بخصوص الموارد یعنی اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا، اس کے احکام
 شرعیہ کا مدار اسی اصول پر ہے اور حدیث میں صراحت کی گئی ہے کہ حکمی علی الواحد حکمی علی الجماعۃ
 اس کے انکار سے یہ بات لازم آئیگی کہ جو حکم کسی خاص سبب کی بنا پر کسی گزشتہ واقعہ کے سلسلہ میں
 نازل ہوا ہے وہ اسی کی حد تک محدود ہے اور متعدی نہیں، یہ قطعاً باطل ہے۔ اس سے احکام شرعیہ
 کا تعلق لازم آتا ہے۔ کیونکہ جتنی آیات حدود و جنایات و مواریث ہیں وہ سب خاص خاص واقعات
 ہی کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے اور قیامت تک باقی ہے چنانچہ ابن عباسؓ
 نے ان آیات کی بابت جو بنی اسرائیل کے حق میں اتری ہیں فرمایا تھا: هذا نزل علی بنی اسرائیل
 وانه علینا مثلهم وما اشبه اللیلۃ بالبارحۃ۔ اسی چیز کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے کسی نے کیا
 خوب کہا ہے کہ نعم الاخوة بنی اسرائیل اذ کان کل حلوة لکد وکل مرة لہم! اور ائمہ ثلاثہ نے تو
 اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ شرائع ما قبل ہمارے لیے بھی شرع ہیں اور امام شافعیؒ بھی اسی اصول
 کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسی صورت میں جب کہ اس کی توضیح ہماری شرع میں بھی آجکی ہو۔ اب ہمارے
 شریعت نے بھی ان مسائل کی توضیح کر دی ہے۔ اور کتاب و سنت ان پر ناطق ہیں۔ ان کا تعلق
 اہم سابقہ اور مشرکین عرب ہی کے ساتھ سمجھنا کس قدر فاحش غلطی ہے۔
 پھر ذرا غور تو کرو کہ جس چیز سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کو منع فرمایا،
 خلافت و رزی پران سے مقاتلہ فرمایا، جس پر قرآن مبین نازل ہوا وہ شرک ہی تو تھا اور کفر، ان
 کے متعلق ساری آیتیں محکم ہیں اور غیر فسوخ، اہل و آخر ہر ایک کے لیے یکساں ہیں، علاوہ ازیں
 قرآن کریم میں ایسی آیتیں بھی ہیں جو خاص انبیاء بلکہ افضل انبیاء اور مومنین کے حق میں اتری ہیں
 ان میں شرک کو مجباً اعمال قرار دیا گیا ہے۔ سورہ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر ارشاد ہوتا
 ہے کہ وَلَوْ اَشْرَكُوا لَحِطَ عَنْهُمْ فَا كَانُوا يَاجِلُونَ، کسی جگہ خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا
 ہر لہین اشرکت لیحبطن عملک ایک جگہ اہل ایمان کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ
 بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ!

ہلکے اس زمانہ کے مومن مشرک بھوکے حدیث لتتبعن سنن من قبلکم اپنے پیشرو مشرکین
 عرب اور یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر "توحید الوہیت" ہی کا انکار کر رہے ہیں یعنی وہ اس امر کے
 قائل نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی لائق دعا و عبادت، خوف ورجا، استعانت و استغاثہ
 نہیں جس کے لیے جانور ذبح کیا جائے یا نذر مانی جائے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ
 کے سوا ان کے انبیاء و اولیاء بھی شائد و مصائب و آفات و بلیات میں ان کی فریاد سن کر، ان
 کی حالت سے مطلع اور واقف ہو کر ان کی مدد کر سکتے ہیں، "کشف ضرر" کر سکتے ہیں۔

اسی لیے ان کے اہل علم و فضل بھی اس کی علی الاعلان تعلیم کرنے لگے ہیں کہ حالتِ درود
 مصیبت میں پکارنا چاہیے، حضرت معروف کرخیؒ کو، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو، حضرت سالار
 مسعود غازیؒ کو، حضرت شاہ بدیع الدین مدار کو، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کو، حضرت قطب
 الدین کاکئیؒ کو، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جاہل اور عالم دونوں غیر اللہ سے اس طرح استعانت
 ہر مصیبت کے وقت کرتے ہیں، ان کے لیے مرغ، بکری، گائے ذبح کرتے ہیں، نذر و نیاز لاتے
 ہیں۔ منت مانگتے ہیں، چراغ روشن کرتے ہیں، ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں، سجدہ کرتے
 ہیں۔ وہ ان بزرگوں کو اپنے پیش روؤں کی طرح اللہ کی ذات میں شریک نہیں کرتے بلکہ ان کو اللہ
 کا مملوک و محکوم ہی مانتے ہیں، اللہ ہی کو حاکم و مالک و رب سمجھتے ہیں، مستقل معبود اللہ ہی کو جانتے
 ہیں اور اپنے ان بزرگوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں لیکن پھر اپنے پیشروؤں کی طرح ان کا عقیدہ
 یہ ہے کہ ان کے یہ بزرگ، صلحاء، مقرب الہی ہیں وہ ان کی نذر و نیاز، ان سے دعا، والتجاء و استغاثہ
 اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی وجاہت و شفاعت و قرب سے اللہ کے غصے اور خفگی و ناراضی سے
 نجات پا کر قرب حاصل کر لیں۔

اس مختصر مقالہ میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعینہ یہی عقیدہ "شُرک فی اللوہیت"

ہے۔ یہی مذہب الجہل اور الجاہل کا ہے سوار بسوار، حضرت عیسیٰؑ و حضرت عزیرؑ دلائلک و انبیاء کے
 پکارنے والے بعینہ اسی مسلک پر قدم زن تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن دُونِهِ لَا يَسْمَعُونَ

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ - وَقَوْلُهُ تَعَالَىٰ: وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْصُرُهُمْ
وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَوَّلَاءِ مَشْفَعًا نَّعْبُدُ اللَّهَ!

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ الی و امی) نے دین حق کا پیغام لا الہ الا اللہ پیش فرما کر
افراد عبادت اللہ کی طرف دعوت دی، ساری عبادت کو اللہ ہی کے لیے منحصر کر دیا خواہ استعانت
ہو یا استغاثہ، اذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت، قلبی ہو یا قالیبی، مشرکین
نے جن وسائل کو تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دیا تھا ان کی نفی فرمائی، وضاحت فرمادی کہ توسط
ان اولیاء و انبیاء و شہداء و ملائکہ کا اس اعتقادِ فاسد و زعم کا سد کے ساتھ کہ وہ ان کی شفاعت
کریں گے، بغیر اذن و مرضی حق کے کارآمد نہیں ہوگا، جو چیز کہ نفع دیگی وہ یہی عبادتِ خالص و توحید
منفرد ہوگی جو کلمہ اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد عبدہ و رسولہ ثابت ہے، جو شخص اس کلمہ
کے معنی پر چلا، اس کے مقصدی پر عمل کیا، وہی مومن موحدا و محسنِ فخلص کہلایا اور جس کا قول و فعل حال و
خیال اس کے معنی و مقصدی کے خلاف ہو وہ مشرک کا فر ہوا یا مبتدع ضال!

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ
اللَّهِ وَلَكِن أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي بَيَّنَّ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ أَقْرَبُ وَجْهَكَ لِلدِّينِ
حَنِيفًا وَلَا كُفْرًا مِّنَ الشِّرْكِ لَنْ يَنْفَعَكَ مَا لَا يُفْعَلُ لَئِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا
مِنَ الظَّالِمِينَ وَإِنْ يَمَسُّكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَ لِفَضْلِهِ
يَصِيبُ بِمَن يَشَاءُ مِّنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ تَدْعُوا لِمَا كُفِرَ بِهِ مِن دُونِ
مَنْ هَدَىٰ قَوْلًا مَّا يَهْتَدَىٰ لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهِ مَا آتَا عَلَىٰكُمْ يُوكِنُ
وَاتَّبِعْ مَا تَوْحَىٰ إِلَيْكَ وَأَصِرْ حَتَّىٰ يَخُوكُمُ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْخَائِمِينَ

صَالِحِيَّتِ

”إِنَّ الدِّينَ أَمْرٌ وَعَمَلٌ وَالصَّالِحِيَّتِ

لَنْدَخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ“ (پہلے ۱)

راہِ خدا کے مسافر، طریقِ طلب اور راہِ سفر کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) اصحابِ بحث و افکارِ ضمیر، حکما و عقلا کہ جانتے ہیں، اور (۲) اصحابِ کشف و ابصار جو عرفا و اولیاء کہلاتے ہیں۔ اہلِ بحث و نظر مقدمات کی ترکیب، دلائل و برہان کی تقریر اور نظر و استدلال سے حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ممکن کے وجود سے واجب کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، مصنوعات سے صانع کا، مخلوقات سے خالق کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ حکما و متفکرین کی جماعت ہے۔ ان کا طریقہ گو محمود ہے، لیکن نظر و استدلال کا انجام حیرتِ مذموم کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی حیرت کو ”حیرتِ نظائر“ سے تعبیر کیا گیا ہے، جو تصادمِ شکوک و تعارضِ دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے اس کے برخلاف اصحابِ کشف و ابصار بھی ایک قسم کی حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کو حیرتِ اولیٰ الابصار کہنا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہوتا ہے مشاہدہ و حدائیت والوہیت کا، آثار و عجائب ربوبیت کا، تو الٰہی تجلیات کا، اور یہ حیرت محمود ہے۔ ”رَبِّ زِدْنِي فَيْبَاكَ تَحِيْرًا“ کی دعا، اسی حیرتِ محمودہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب اسلام کے نام لیا حکما و متفکرین، فلاسفہ یونان کے اتباع میں انبیاءِ علیہم السلام کے عقائد سے اختلاف کرنے لگتے ہیں تو وہ بقول شاہ ولی اللہ قدس بترہ کثوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کتنے بھی پرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتے، اور یہ احمق دو ہزار سال کی پرانی ہڈیوں کو اب تک جھجھوڑنے میں لگے ہیں! ان کی ضلالت و گمراہی کا سبب ان کی ”عقلِ ناقص“ کے سوا کچھ نہیں۔

وَفَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

مصطفیٰ اندر جہاں انگہ کے گوید ز عقل آفتاب اندر فلک انگہ کے جوید سہا

اہل کشف و بصیرت وہ ہیں جو تصفیۂ باطن، تخلیہ تخیل، کمالِ قبیل، اور دوامِ توجہ سے ہنسا
مقصود کو پہنچتے ہیں "وہو الوصول الی معرفۃ اللہ و لقاۃ" انہیں صراطِ مستقیم کے جادہ پیمہ
کہا جاتا ہے، اور یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ کامل ملتِ ضعیفی
و دینِ مصطفوی ہے (صلوات اللہ علیہ و علیہم اجمعین) یہ گروہ مقدس اُن ہستیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی خود
حق تعالیٰ نے ثنا کی ہے (مَجِہْمٌ وَ مَجِہْمُوۃٌ) اور حضرت الوہیت سے ان کی تائید کی جاتی ہے (اَدْلٰیۡکَ
کَتَبَ فِی قُلُوْبِہِمُ الْاٰیۡمَانَ وَاٰیۡدِہُمُ بَرُوۡحَ مِیۡنَہٗ) یہ خدا کے علم نازل و لایزال کے پسندیدہ بندوں کا طبقہ
ہے، رضی اللہ عنہم و رضوانہ) یہ اپنے خالق کے وجود کا ادراک مقدماتِ عقلیہ قائم کیے بغیر
کیتے ہیں، اور حق کو نورِ حق ہی سے پہچانتے ہیں (اَلَّذِیۡنَ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِّلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرِہٖ
مِنۡ نُّوۡرِہٖ) انہیں نظر و استدلال کی حاجت نہیں ہوتی! بنیا کوزنگوں کے ادراک میں نظری دلیلوں
سے کام لینے کی کب ضرورت ہوتی ہے (اِنِّیۡ اَللّٰہُ شَکُّ فَاَطِرِ السَّمٰوٰتِ وَاَلۡاَرۡضِ) چنانچہ کسی نے حضرت
جنتید سے پوچھا کہ وجودِ صانع پر تمہاری کیا دلیل ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اَلْقَدِیۡغَتِنِی
الصَّبَاحُ عَنِ الْمَصْبَاحِ "مجھے دن کی روشنی نے چرغ کی روشنی کا محتاج نہیں رکھا ہے
حق رازِ حق شناس نہ از محبتِ قیاس غور شدہ راجح حاجتِ شمع است و مشعلہ (جاتی)
یہ مقدس ہستیاں درجہ کمال پر فائز ہوتی ہیں، انہیں مکتبِ خائے و عَمَلٰتَاہُ مِنْ لَدُنَّا عَلَمٰتَاہُ سے سبق ملتا
ہے، یہ شکوک و اوہام سے آزاد ہوتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے علوم کی وارثان کی تعریف میں
کسی نے کیا خوب کہا ہے: ہ

آہنا کہ ربودۃ الست اند از عہد الست باز مستند

در منزل درد بستہ پابند در دادن جاں کشادہ دستند

چالاک روند پس بیک گام از جوئی حدوث باز جہتند

فانی زخود و بدوست باقی این طرفہ کہ نیستند ہستند

این طائفہ اند اہل توحید باقی ہمہ خویشتن پرستند

یہ بزرگ ہستیاں طہارتِ فطرت پر ہوتی ہیں، دریا کے توحید میں غرق ہوتی ہیں، خلق نے جو کچھ حکایت سنا کر وہ اپنی بصیرت کے نور سے دیکھتی ہیں، خلق کے لیے جو "غیب" ہے، ان کے لیے شہادت ہے۔ چنانچہ عارفِ رومی نے ان کے اس کمال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

دفرِ صوفی سوادِ حرف نیست جز دلِ اسپید، پمچو برف نیست

زادِ دانشمند آثارِ مسلم زادِ صوفی چسیت اسرارِ قدم

انچہ تو در آئینہ بنی عیاں پیر اندر خشتِ بندیش ازاں

در دلِ انگور می را دیدہ اند در فنِ محض شیخ را دیدہ اند

لیکن ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں، اور ان کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی، وہ گم نام ہوتی ہیں، اور زاویہ گننامی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی صاحبِ کمال ہستی سے اخذ فیض کا ہمیں کچھ موقع مل گیا، یہ محض فضلِ یزدانی و موہبتِ ربانی ہے کہ ہم ان کے کچھ ارشاداتِ عالیہ کو یہاں پیش کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان ارشادات کا تعلق مرتبہ صحیحیت سے ہے۔

حق تعالیٰ نے صحابین کے دو وصف بیان فرمائے ہیں ایمان و عملِ صالح۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ (۱۶-۲۹)

ایمان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ ذاتِ اللہ ہی کو الہ قرار دینا، یعنی معبودِ مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید ہے، توحیدِ ایمانی ہے۔ اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہوتی ہے، جس ذاتِ پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی سالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر نکلتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں ہیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

رسالت اور صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ کی الوہیت کی تصدیق ہے۔ توحید میں حق تعالیٰ کی عبودیت
درجہ بعبودیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔

اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک "نفاق" ہے جس کا نتیجہ لہدی جہنم ہے۔

"وَعَدَّ اللَّهُ لِلْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارِ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا" (پ ۶ ع ۱۹)

اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے جس کا نتیجہ ظلودِ نار و جہنمِ اعمال ہے۔

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَمِمَّا هُوَ كَافِرٌ فَاُولَٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي

الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَاُولَٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (پ ۶ ع ۲۴)

ارتداد، شرک کی طرح دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لیے ناقابلِ معافی!

کفر و شرک، نفاق و ارتداد بڑے جرائم ہیں، سخت گندگی و نجاست ہیں۔ ان سے قلب

کی تطہیر ضروری ہے۔ یہ تطہیر ان سے تو بہ اور لا الہ الا اللہ کے اقرار و تصدیق ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہی وہ

علم ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخر الزماں (علیہ الصلوٰۃ
والسلام) تک پیش کیا ہے اور دعا کی ہے کہ:-

"اللَّهُمَّ تَوَقَّنَا مُسْلِمِينَ وَالمُحَقَّنَا بِالصَّالِحِينَ غَيْرِ خَزَايَا وَلَا مُفْتَوِينَ"

ایمان محض تصدیقِ قلب کا نام ہے، اور اعمالِ جوارح اس میں داخل نہیں ہیں۔ امورِ ذیل

پر غور کر لے سے یہ امر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۱) ایمان لغت میں تصدیق یا صحیح ماننے کو کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ برادرانِ یوسف علیہ السلام

کی زبان سے فرماتے ہیں:-

وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا

گو ہم سچ ہی کہیں نہ کہتے ہوں آپ کو تو ہماری بات کا

صِدِّقِينَ ؕ

یقین آنے کا نہیں

(۲) خود حق تعالیٰ ایمان کو فعلِ قلب قرار دیتے ہیں:-

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اَلَا

(جو شخص کفر پھر کیا جائے) مگر اس کا دل ایمان کی طرف

مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ
 وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكَفْرِ صَدْرًا
 فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ وَ لَهُمْ
 عَذَابٌ عَظِيمٌ (پ ۴۰ ع ۲۰)

سے مطمئن ہو (اس سے کچھ مواخذہ نہیں) لیکن جو شخص
 ایمان لائے پیچھے کفر کرے، اور کفر کرے بھی توجی کھول
 کر تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہوگا، اور ان پر
 سخت عذاب ہوگا۔

یہاں قلب کو ظرفِ ایمان قرار دیا جا رہا ہے اور ایسے شخص کو کفار کے زمرہ میں سے نکال لیا جا رہا
 ہے جو جبر و اکراہ کے سبب اعمالِ ظاہری کی پابندی کو چھوڑ دیتا ہے، مگر دل سے مسلمان ہے اور موردِ
 غضبِ خداوندی وہی شخص قرار دیا جا رہا ہے جس کے دل نے خوشی سے کفر کو قبول کر لیا ہے۔
 (۳) قرآن کریم میں اکثر جگہ اعمالِ نیک کی جزا اور ثواب کے لیے ایمان کو شرط ٹھہرایا گیا ہے،
 ظاہر ہے کہ شرطِ مشروط سے خارج ہوتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمالِ ایمان میں داخل
 نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ
 أَنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ
 الْجَنَّةَ وَلَا يظَلَمُونَ فَقِيرًا (پ ۱۸۶ ع ۱۸۶)

جو شخص کوئی نیک کام کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت
 بشرطیکہ وہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل
 ہونگے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ
 أَنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ
 لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا
 يَعْمَلُونَ (پ ۱۸۶ ع ۱۸۶)

جو شخص کوئی نیک کام کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت
 بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو بالطف
 زندگی دینگے، اور ان کے اچھے کاموں کے عوض میں
 ان کا اجر دینگے۔

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيًا
 وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ
 مَشْكُورًا (پ ۲۶ ع ۲۶)

جو شخص آخرت کی نیت رکھتا اور اس کے لیے جیسی
 سعی کرنا چاہے ویسی سعی کریگا بشرطیکہ وہ شخص مومن
 بھی ہو، تو ایسے لوگوں کی سعی مقبول ہوگی۔

(۴) حق تعالیٰ گنہگاروں کے لیے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں :-

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ
 لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ
 الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ

آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے آپ پر
 زیادتیاں کی ہیں، تم خدا کی ذات سے ناامید مت ہو
 بالیقین خدا تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا، واقعی وہ

(پ ۲۳-۳۶) بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

بہت سی آیتوں میں مغفرتِ ذنوب کی نوید ہے، اس کے برخلاف کفر کے لیے عذابِ مخلد کی

وعید ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ
 اللَّهِ ثُمَّ مَا تَوَّأَوْا وَهُمْ كَفَارًا فَلَن يَغْفِرَ
 اللَّهُ لَهُمْ (پ ۸۶-۲۶)

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے اللہ کے
 راستے سے روکا، پھر وہ کافر ہی رہ کر مر گئے، سو خدا کے
 تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیگا۔

اگر اعمالِ داخلِ ایمان ہوتے اور ان کا نہ کرنا داخلِ کفر، تو ان کی نسبت بھی بصورتِ عدم
 تعمیل، کفر کی طرح عدمِ مغفرت اور دوامِ عذاب کی وعید ہوتی نہ کہ مغفرت و رحمت کی نوید!

رہ جس تعالیٰ نے دو صاحبِ تصدیق قتال کرنے والے گروہوں کو یوں کہہ کر یاد فرمایا ہے:-

وَإِن طَافْتُم مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ بِأَقْتُلُوا
 فَاصْلِحُوا بَيْنَهُمَا، فَإِن بَغْتُ أَحَدُهُمَا
 عَلَى الْآخَرِي فَقَاتِلُوا الَّذِي تَعْتَدِي
 تَعْتَدِي إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءَتْ فَاصْلِحُوا
 بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
 الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ
 فَاصْلِحُوا بَيْنَ أَخْوَيْكُمْ وَأَقْسِطُوا
 لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (پ ۱۳۶)

اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان
 اصلاح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی
 کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہے یہاں تک کہ وہ
 خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے، پھر اگر رجوع ہو جائے
 تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو،

اور انصاف کا خیال رکھو۔ بیشک اللہ انصاف والوں کو
 پسند کرتا ہے۔ مسلمان تو سب بھائی ہیں سہانے دو بھائیوں
 کے درمیان اصلاح کرادو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ

اگر اعمالِ جزوِ ایمان ہوتے تو اس باہمی قتال سے دونوں کافر ہوتے ان کو مسمن نہ کہا جاتا، نہ

تبارك و تعالیٰ لا یقبل من الاعمال الا کے لیے کر دینا کہ حق تعالیٰ عملِ خالص کے سوا

ما اخلص (رواہ البزار عن الضحاك بن قیس) کوئی عمل قبول نہیں کرتے۔

جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے، تو ارشاد ہوا:-

اخلص دینك بکفیک العمل القلیل تو اپنے دین کو خالص کر، تجھے تھوڑا سا عمل بہت

(رواہ الحاکم) کریگا۔

عمل جب حق تعالیٰ ہی کے امر کے امتثال میں اور ان ہی کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے اور اس سے انہی کی ذات منقصود ہوتی ہے تو وہ خالص ہوتا ہے اور ایسا ہی عمل "صلح" کہلایا جاتا ہے۔

ج۔ صلح ہونے کے لیے عمل کا مطابق کتاب و سنت ہونا ضروری ہے۔ من احدث فی

امرنا هذا ما لیس منه فہو رد (اخر جہ الشیخان) اس پر نص ہے یعنی جو شخص دین کے کام میں وہ چیز

نکالتا ہے جو اس میں نہیں وہ مردود ہے۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا گیا ہے: من صنع امر علی غیل من انہو رد

(رواہ ابو داؤد) ایک اور طرح بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فہو رد (رواہ مسلم)

ان نصوص سے ظاہر ہے کہ جس کام کے کرنے کا دین میں حکم اور اذن نہ ہو وہ کام دین میں

بدعت ہے، گو یہ کام بظاہر کیسا ہی اچھا کیوں نہ نظر آئے! جب اسلام میں اعمالِ صالحہ و افعالِ حسنہ

بے حد بے شمار ہیں تو ان اعمالِ ثابتہ کو چھوڑ کر افعالِ مستحدثہ کو اپنا دین ٹھہرانا عقل کا ہیضہ نہیں تو

کیا ہے! "بہتر بات تو خدا کی بات ہے، بہتر ہدایت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے، اس کے

بدتر کام وہ ہیں جو نئے نکالے گئے ہیں۔ ہر بدعت گمراہی ہے" (عن جابرؓ)

بدعت بھی عجیب بلا ہے۔ دیکھو گنہگار یا فاسق خواہ وہ کتنا ہی بد کردار کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ

سمجھتا ہے، جی میں اس کام کو برا جانتا ہے گو منہ سے نہ کہے، اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ جس چیز کو برا جانتا ہے

اس سے کسی روز توبہ کر لے گا! لیکن صاحبِ بدعت کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن

سمجھ کر کر رہا ہے! حضرت ابن عامر نے حضرت ابو بکرؓ سے مرفوعاً جو حدیث روایت کی ہے وہ اس روز آ

کے تجربے کو عجیب و غریب طریقے سے ظاہر کرتی ہے:-

”ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کا مرتکب کیے کے ہلاک کر دیا اور انہوں نے مجھے گناہ سے توبہ کر کے برباد کیا جب میں نے یہ حال دیکھا تو پھر میں نے ان کو جوئی و بدعت میں مبتلا کر کے ہلاک کیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق پر ہیں اس لیے استغفار نہیں کرتے، اس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں۔“

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ:-

”کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار!!“

”ایمان اور عمل صالح کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد اب مومن لا معبود الا اللہ کے شغل میں مشغول ہو جاتا ہے، اور جملہ معبودانِ باطل کی قلب سے نفی کرتا ہے اور یہ معبودانِ باطل اس کے حق میں تین ہیں:- دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی۔“

لا معبود الا اللہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ کے سوا میں امورِ دنیا میں سے کسی کا مطیع و منقاد نہیں جب بھی امورِ دنیا سے کوئی خطرہ میرے قلب میں آتا ہے تو میں حق ہی کی حولِ قوت سے اس کی نفی کرتا ہوں اور لا الہ الا اللہ کی تلواری سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں! میرا عمل میری ہر حرکت حق تعالیٰ کے امر کے امتثال میں ہوتی ہے اور میرے تمام جذبات احکامِ الہیہ کے پابند ہوتے جوتے ہیں کیونکہ ان کے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں! میرا کوئی عمل اسی وقت صالح یا قابلِ قبول ہوگا جب میں حق تعالیٰ ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے اُن ہی کے بتلائے ہوئے طریقے سے اس کو انجام دوں!۔

اسی طرح میں خلق کو اپنے کسی عمل میں شریک نہیں کرتا، ریا و سمعہ کا کوئی خطرہ جب میرے قلب میں خطو کرتا ہے، عمل کے وقت جب کسی مخلوق کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو یہ جان کر کہ ایسی حالت میں حق تعالیٰ کی بجلے ہی میرا معبود بن جاتا ہے، لا الہ الا اللہ کی تیغ سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں۔

اسی طرح جب عمل کے وقت نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش، جاہ و عزت، خود نمائی، عجب و کبر یا کسی لذتِ نفسانی کا گزر میرے قلب میں ہوتا ہے تو صاف طور پر یہ جان کر کہ ہر چہ در بند

آنی بندہ آئی اور حق تعالیٰ کی اس تہدید کا خیال کر کے کہ: "أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ" میں کلام اللہ کی تلوار سے ان تمام خطرات کی نفی کرتا ہوں تاکہ ماسوی اسد کی عبادت کی ذلت سے پوری طرح نجات پاؤں! مجھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بددعا یاد آتی ہے جو انہوں نے اُس شخص کے حق میں کی تھی جو مال و دولت کو، عمدہ لباس و شہرت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور جس کا سارا عمل ان ہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

تص عبد اللدینار و تص عبد الدہم و تص عبد الخیصہ و انتکس و اذا شیک فلا انتقش!

"تباہ ہوا اشرفی کا بندہ اور روپیہ کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ (یعنی جو رات دن بس انہی کی طلب اور فکر میں

رہے) منہ کے بل گرے پھر سر کے بل الٹ چلے، اور جب اس کے کانٹا چبھے تو کوئی اس کا کاٹنا نہ

نکلے (راتنی بھی مدد نہ کرے کیونکہ وہ بندہ زہی ہے)"

جب میرے قلب پر سے ان معبودانِ باطل کی حکومت کامل طور پر اٹھ جاتی ہے اور سریرِ دل پر صرف

حق تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور میرے تمام جذبات اوامرِ الہیہ کے پابند ہو جاتے ہیں تو میں آزاد

و حریت کا وہ ذوق محسوس کرنے لگتا ہوں جو مہفت کشور کے بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہو سکتا!

عارفِ رومی نے اسی حلاوت کو محسوس کر کے فرمایا ہے: ہ

گر تو خواہی حری و دل زندگی بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی مقصود بہر بندگی است زندگی بے بندگی شرمندگی است

ہر کاند عشق یا بند زندگی کفر باشد پیش او بزر بندگی

ذوق باید تا بد طاعات بر مغز باید تا بد دانہ شجر!

عبدیت ہی حریت کا اصلی سبب ہے، حریت کیا ہے؟ "هو انقطاع الخاطر عن تعلق ماسوی

اللہ تعالیٰ بالکلیہ!" سچی آزادی اس انسان کو نصیب ہوتی ہے جس نے اغراضِ نیادی و خواہشاتِ نفسانی

سے اپنے قلب کو آزاد کر کے حق تعالیٰ سے بندگی و افتقار کی نسبت جوڑ لی ہے! حریت نہایت عبودیت کا

نام ہے "آزادگی بے بندگی" نہیں ہے کہ بستگانِ کمند تو رستگار اندہ (حافظ) و نعم باقیل۔

خواہگی را خواہگی از بندگی ست بندگی کردن کمالِ خواہگی ست!

من ازاں روز کہ در بند تو ام آزادم بادشاهم کہ بدست تو اسیر افتادم!

لا الہ الا اللہ کے معنی اول لا معبود الا اللہ کے ہیں۔ عبادت کے معنی غایت تذلّل و افتقار کے ہیں۔ زندگی کو جی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کے ہیں۔ زندگی کی ہر حرکت امتثالِ امر الہی میں ہو، ہر فعل کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہو یعنی مقصود و محبوب اللہ ہی ہو! لا مقصود الا اللہ، لا محبوب الا اللہ یہ ہیں دوسرے معنی لا الہ الا اللہ کے۔

لا الہ الا اللہ یعنی لا معبود الا اللہ کے شغل سے سالک کے قلب سے دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی یا جذبات کا تسلط اٹھ جاتا ہے لیکن باطن میں حق تعالیٰ کے سوا اور مقصود و موجود رہ سکتے ہیں جن کا لا مقصود الا اللہ کے شغل سے دور کرنا ضروری ہے، یہ مقاصد بھی تین ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ ۱: بہشت و ما فیہا من اکور و القصور۔ ۲: مقامات کشفی مثلاً کشفِ قبور، کشفِ قلوب، یا کشفِ بلا وغیرہ۔ ۳: تجلیاتِ قرنی۔

مقصود حقیقی حق تعالیٰ ہوں تو جنت بھی بالذات مطلوب نہیں قرار پاتی ہے۔ اگر جنت کا سوال

کیا جائے تو محض اس بنا پر کہ وہ نخلِ دیدار محبوب ہے ۶

عاشقانِ جنت برائے دوست می دارند دوست!

اور ضوان من اللہ اکبر سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضائے حق کو جنت سے اکبر قرار دیا گیا ہے۔

نہ ہی مقصود وہ مقامات کشفی ہیں جو اولیاء اللہ کو تبعا حاصل ہوتے ہیں جیسے کشفِ قبور یا کشفِ قلوب

یا کشفِ بلا۔ ۷

۷ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جنت کی طلب ایمان یا کمالِ ایمان کے منافی ہے۔ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء، صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل کون ہو گا۔ باہم قرآن و حدیث میں ان حضرات کی جو دعائیں نقل کی گئی ہیں ان میں جنت کا سوال بار بار کیا گیا ہے اور دوزخ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ البتہ بندہ مومن کا اصلی اور اولیٰ محبوب و مطلوب بس حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضائی ہونا چاہیے۔ "وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ" ۱۲

دریں منزل بود کشف و کرامات و لے باید گزشتن زان مقامات

نہ ہی وہ تجلیاتِ قربی مقصود ہیں جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہیں مثلاً ولایت و غوثیت و تطہیرت وغیرہ،

مقصود صرف ذاتِ حق ہے، ان کا حضور، ان کا ذکر، ان کی فکر، ان کی یاد ہے

یارب ز تو آنچه من گدای طلبم افزوں ز ہزار پادشاهی طلبم

ہر کس نعد تو حاجتے می خواہد من آمدہ ام ز تو ترا می طلبم

اس شغل کے تسلسل سے حق تعالیٰ کی محبت دل پر ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ ایک لفظ کے لیے بھی ان کے

عقلت نہیں ہوتی، اور اس کا یہ حال ہو جاتا ہے:۔

از بس کہ خیالت ب نظر می دارم

در ہر چہ نظر کنم توئی پس دارم

یہ مقامِ تلوین ہے، یہاں عاشقوں کے قلب و زبان سے فریاد نکلتی ہے، حال طاری ہوتا ہے، لیکن وہ

اس حال سے ترقی کرتے ہیں اور محض رضا کے حق ان کا مطلوب ہو جاتا ہے جس حال میں رکھیں

اس سے راضی رہتے ہیں، ہجر و وصال دونوں سے راضی ہو جاتے ہیں۔

معتوقہ کہ شد بجا عائق من گفتا کہ نہ بہ عاشقی لائق من!

وصل است ز من کام تو آئےستی تو عاشق کام خویش نے عاشق من

اب ہر فعل و حرکت میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں، حق تعالیٰ کے جملہ افعال و احکام میں سے کسی

فعل یا حکم پر جو خود ان کی جان پر یا جہان پر جاری ہو جاتا ہے کوئی اعتراض نہیں کرتے، اور ۶

ہر چہ از دست می رسد نیکو است

کہ کر تسلیم خم کر دیتے ہیں! توافق بالقضاء، اعراض عن الاعتراض ان کا شعار ہو جاتا ہے، مرض ہو یا

خلاف نفس کوئی چیز ہو اپنے محبوب کے حکم اور اس کی مشیت کا اس کو توجہ سمجھ کر اس سے محظوظ و خوش وقت

ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے ایسے وقت بس ہی نکلتے ہیں، کہ

عاشقم ہر سنج خویش در درد خویش! بہر خوشنودی شاہ فرد خویش!

اور عارفِ روحی کے الفاظ میں اپنے یقین کا اس طرح اظہار کرتے ہیں : ۷

آن کے راکہ چنیں شاہے کشد سوئے بخت و بہتری جاؤ کشد

نیم جاں بتاند و صد جاں وہد آنچه در بہت نیاید آن وہد

اور سہر حال میں رضوان کا مقام ہوتا ہے : ۷

زندہ کنی عطا کے تو در کیشی فدائے تو

جاں شدہ مبتلا کے تو ہر چہ کنی اضمکے تو

اب لکھنؤ تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم کا یہ لفظ قدیہ صحیح مصداق بن جلتے ہیں

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہم) نتیجہ ہے جذبات اور عقلی پرواز کو اوامر الہیہ کے تابع کرنے اور ان کو محمد

مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں قربان کر دینے کا ۷

ایں راہِ طریقت ز بپائے عقل است خاکِ قدم عشق و راکے عقل است

بیرے کہ فرشتہ جوں ازاں بجز است اے غافل بے عقل چہ جاکے عقل است (لا اظم)

نیکلی علم ہے

علمی کہ دروہل نباشد عار است

ہر سبکہ کہ بے ذکر بود زنا راست

ہر کس کہ بہ علم بے عمل می نازد

عالم نبود علمی مشعل در راست

ربیع جہانگانی

یونان کے شہرہ آفاق مفکر سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ یہ پوچھا جائے تو بس یہی مشہور قول ہے،

کہ ”نیکلی علم ہے اور بدی چل“ اس سے سقراط کا بظاہر یہی مطلب تھا کہ عمل صالح (نیکلی) علم صحیح کا نتیجہ

ہے، اور علم صحیح تین کے درجہ میں عمل نیک سے جدا و منفک نہیں، ان میں ایک سروروی لازمی

رابطہ پایا جاتا ہے، یہ لازم و ملزوم ہیں، سچ پوچھو تو ارباب علم کی تعریف ہی اس طرح کی جاسکتی ہے

الذین یعملون بما یعلمون یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔ ہر کتاب خواں و کتاب

داں عالم نہیں قرار دیا جاسکتا، وہ عالم نہیں، مسئلہ ذیالمسائل ہے۔ مسائل علمیہ کا حافظ اور

ان سے لذت اندوز ہونے والا ہی عوام کا یہ تین محفل ہے کہ ہر کرم کتابی کو وہ عالم سمجھتے ہیں، اعلیٰ

مشعل دار کو بیٹھا جانتے ہیں، اور اپنے اس وہم کی تائید میں قلیل محفل سے کام لیتے ہیں۔ اس مختصر

مقالہ کا مقصد اس بنیادی غلطی کا ارتقاع اور اس کی تائید میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان

کا ابطال ہے۔ ۶۔ یک تنقیہ دماغی باید کرد۔

ذرا سقراط کے اس قول کو کہ ”نیکلی علم ہے“ اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش

کر دو، کیا علم صحیح عمل صالح کے لیے ضروری نہیں؟ کیا جہاز رانی کے لیے جہاز کی ساخت اور

اس کے کام سے واقف ہونا ضروری نہیں؟ اسی طرح حکمرانی کے لیے مملکت کی ماہیت و

مقصد و غایت کا جاننا لازمی نہیں؟ بالکل اسی طرح جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ نیکلی کیا ہے،

جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ خصائلِ حسنہ کیا ہیں، تقویٰ کیا ہے، عفت و شجاعت کیا ہے، حکمت و

عدالت کیا ہیں، اور ان کی ضد خصائل سے کیا ہیں، کیا ہم نیک بن سکتے ہیں، تقویٰ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا ہے، ہم نیک بن سکتے ہیں! یہاں تک تو عوام کو بھی سقراط کی رائے سے اتفاق ہوگا کہ جب تک آدمی کو نیکی کا علم نہ ہو وہ نیک نہیں بن سکتا، اس معنی میں قطعاً نیکی علم ہے، لیکن سقراط فطرت انسانی کا رازدار تھا، اس کی رائے میں فطرت انسانی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ شر کو خیر پر ترجیح دے، وہ قطعاً خیر ہی کا ساتھ دے گی۔ کیونکہ خیر ہی میں اس کا ذاتی فائدہ ہے، نفع ہے، بھلا ہے، خیر کے ہم سب عاشق ہیں، خیر ہی ہمارا محبوب ہے، ہم سب اسی کے پروانے ہیں، یہ ممکن ہے کہ جہل کی وجہ سے ہمیں شر خیر نظر آئے، شر کو ہم خیر سمجھنے لگیں اور اس ظلم باطل کی وجہ سے شر کا ساتھ دیں اور اس کو اختیار کریں، لیکن یہ ہماری فطرت کا تصور نہیں، یہ ہمارے ارادہ کا نقص نہیں، یہ ہمارے علم کا تصور ہے، جہل کی تاریکی میں ہمیں خیر کے صحیح ضد و مخالف نظر نہیں آتے اور ہم سراب کو آب سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر گرتے ہیں، اسی لیے ”بدی جہل ہے“ اور صرف جہل ہی بدی ہے، اور جہل نام ہے علم صحیح کے فقدان کا! جہل میں بھی جو علم نظر آتا ہے وہ علم صحیح نہیں، دھوکہ ہے اور اس کا عالم ہمارا نہیں جاہل ہے!

اگر فطرت انسانی کے متعلق سقراط کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں اس کا یہ قول ماننا ہی پڑتا ہے کہ ”کوئی شخص ارادہ بد نہیں“ ”کوئی شخص ارادہ شر کو اختیار نہیں کرتا، اور جب وہ دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوتا ہے، تو بڑی بُرائی پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جب وہ چھوٹی بُرائی کو چن سکتا ہے، اور میں یہ بھی ماننا پڑتا ہے جہل ہی کی وجہ سے ہم شر کو اختیار کرتے ہیں، گناہ میں پڑتے ہیں، لہذا جہل ہی گناہ ہے، بدی ہے۔ جہل سے مراد یہاں عدم علم نہیں بلکہ سفاہت یا حماقت ہے۔ اس لیے جاہل ایک معنی میں عالم کہلایا جاسکتا ہے، لیکن ہر معنی میں وہ احمق ضرور ہے۔ عوام جنہیں اپنی رائے میں عالم قرار دیتے ہیں وہ حقیقی معنی میں سفیہ یا احمق قطعاً ہوتے ہیں، وہ خیر کی ماہیت سے جاہل ہوتے ہیں، اپنے نفع و ضرر سے بیخبر ہوتے ہیں، وہ اشیاء کے بطون سے واقف نہیں ہوتے، وہ

مظاہر کے حسی علم میں گرفتار ہوتے ہیں، وہ اصل میں مست خواب ہوتے ہیں، لیکن خواب میں اپنے کو بیدار سمجھتے ہیں۔ ۲۔ خضہ دائم خویش را بیدار می بیند بخواب۔ (صائب)

جذبات سے زیادہ جہل کی مورث کوئی اور شے نہیں۔ اسطو نے سقراط کے اس قول پر جو تنقید کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ اسطو کی رائے میں انسان کے اکثر اعمال پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے، ان کی محرک شہوتیں ہوتی ہیں، عقل یا علم صحیح نہیں، عمل جذبات کے تابع ہوتا ہے، اور جذبات اسطو کے الفاظ میں ”روح کا غیر عقلی حصہ ہوتے ہیں“ سقراط کا عمل اس کی عقل کا تابع تھا، اس نے خیال کیا کہ ہر شخص کا عمل اسی طرح عقل کا تابع ہوتا ہے، اسی لیے اس نے نیکی کو علم قرار دیا، لیکن روح انسانی کے غیر عقلی حصے، جذبات اپنی قوت و شدت کے لحاظ سے مرد افکن ہوتے ہیں، اور انہی کا تسلط انسان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے، عقل و حکمت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، ان کا پیدا کروہ عمل بھی علم اور نیکی سے جاری ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان راہ مستقیم کو جاننے کے باوجود بھی جذبات کے زیر اثر گمراہی اختیار کرتا ہے، ہاتھ میں شمع رکھنے کے باوجود چہلہ میں گر جاتا ہے وہ اعلیٰ مشعل دار ہے ”چارپائے ہر دو کتابے چند“ کا مصداق ہے، زبان سنت میں ”علم باللسان“ اور ”جاہل بالقلب“ ہوتا ہے، اس کے وجود ہی سے حافظ کی یہ مشکل پیدا ہوتی تھی :-

مہنگے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس تو بہ فرمایاں چرا خود تو بہ کمتری کشند

اسطو کی اس تنقید سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیکی محض ظلم ہی نہیں، ہر عالم مرد صالح نہیں، علم کے باوجود انسان کا نیک کردار بن جانا ضروری نہیں، جذبات اس راہ کے مزاحم ہیں۔

میان بلبل و پروانہ فرق بسیار است کجا بہ رجبہ کرداری رسد گفتار!

سقراط کا یہ کہنا صحیح ہے کہ علم یا بصیرت نیکی کے لیے قطعی ضروری ہے، اس کے بغیر نیکی کی راہ نہیں ملتی۔ لیکن اسطو کہتا ہے کہ محض علم ہی کافی نہیں، ارادہ بھی ضروری ہے، علم کا استعمال ہونا چاہیے، اس کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے، مجاہدہ سے عمل آسان ہوتا ہے، عمل کی تکرار سے عادت

قائم ہوتی ہر عمدہ عادتوں کے قیام ہی سے انسان نیک بنتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ۶
چند روز جہد کن باقی بخند!

اسطو کی تعیدلا جواب نظر آتی ہے، لیکن سقراط کی بات پر غور کرو، شاید بالآخر تم اسی کی
بات سے اتفاق کرو گے، تم کہتے ہو کہ عالم بے عمل کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ محض علم نکی
نہیں جس کا دعویٰ سقراط کرتا ہے، انسان کو علم و یقین ایک بات کا ہونا ہے اور وہ عمل اس کے
ظلمات کرتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا یہ علم یقین کس پایہ کا ہے، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو لوگ
دوسروں کو ترک دنیا کا سبق دیتے ہیں، اور خود سیم و غلہ جمع کرتے ہیں، ترک دنیا کے قائل ہیں،
اس پر یقین رکھتے ہیں، ان کا قلب اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے؟ وہ خود بھی شاید سمجھتے
ہیں کہ انہیں اس پر یقین ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں یقین صرف اسی چیز کا ہے جس پر وہ عمل
کرتے ہیں، اگر انہیں روحانی اقدار کی حقیقی قیمت کا یقین ہوتا تو وہ قطعی اسی کی تلاش کرتے
اور حطام دنیوی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، انسان کی فطرت ہی میں یہ داخل ہے کہ وہ
اپنا بھلا چاہتا ہے، فائدہ کی تلاش کرتا ہے، اور نقصان یا ضرر سے بھاگتا ہے، میں جانتا ہوں کہ
آگ پر انگلی رکھنے سے شدت کی سوزش ہوتی ہے، اس لیے میں آگ کے قریب نہیں جاتا،
اگر اسی قسم کا یقین مجھے ہو جائے کہ آخرت قابل ترجیح ہے، کیونکہ یہی باقی رہنے والی ہے تو پھر میرے
لیے یہ ناممکن ہے کہ میں آخرت کی پروا نہ کروں اور "تجربہ مستورہ دنیا" کی تازہ برداری کرتا رہوں جیسا کہ
ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، جہل یعنی صحیح علم و یقین کے فقدان ہی سے شرکار تکاب عمل میں آتا
ہے، اور بہر حال یہ نفسیاتی قانون صحیح ہے کہ "عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم و یقین" لہذا
عمل ہی سے حال و یقین ظاہر ہوتے ہیں، کسی شخص کے یقین کا پتہ چلانا ہو تو اس کا عمل دیکھا
جانا چاہیے نہ کہ محض قول، خود اس شخص کو اپنے یقین کی کیفیت اس کے اپنے عمل ہی سے معلوم
ہوتی ہے، نفس کے دھوکوں کا حال عمل کے محاسب سے ظاہر ہو جاتا ہے، اور حال قابل اعتبار

۱۲۵ ترک دنیا بمرم آموزندہ: خوشن سیم و غلہ اندوزندہ۔

ہر نہ کہ قال، کردار پر تصفیہ ہوتا ہے نہ کہ محض گفتار پر ہے

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دم بے قدم

غرض یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر شخص اپنے علم و یقین کے مطابق ہی عمل کر رہا ہے تو سقراط کی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نیکی علم صحیح کا نام ہے، علم صحیح قطعاً عمل صالح پیدا کرتا ہے، انسان کو اپنے فائدہ کا علم اور اس پر یقین ہونے کے بعد اس کو اختیار کیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی بنی ہے کہ وہ خیر کی طرف راغب ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کو خیر کا علم ہو جائے اور خیر ہی کے علم کو صحیح معنی میں علم کہا جاسکتا ہے اور لائق حق ہی سے دیدہ بننا حاصل ہوتا ہے۔

دیدہ بننا از لائق حق شود حق کجا ہمراہ ہر احمق شود
(ردی)

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے "حکمت یونانیاں" سے حکمت ایمانیاں کی طرف رجوع کرتے ہیں، نور عقل و جس کو نور حق سے زمینت بخشتے ہیں۔

نور جس را نور حق تزیں بود معنی نور علی نور میں بود (ردی)
نیکی علم ہے، کیونکہ علم کی اصل "خشیت اللہ" ہے (خوف خدا ہے) اذما یخشى الله من عباده العلماء (پت ۱۹۶) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، اس لیے ابن مسعود وغیرہ نے کہا ہے کہ کفی بخشیة الله علماً و کفی بالاعتزاز بالله جهلاً جب علم خوف خدا کا نام ہے، کثرت روایت کا نہیں، معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں (لیس العلم بکثرة الروایة ولكن العلم خشية) تو اب علم قطعاً عمل کو درست کر دیتا ہے، یعنی اس سے نیکی پیدا ہوتی ہے، انسان صالح بن جاتا ہے اور اسی معنی میں کہا جاسکتا ہے کہ نیکی علم ہے، اور عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ من خشی الله فهو عالم و من عصاه فهو جاهل۔ اس بنا پر ہم ہر کتاب خواں و کتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے، امام شیبہؒ اپنے

لے امام احمد نے معروف سے نقل کیا ہے۔

وقت کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں تملذذ بالمسائل (Intellectual) (Epicure) جو مسائل سے بحث میں تمہیں لذت ملتی ہے، اور یہی لذت تمہاری غایت ہے۔ عالم سے مراد عامل باللہ فی اللہ عارف باللہ ہے، یعنی عالم وہ ہے جو عرفان حق و خوف خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے اور عمل کا مقصود اللہ ہی کی رضا و محبت کو قرار دیتا ہے۔

اسی علم کو زبان سنت میں "علم نافع" کہا گیا ہے اور اس کی وضاحت کی گئی ہے، یہ علم ایک نور ہے جو عالم کے حجابات کو رفع کرتا ہے اور اس کو عرفان حق عطا کرتا ہے، اسی علم کی وجہ سے وہ اپنے رب کی طرف راہ یاب ہوتا ہے، اس کو اپنے سے قریب، بلکہ اقرب پاتا ہے، اس کو حاضر و ناظر جانتا ہے، اس یافت قرب کی وجہ سے عالم کا اللہ سے بڑھتا جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں ملاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرض و عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہوتی ہے، اب اس کا مقصود حق تعالیٰ ہو جاتے ہیں، جان و مال، فرزند و زن سے وہ زیادہ عزیز و محبوب بن جاتے ہیں اور وہ انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے:

خوابم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم فلکے شوم وزیر پلے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توی از بہر تو میرم و بڑے تو زیم (صحابی ستر آبادی)

جب یہ تعلق عباد میں اور اس کے رب میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح جان پہچان ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے لیے کافی ہو جاتے ہیں کفی باللہ و کیلا! جو کچھ وہ مانگتا ہے اس کو ملتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ چاہتا وہی ہے جس میں ان کی رضا ہوتی ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوانہ علیہم کہ وہ جانتا ہے کہ ہر شے کا عوض حق تعالیٰ ہیں، لیکن ان کا عوض کوئی شے نہیں۔

لہ لئن سألنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعینہ۔

لکل شیء اذا فارقتہ عوض و لیس لله ان فارقتہ من عوض

عارف رومی نے اسی مطلب کو اپنے سُرے لغزوں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے بادشاہ سے انس پیدا ہو جاتا ہے تو پھر سارے درد و غم کا اس کو علاج مل جاتا ہے اور اس کی طرف رخ کر کے وہ سارے جہان سے فارغ ہو جاتا ہے۔

آنکہ شد آسش بہ شاہ فرد خویش یافت در ماہنکے جملہ درد خویش

چوں ازاں اقبال شیریں شد دہاں سر و شد بر آدمی ملک جہاں

جس کو یہ علم نافع عطا ہوتا ہے اس کو مزید تین چیزیں دی جاتی ہیں۔ قلبِ فاضل، نفسِ قانع اور دعا مسموع۔ جب اصل علم خستہ آتد ہے تو علم کے ساتھ ہی خدا کا خوف بھی عالم کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے، وہ طالبِ دنیا نہیں رہتا، وہ طالبِ علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ معصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں رکھتا، اس کو مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی آرزو نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسنؑ کے الفاظ ہیں وہ ناہد فی الدنیا، راعب فی الآخرة، بصیر بدینہ، مواظب علی عبادۃ ربہ ہوتا ہے یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف راعب ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ ہوتا ہے۔ دوسری روایت میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے الذی لا یحسد من فوقہ ولا یحقر من دونہ ولا یوخذ علی علم علیہ اللہ یعنی وہ اپنے سے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا تمسخر نہیں کرتا اور اس علم کی وجہ سے جو اس کو اللہ نے سکھلایا ہے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا۔ جوں جوں اس کا علم زیادہ ہوتا جاتا ہے، اللہ سے اس کا خوف، تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اہل العلم النافع کلمتا ازاد و من هذا العلم ازاد و اللہ تواضعاً و خشیتاً و انکساراً و ذلاً، (علاء ابن عمیر) عالم میں خاک کی طرح غمسل

لہ ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی ہے بدلہ ہے، لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا ہے تو اس کا کوئی بدلہ نہیں۔

دل و افتقار پیدا ہو جاتا ہے، کبر و فخر و رعوت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا ہے
 در خاک بیعتاں برسیدم بہ عابدے گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن
 گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیر یا سر چہ خواندہ ہمہ در زیر حناک کن
 علم نافع کا عامل اس فقر الی اللہ کی وجہ سے سارے عالم سے غنی ہوتا ہے وہ غنی ہونے پر
 نہیں وہ غنی عن الشیء ہوتا ہے، اس کا برگ و ساز قرآن عظیم ہے، اس کا قلب سوز و ساز، ذوق
 و شوق، تسلیم و رضا سے مملو ہوتا ہے وہ سراپا صدق و اخلاص و نیاز ہوتا ہے، اس کے فقر کا
 کچھ حال اقبال کی زبانی سنو:-

چسیت فقرائے بندگان آب و گل	یک نگاہِ راہ بین، یک زندہ دل
فقر کا رخویش را سنجیدن است	بر دو حرف لا الہ الا اللہ است
فقر خیر گیر بانان شعیر!	بستہ فتراک او سلطان میر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا است	ما امانیم این متاع مصطفیٰ است
فقر بیکر و بسیار عجبوں زند	بر نوامیس جہاں شبنوں زند
برگ و ساز اوست قرآن عظیم	مرد درویشی نہ گنج در گیم

غرض وہ علم نیکی سے جس کی اصل خشیت اللہ ہے جو اپنے حامل میں قلب فاشع و نفس
 قانع پیدا کرتا ہے، اور اس کی وجہ سے دھارِ سموع حاصل ہوتی ہے، اور جس شخص سے یہ علم
 نافع فوت ہو جاتا ہے وہ ان آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے پیغمبر اسلام (روحی فدا) نے
 پتہ مانگی تھی یعنی یہ علم اس پر وبال و حجت ہو جاتا ہے، اپنے علم سے وہ کوئی نفع نہیں پاتا، اس
 کا دل اپنے رب کے لیے نہ خشوع اختیار کرتا ہے، اور نہ اس کا نفس دنیا سے سیر ہوتا ہے، اور
 نہ اس کی دھارِ سنی جاتی ہے، یہ علم نہیں جبل ہے اور تمام بدیوں کا مبداء، ہمیں اس عارف
 کی تلاش ہے جو اپنی شمع سے محفل کو روشن کر دے اور ہمارے قلب سے کانٹوں کو نکال کر

اس کو گلشن بنادے ۵

عارف دل و جان تو معین سازد
 خاکے کہ کند بجاش گلشن سازد
 کامل ہمہ را ز نقص بروں آرد
 یک شمع ہزار شمع روشن سازد

(قادی ہندوستانی)

تعلیم کا مقصد

گر جرعہ زجام معرفت نوش شود دین کشمکش ہوا فراموش شود
 قلب عارف زیر فلک کے گنجد کے دریا را حباب ہر پوش شود (صحابی استرآبادی)

نزول کے اعتبار سے قرآن مبین کی سب سے پہلی آیت اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ پیدا کرنے والے نے ہمیں پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لیے بنایا ہے۔ ہمیں کان، آنکھ اور دل (یا قرآن کے الفاظ میں سمع، و بصر و قواد) مشاہدہ، تجربہ و استنباطِ نتائج ہی کے لیے عطا کیے گئے ہیں! عام طور پر پہلے علم کا معروض ہماری ذات یا انفس ہے، پھر آفاق ہے اور پھر انفس و آفاق کا پیدا کرنے والا! انفس و آفاق کی نشانیوں کا جاننا حق تعالیٰ کی معرفت کے لیے ضروری ہے اور قرآن نے علم کی حقیقی غایت حق تعالیٰ ہی کے عرفان و وجدان کو قرار دیا ہے! حق تعالیٰ کے عرفان ان کی یافت و نشود سے بڑھ کر اور کیلئے ہو سکتی ہے جس سے انسان ایک لحظہ بھی مطمئن و شاد کام ہو سکتا ہو۔

کیست زو بہتر بگوئے پیچ کس تابداں دل شاد باشی یک نفس

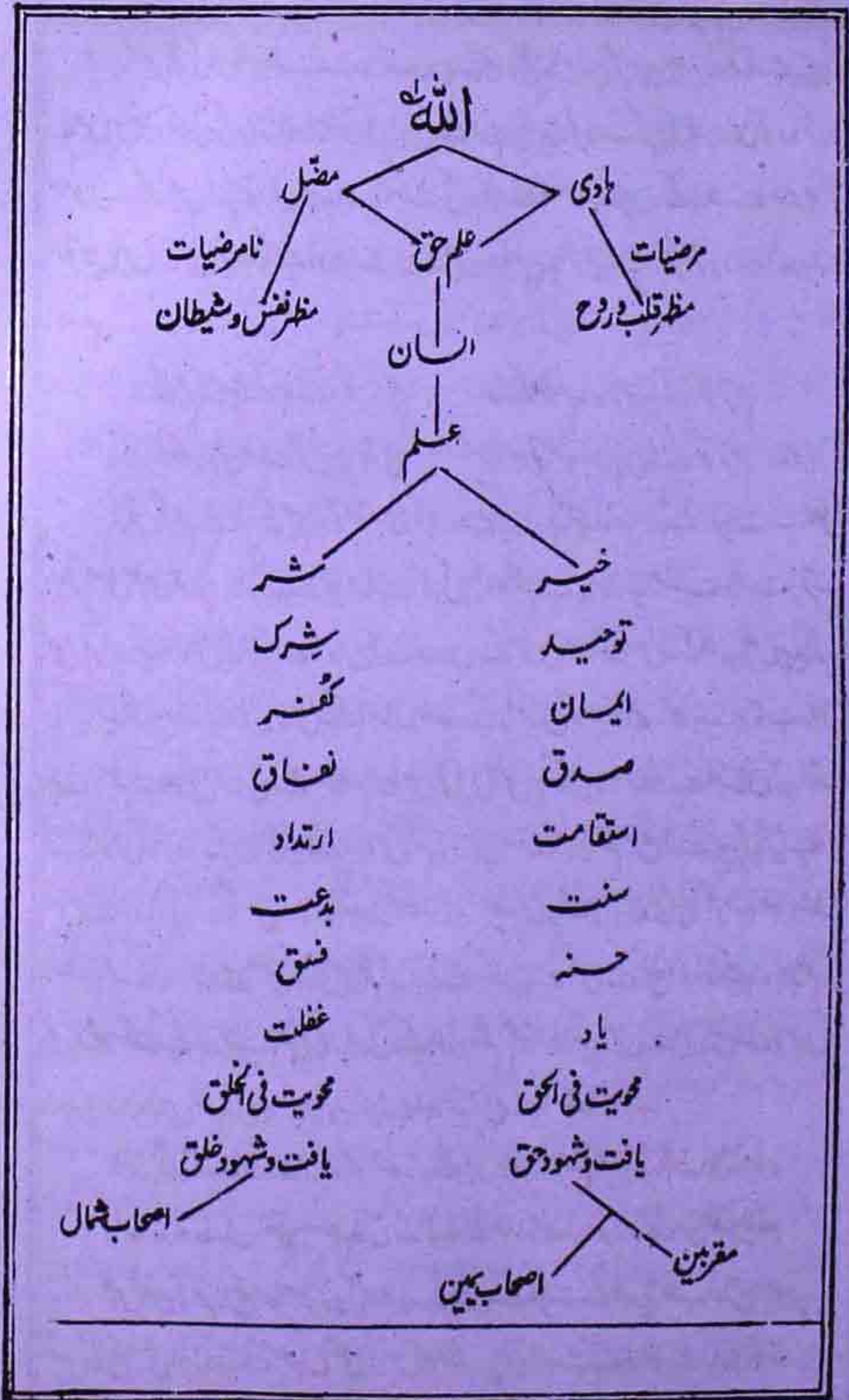
من ز شادی خواہم منے خسروی انچہ می خواہم من از تو ہم توی (ردی)

علم کا مقصد اولین حق تعالیٰ کا عرفان ہے، یعنی یہ جاننا ہے کہ حق تعالیٰ کن اسماء و صفتیں، صفات علیہ و افعال باہرہ سے موصوف و متصف ہیں، ان کا اظہار کس طرح کائنات کی لائشاہی اشیاء، لورا انفس کے لائعداد و احوال و آثار میں ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں عقل کو تاج وحی کر کے آفاق پر نظر ڈالی جائے تو ہر ورق معرفت کردگار کا دفتر بن جاتا ہے؛ اور ہر ذرہ اس کی وحدت کا گواہ، اور تمام عالم اسی کے جمال کا آئینہ نظر آئے لگتا ہے!

ہمہ عالم جمال طلعت اوست گر کے را کہ این نظر باشد! (سعدی)
 ایمان کی اس نظر میں جب کائنات جلوہ گاہِ حق دکھائی دینے لگتی ہے تو نتیجے کے طور پر
 حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت، ان کی خشیت و محبت سے انسان کا قلب معمور ہو جاتا ہے اور
 حلاوت و لذت سے آشنا ہو جاتا ہے جو ذاتِ حق کا خاصہ ہے!

کلے بلبیل جان مست بیا تو مرا وے پایہ غم پست بیا تو مرا
 لذاتِ جہاں را ہمہ دریا فلند ذوقیکہ دہد دست بیا تو مرا (جہاں)

اسما و صفات و افعالِ حق کے عرفان کے بعد علم کا مقصد قرآن کی رو سے یہ جانتا ہے کہ
 کون سے اعمال، احوال، اقوال یا اعتقادات ہیں جو حق تعالیٰ کو محبوب و پسندیدہ ہیں اور وہ چیزیں
 کونسی ہیں جو ان کو پسند نہیں اور جن سے انہوں نے انسان کو روکا ہے! قرآن مجید نے حق تعالیٰ
 کی مرضیات کی تفصیل ایمان، توحید، صدق، استقامت، سنت، حسنہ، یاد، محویت فی الحق،
 یافت و شہود حق کے سلسلہ میں شرح و بسط کے ساتھ کی ہے اور شرک و کفر، نفاق و ارتداد، بدعت و
 فسق، غفلت و محویت فی المخلوق اور یافت و شہودِ خلق کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور مقررین
 "اصحابِ یمن"، اور اصحابِ شمال کے مقام و صفات کو واضح طور پر معین کر دیا ہے۔ خیر و شر، علم
 ہدایت و علم اضلال قطعاً حق تعالیٰ ہی عطا کرتے ہیں، خیر و شر میں امتیاز کرنا وہی سکھاتے ہیں
 و ہدایت بناؤ۔ النجدین سے یہی مراد ہے، بد کرداری اور پرہیزگاری کا تقابلی ان ہی کی جانب سے
 ہوتا ہے، تاکہ کتاب و سنت کی روشنی میں بد کرداری سے گریز اور پرہیزگاری پر عمل کیا جاسکے۔
 فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (پت ۱۶۶) سے یہی مطلب ہے: حق تعالیٰ ہی کو علم کا سبب اقرار دے کر
 علم ہدایت و علم اضلال کی تشریح ایک نقشہ سے کی جاسکتی ہے جو قرآنی تفصیلات کے اظہار میں
 "الیم فی اسم" یا دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے!



جو شخص علم کی ان تفصیلات سے واقف ہو جاتا، وہ علم ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتا ہے رہی کرتا ہے جس میں حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے اور ان چیزوں سے گریز کرتا ہے جن کو وہ مکروہ و ناخوش رکھتے ہیں! اپنے اس مجاہدہ و ریاضت کی وجہ سے اصحابِ پین کے درجہ سے بلند ہو کر مقربین میں شامل ہو جاتا ہے اور جنت ذات میں قیام پیدا کر لیتا ہے۔ فرخ و درمیان و جنت نعیم!

خواہم کہ ہمیشہ درہماتے تو زیم خاک کے شوم و ہر زیر پائے تو زیم
مقصود میں خستہ زکونین توئی از ہر تو میسر م دہائے تو زیم (تاکم)

قرآن کریم نے علم کے یہی دو مقصود قرار دیے ہیں، چنانچہ امام احمد نے معروف سے نقل کیا ہے کہ اصل علم حق تعالیٰ کا ڈر ہے، یعنی اس کے علم کی جڑ وہ علم ہے جو موجب خشیت و محبت و قرب حق ہو اور بندہ کو حق تعالیٰ سے مانوس کرے اور ان کے شوق کا شعلا اس کے قلب میں پیدا کرے اور یہ جیسا کہ اوپر کہا گیا، حق تعالیٰ کے اسماء و صفات و افعال کو جاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کے احکام اور اس قول یا عمل یا حال یا اعتقاد سے انسان کو واقف کرانے جو ان کو محبوب ہیں اور پسندیدہ! اس علم کو زبانِ سنت میں "علم نافع" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے از یاد کی دعا کی گئی ہے۔ اللّٰهُمَّ اَنْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِّمْنِي وَزِدْنِي عِلْمًا وَارْزُقْنِي عِلْمًا سَنَفَعْنِي بِهِ (رواہ الترمذی) حق تعالیٰ جو علم آپ نے مجھے سکھایا ہے اس سے نفع اندوز کیجئے اور جو علم نافع یاد دہ مجھے سکھائیے اور میرے علم میں زیادتی کیجئے اور وہ علم مجھے عطا کیجئے جس سے میں نفع اندوز ہوں۔ دوسری حدیث میں علم نافع کا سوال کیا گیا ہے اور غیر نافع سے استعاذہ:-

اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَلِکَ عِلْمًا نَافِعًا وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ اَخْرَجَ لِلنَّسَائِیْ وَ ابْنِ
مَا جِدَّ لَفْظُ اِنِّیْ النَّبِیُّ صَلَّی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ سَاَلُوْا اللّٰهَ عِلْمًا نَافِعًا وَ تَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ
جس شخص کو علم نافع حاصل ہو گیا اس نے اس کے ثمرات کے طور پر قلبِ خاشع بھی پایا۔
نفس قانع بھی اور دعائے سموع بھی! اس کا قلب اپنی وسعت کے لحاظ سے ساری کائنات میں

نہیں سما سکتا۔ کیا حجاب دریا کا سر لوٹا ہو سکتا ہے؟

مَنْ وَسِعَ الْحَقَّ فَمَا ضَاقَ عَنْهُ
خَلَقَ فَكَيْفَ الْأَمْرُ يَا سَامِعَ الْبُحْرَانِ

علم کے ان ثمرات پر ایک نظر ڈالو۔

(۱) قلبِ فاشح: علم نافع جب قلب میں اُتر جاتا ہے تو اب وہ قلب حق تعالیٰ کے لیے فاشح اور شکستہ ہو جاتا ہے اور اس کی ہیبت و جلال کے سامنے اس کی خشیت و محبت و تعظیم کے لیے سراغ بندہ اور ذلیل ہو جاتا ہے! اور جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معرفت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ان کی خشیت و محبت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کا دل انکسار بھی روز افزوں! اسی کیفیتِ قلبی کو سعدی نے ان مشہور اشعار میں ادا کیا ہے:-

در خاک بلیقاں بر سیدم بعبادے گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن!

گفتابرو چو خاک تحمل کن اے فقیہ یا ہر چہ خواندہ ہمہ در زیر خاک کن! (سعدی)

علم کا ثمرہ ہی خشیتِ اللہ ہے! إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (پہ ۱۶۶) حق تعالیٰ

سے ان کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں! اسی لیے ابن مسعود وغیرہ نے کہا ہے، کفی بخشية الله علماً وكفى بالاعتزاز بالله جهلاً۔ علم کا نتیجہ خوفِ خدا، اور جہل کا نتیجہ بے خوفی اور دھوکا، علم خوفِ خدا کا نام، کثرتِ روایات کا نہیں۔ معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں، دماغ کو علومِ رسمی سے پر کرنے کا نہیں۔ لیس العلم بکثرة الروايات ولكن العلم خشية عالم رہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے، ”من خشى الله فهو عالم ومن عصاه فهو جاهل“

عالم کی اس تعریف کو پیش نظر رکھ کر ہم ہر کتاب خواں اور کتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے

چنانچہ اسی معیار سے جانچ کر امام شعبیؒ اپنے زمانے کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں ”متلذذ

بالمسائل“ (INTELLECTUAL EPICURE) ہو تمہیں علمی مسائل سے بحث کرنے میں

نہ جس میں حق سما گیا، رہ غلط سے کیونکر تنگ ہو سکتا ہے اور اس کا کیا حال ہو گا لے سننے والے۔

لذت ملتی ہے اور یہی لذت تمہارا مقصد و غایت ہے اسی پر تم فدا ہو عالم دراصل عامل اللہ فی اللہ باللہ ہے یعنی عالم وہ ہے جو عرفان حق اور خوف خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے۔ اس کے عمل اور مجاہدہ کا مقصد اللہ ہی کی رضا و محبت ہوتی ہے! اس کا مطلوب و محبوب صرف حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں!

دل از غم کائنات برداشتم بہ! جز یاد تو ہر چہ بہت بگذاشتم بہ!
چشمے کہ نہ از نور تو روشن باشد بشگافند و بجاک انباشتم بہ!

(۲) نفس قانع: قلب خاشع کا لازمی نتیجہ نفس قانع ہے۔ جب دل میں خشوع پیدا ہو گیا، حق تعالیٰ سے ذل و افتقار کی نسبت قائم ہوگی تو اب نفس اللہ سے راضی اور غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اب غنی عن الاشیاء ہو جاتا ہے! وہ جانتا ہے کہ کوئی شے حق تعالیٰ سے برتر نہیں جس کے حصول کی وہ خواہش کر سکے، اب سب کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے! اسی لیے فرمایا گیا ہے۔ لَکِبَلَا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاکُمْ! اس کو علوئے تکمیل حاصل ہو جاتی ہے، وہی مخاطب ہوتا ہے اس قول کا: اَنْتُمْ الْاَعْلٰیْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ!

نفس ساری کائنات کو پا کر بھی حریص رہ سکتا ہے۔ ہل من مزید کا نعرہ لگا سکتا ہے! لیکن جب وہ حق تعالیٰ کو پالیتا ہے، ان سے مانوس ہو جاتا ہے تو پھر دنیا اس کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت و جلال سے اس کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے! اثر اسرائیلی میں اس کا ذکر بڑی خوبی سے آیا ہے:-

ابن آدم طلبنی تجدنی، فان وجدتهی وجدت کل شیء وان فاتک فاتک کل شیء وانا احب الیک من کل شیء

ابن آدم تو مجھے طلب کر تو مجھے پائیگا۔ جب تو نے مجھے پایا تو گویا تمام چیزیں تجھ کو مل گئیں۔ اگر تو نے مجھ کو کھو دیا تو گویا تو نے تمام چیزوں کو گم کر دیا، میں تیرے نزدیک ہر شے سے زیادہ محبوب

پسندیدہ ہوں، اسی مفہوم کو کسی عاشق نے یوں ادا کیا ہے :-

لِکَلِّ شَيْءٍ إِذَا فَارَقْتَهُ عَوْضٌ
وَلَيْسَ لِلَّهِ إِنْ فَارَقْتَهُ مِنْ عَوْضٍ

عارف رومی نے اسی چیز کو اپنے سریلے نعموں میں ایوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے شاہِ ذیجاہ سے انس و پیار پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کو سارے دردوں کی دوا مل جاتی ہے اور وہ اس کی طرف اپنا رخ پھیر کر سارے جہان سے فارغ و بے فکر ہو جاتا ہے :-

آنکہ شد آنش بشاہِ فردِ خویش یافت دربانہائے جملہ درد خویش

چوں ازاں اقبال شیریں شد ایں سرد شد بر آدمی ملک جہاں (رومی)

حق تعالیٰ سے مانوس ہو کر اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کے اطوار سے بیزار ہو جاتا ہے، وہ طالبِ غلو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا، اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ محضوں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں کرتا، اس کو لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو نہیں رہتی، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی خواہش نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسن کے الفاظ میں (الزاهد فی الدنیا الراغب فی الآخرۃ، البصیر بدینہ، للمواظب علی عبادۃ ربہ ہو جاتا ہے! یعنی دنیا میں بہ اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف مائل ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے، اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ بن جاتا ہے) وہ اپنے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا مذاق نہیں اڑاتا۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے حق تعالیٰ کا خوف بڑھتا جاتا ہے، تواضع و انکسار میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ اہل العلم النافع کلمات اذداد و من هذا اذداد و اللہ تواضعاً و خشيةً و انکساراً و ذلاً (ابن عمر)

وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے زندہ رہتا ہے، مال و گنج کے لیے نہیں، وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے

جان دیتا ہے، خوف و رنج سے نہیں مڑتا۔

اے ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی ہے بدر ہے لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا رہے تو اس کا کوئی بدل نہیں۔

ہر کجا امر قدم را مسلکیست	زندگی و مردگی پیشش بکیست
بہر نیماں می زیدنے بہر گنج	بہر زیدال می مردن خوف و بے گنج
ہست ایمانش برائے خواہ او	نے برائے جنت و اثمار و جوا
ترک کفرین ہم برائے حق بود	نے زہیم آنکہ در آتش مرد
این چنین آمد ز وصل آن خوی او	بے ریاضت نے بچھوے او
آنکھاں خند رک او بیند رضا	بچھو لوئے شکر اور اقصا (روحی)

(ص) دعائے مسموع :- جب قلب میں خشیت پیدا ہو گئی اور وہ حق تعالیٰ کی محبت سے منور ہو گیا اور دنیا سے شکم سیر ہو گیا تو اب وہ حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہو جاتا ہے اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، اور اے فرض عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اب وہ اپنے رب سے جو کچھ مانگتا ہے، اس کو دیا جاتا ہے، جو دعا کرتا ہے قبول کی جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں صاف وعدہ کیا گیا ہے :-

لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّىٰ أُحِبَّهُ إِلَيَّ قَوْلِ فَلَمَّا سَأَلَنِي
لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَا تَسْتَعِذَنِي لَا عِذْنَ لَهُ مِنِّي (وفی روایت) وَلَمَّا دَعَانِي لِأَحِبُّبَنَّهُ
(رواہ البخاری)

جب بندہ کو حق تعالیٰ سے انس و تقرب حاصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی دعا مسموع ہوتی ہے، اس کا سوال پورا کیا جاتا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی پرورش میں آجاتا ہے، وہ اس کے ولی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ :-

سچ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: ہمیشہ میرا بندہ نزدیک ہوتا ہے مجھ سے بذریعہ نوافل کے تاکہ وہ دست رکھتا ہوں میں اس کو تو ہوتا ہوں میں شنوائی اس کی جو سناتا ہوں وہ اس سے، اور بیانی اس کی جو دیکھتا ہوں اس سے اور اس کا جو کچھ کہتا ہوں اس سے اور پیر اس کا جو چلتا ہوں اس سے، اور اگر سوال کرے مجھ سے تو دیتا ہوں میں اس کو، اور اگر پناہ مانگے مجھ سے تو البتہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو اور ایک روایت میں بھی ہے کہ اگر وہ دعا کرے مجھ سے تو ابتر میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

یا غلام! احفظ الله يحفظك، احفظ الله تجده امامك، تعرف الله في الرخاء يعرفك
 الله في الشدة" یعنی اے لڑکے تو حق کو نگاہ رکھ (اس طرح کہ اوامر و نواہی کو بجالا اور قضا، قدر
 کو مان) تو اللہ تجھ کو اپنی حفاظت میں رکھیگا، تو اللہ کو نگاہ رکھ (مراقبہ علم و حضور و معیت کے ساتھ)
 تو اس کو اپنے سامنے پائیگا (وہ تجھ کو دنیا و آخرت دونوں کی آفتوں سے محفوظ رکھے) تو اللہ کی
 یاد آرام و صبر کی حالت میں کروہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کریگا (تیری دعا کو قبول کریگا اور
 تیری مصیبت کو دور کریگا!) اسی لیے تو عارفِ رومیؒ نے کہا تھا:-

زندگی بے دوست جاں فرسودہ است مرگِ حاضر غائب از حق بودن اسر
 عمر و مرگ این ہر دو با حق خوش بود! بے خدا آپ حیات آتش بو! (رومیؒ)
 جب علمِ نافع لے ہمیں قلبِ خاشع، نفسِ قانع، دعلے مسموع کی نعمتوں سے بہرہ یاب
 کر دیا تو اب اس میں حق تعالیٰ ہی میں مشغولیت حاصل ہو جاتی ہے، تمام عالم سے بخود فانی ہو کر
 باقی حق ہو جاتے ہیں، ماسوی اللہ سے قلب کا تخلیہ ہو جاتا ہے اور یافت و شہودِ حق ہی ہمارا
 عمل ہو جاتا ہے، یعنی ہم مخلوقات کو چھوڑ کر خالق میں، معلومات کو ترک کر کے عالم میں مصروف ہو
 جاتے ہیں۔ یہ ہے علمِ نافع کا ثمرہ اور اس کا انجام!

چوں بہ مطلوبت رسیدی اے طبع شد طلب گاری علم کنوں قسبح
 چوں شدی بر باہمائے آسماں سرود باشد جستجوئے نزدباں (رومیؒ)
 نسأل الله علما نافعاً ونعوذ به من علم لا ينفع ومن قلب لا يتخشع ومن
 نفس لا تشبع ومن دعاء لا يسمع، اللهم اننا نعوذ بك من هولاء الاربع

انسانِ کامل

دی شیخ با چراغِ ہمی گشت گردشگر
 کز دام و دردِ ملولم و انسا تم آرزو ست!
 زیں ہر ہاں سست عناصرِ دلِ گرفت
 شیرِ خدا و رستم دستا تم آرزو ست!
 گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
 گفت آنکہ یافت می نشود اتم آرزو ست! (روح)

ان اشعار میں عارفِ روم نے دیو جانس کلی کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر کسی گم شدہ شے کی نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ تلاش کر رہا تھا۔ لوگوں نے یہ نظارہ دیکھ کر پوچھا کہ اجی آخر ڈھونڈھتے کیا ہو؟ کہا کہ انسان کو ڈھونڈھ رہا ہوں! اسی حکیم کا ذکر ہے کہ ایک روز وہ اپنے مقام پر چڑھ کر پکار لے لگا کہ لوگو! ادھر آؤ! جب چند لوگ اس کے قریب پہنچے تو اس نے انہیں اپنے سونٹے سے مار بھگایا اور کہا کہ میں نے تو انسان کو بلایا تھا تم تو بول و برا نہ ہو!

گویا دیو جانس کی نظر میں انسانِ کامل اور اس انسانِ ناما صورت میں وہی فرق ہے جو کسی شخص میں اور اس کے بول و برا میں ہو سکتا ہے! دیو جانس اور اس کے مبعین نے انسانِ کامل کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی زیادہ تفصیل تو ان کے ہاں نہیں ملتی البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کامل کی زندگی کا مقصود ذواقیت اور لذت پرستی نہیں بلکہ حق طلبی و حق رسی ہے جس کو وہ اپنی زبان میں نیگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیگی سے ان کی مراد خواہشات سے قلب کا کامل تخلیہ ہے! جب انسان کا قلب تمام نفسانی خواہشات سے فارغ ہو جاتا ہے، لذتوں کی تمنا اور آرزو اس کے دل سے نکل جاتی ہے، مال و دولت، جاہ و عزت کی طلب بالکل جاتی رہتی ہے تو وہ کمال

۱۳۰ یہ مقالہ لشرگاہ حیدرآباد وکن سے نشر کیا گیا۔

کے اس زینہ تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کے عروج کا آخری زینہ ہے! کلبیہ کا لغزہ تھا:-

خریستی از آب و علف دست بدار سگ نیستی از جیفہ دنیا بگذرا!

قلب لذت کی خواہش سے آزاد ہو جائے، لذت کے مؤیدات جاہ و شہرت، مال و دولت سے مستغنی ہو جائے۔ اتنی بات تو صاف ہے لیکن قلب کے اس تحلیل کے بعد اس کا تحلیل کس چیز سے ہو؟ کلبیہ کا جواب ہرنیکی سے! نیکی سے کیا مراد ہے؟ اس کا ایجابی تضمن کیلئے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ نیکی سے مراد خواہشاتِ نفسانیہ سے قلب کا تزکیہ! "اس دور سے کلبیہ نہیں نکلتے اور خود نیکی یا کمال کا کوئی ایجابی تضمن ہیں ان سے معلوم نہیں ہوتا یا پھر فلسفہ کی تاریخ میں یہ محفوظ نہیں کیا گیا۔

اب ہم اس تلاش میں یونان کے اس فلسفی کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی نگاہ زلزلہ عالم افکار ہے، جو یونان کا سب سے بڑا مفکر ہے، ہماری مراد افلاطون سے ہے۔ یونان کے مفکرین میں سب سے پہلے افلاطون ہی نے روحِ انسانی کی تشفی بخش نفسیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ روحِ انسانی کی تین ملکات میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے ایک کی فطرت عقلی ہے اور دوسری غیر عقلی۔ سب سے ادنیٰ ملکات جو روح کا غیر شریف اور دنیٰ حصہ ہیں، وہ احساسات، خواہشات اور اشتہات ہیں۔ ان کی فطرت غیر عقلی ہے۔ ان میں نہ کوئی نظم ہوتا ہے نہ ترتیب، ان کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ قاعدہ! ضروری ہے کہ ان پر ایک اعلیٰ ملکہ کی حکمرانی ہو، قہرمانی ہو، جو ان کو حدِ اعتدال میں رکھے، عفت و پاکبازی کے اصول کے تحت ان پر حکومت کرے! یہ اعلیٰ ملکہ عقل کا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے شریف ہے جو حکمت کا مقام ہے! جس طرح خواہشات اور اشتہات کا کام عقل کی فرمانبرداری و اطاعت پذیری ہے اسی طرح عقل کا فطری والہی حق حکمرانی و قہرمانی ہے۔ عقل جذبات و خواہشات پر حکمرانی کے لیے بنائی گئی ہے! ان دو ملکات کے درمیان روح کا تیسرا ملکہ ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ارادہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ احساسات و اشتہات کی طرح دنیٰ و دُریل نہیں، فطرۃ

مائل بشر نہیں۔ یہ خلقاً شریف ملکہ ہے اور حیب اس کی صحیح ذہری کی جاتی ہے تو یہ اعلیٰ کمالات کے حصول کا ایک قوی ذریعہ بن جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ بذات خود غیر عقلی ہے اور کورانہ جذبہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے، لہذا اس کا مقام عقل سے فروتر ہے۔ عقل کا خادم ہے جس کو جذبات و اشتہات کو مطیع اور رام کرنے کے کام پر لگایا جاسکتا ہے؛ فلاطون ادنیٰ ملکات کا مقام جگر کو قرار دیتا ہے، عقل کا سر کو، اور ارادہ کا گردن سے نیچے کے حصہ کو، اس مقام کی وجہ سے وہ جذبات و خواہشات کو روک سکتا ہے اور عقل کی ہدایت و ذہری حاصل کر سکتا ہے۔

افلاطون کی رائے میں یہ تینوں ملکات حقیقی معنی میں ایک دوسرے سے جدا و علیحدہ ہیں اگر فطرت انسانی کو کامل وحدت قرار دیا جائے تو پھر اس امر کی توجیہ کسی طرح نہیں کی جاسکتی کہ کیوں عقل کو اکثر دفعہ جذبات کے خلاف اپنی پوری قوت سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ سچ پوچھو تو عقل ہی روح ہے اور جو اس بدن کے محض وظائف ہیں۔ تاہم یہ نہ خیال کیا جائے کہ ان کے درمیان کوئی ربط و تعلق نہیں۔ ایسا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہلکے ادنیٰ ملکات اعلیٰ ملکات کی خدمت و اطاعت کے لیے ہیں، جسم روح کی خدمت گزاری کے لیے ہے۔ اس ربط و تعلق کو افلاطون نے ایک مشہور مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے جو رتھ بان اور پردار گھوڑوں کی مثال کہلاتی ہے۔ ان دو گھوڑوں میں سے ایک شریف ہے اور دوسرا رذیل، اس لیے ان دو کو ایک ساتھ قابو میں رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ شریف گھوڑا ارادہ کی تعبیر ہے اور رذیل جذبات و خواہشات کی۔ رتھ بان عقل ہے۔ شریف عنصر کا رخ آسمان کی جانب ہوتا ہے، اس کا رجحان و میلان علو و رفعت کی طرف ہے، وہ جمال و کمال کا دلدادہ ہے، لیکن جسم اس کو زمین کی طرف کھینچتا ہے، زمین کی لذتوں اور شہوتوں پر وہ جان دیتا ہے، ہر اچھی چیز کا تعلق شکم ہی سے قرار دیتا ہے یا پھر ساری کائنات کا محور و مرکز آلہ تناسل کو سمجھتا ہے، اور اسی کا شیفتہ و ربودہ ہے۔ اب رتھ بان یا عقل قبریاں کا کام ہے کہ اپنے ان دونوں گھوڑوں کو قابو میں رکھے،

ادنی اور ذیل کو اعلیٰ و شریف کے تابع کر دے، ان کا رخ علو و رفعت کی جانب پھیرنے نتیجہ کے طور پر روح میں عدالت کی صفت پیدا ہوتی ہے جو اس کا کمال ہے، یعنی روح کا کمال اس کے مختلف ملکات یا حصوں کا ایک خاص ربط و تعلق ہے جس میں ہر ملکہ یا حصہ اپنی فطرت و تہمت کے لحاظ سے اپنے صحیح مقام پر اپنے خاص فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتا ہے اور وضع آتش علیٰ محلہ کے اصول کی تکمیل تکمیل ہو جاتی ہے! فرد عقلمند و حکیم اس وقت سمجھا جاتا ہے جب عقل روح کے دوسرے ملکات پر حکومت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کس چیز میں مضمر ہے۔ فرد میں شجاعت کی صفت کا اس وقت ظہور ہوتا ہے جب ارادہ، لذت و الم، کرب و طرب میں عقل کی ہدایت پر عمل کرتا ہے کہ کس چیز سے خوف کیا جائے اور کس چیز سے نہیں۔ اس میں عفت کی صفت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ارادہ اور جذبات و شہوات عقل کے حکم و اقتدار کا اتباع کرنے لگتے ہیں۔ جب عقل، ارادے اور شہوتوں میں توافق و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر ایک اپنا مناسب فرض ادا کرنے لگتا ہے تو فرد میں عدالت کی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔

فضائل ہی چار ہیں: حکمت و شجاعت، عفت و عدالت۔

اب انسان کامل کی روح میں کامل توافق، ہم آہنگی و ربط پایا جاتا ہے جس میں اعلیٰ کا ادنیٰ پر کامل اقتدار ہوتا ہے جس کی وجہ سے حکمت، شجاعت، عفت و عدالت کی صفات حسنہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ متجلی ہوتی ہیں، اور یہی صفات جملہ فضائل کا مبداء و منبع ہیں، تمام محاسن کا ان ہی سے ظہور ہوتا ہے! ان کا حامل انسان کامل ہے، اپنی قیمت کے لحاظ سے "دارلے دو جہان" ہے! گو کشتگان شہوت" کی نظر میں حقیر و صغیر ہی کیوں نہ ہو۔

پیشِ خلقاں خوار و زار و ریش خیز۔ پیشِ حق محبوب و مطلوب و پسند! (ردی)

انسان جسم و روح پر مشتمل ہے، جسم عناصر کثیر سے مرکب ہے اور روح میں کئی ملکات پائے جاتے ہیں، اس طرح انسان ایک کثرت ہے لیکن جب جسم کو روح کا تابع کر دیا جاتا ہے اور روح کے مختلف ملکات عقل کے منقاد ہو جاتے ہیں تو اب انسان میں ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے، ایسی

وحدت جس کی تکوین مختلف عناصر سے ہوئی ہے اور جو اپنا ظہور کثرت میں کرتی ہے۔ اسی لیے افلاطون کہتا ہے کہ کمال توافق، ہم آہنگی یا وحدت کا نام ہے اور مردِ کامل وہ مطرب (Musician) ہے جو گویا مختلف آوازوں کی ترتیب سے ایک دل فریب نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ دل فریب نغمہ توحید کا نتیجہ ہے؛ چونکہ حق تعالیٰ واحد میں لہذا کمال یا فضیلتِ عدالت افلاطون کے الفاظ میں "تشبہ با اللہ ہے۔"

اس وحدت یا کمال کا لازمی، ضروری قطعی نتیجہ مسرت ہے۔ روح انسانی کی فطری خوبی یہی کمال یا فضیلت ہے اور اس کا فطری نتیجہ مسرت ہے۔ انسانِ کامل ہمیشہ مسرور و شاداں ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لگد کو پ جہان سے بالکل محفوظ نہیں ہوتا؛ اس کے دوست و احباب اس کے ساتھ بے شرمی کا برتاؤ کر سکتے ہیں، وہ کورا نہ نفرت کا شکار ہو سکتا ہے، اس کو کشاں کشاں زندان میں جھونکا جا سکتا ہے، اور تازیانہ کی سزا دی جا سکتی ہے، وہ اپنے مصائب کا انجام سولی پر پا سکتا ہے، تاہم "عدالت کے سوا ہر چیز کو کھو کر وہ مسرور و شاداں ہو سکتا ہے! اس کی روح نغمہ الہی کی گونج سے ہمیشہ فرح و انبساط، ذوق و مستی کی حالت میں ہوتی ہے، وہ اغیار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

کیست زو بہتر بگوئے یہ کس تابداں دل شاد باشی یک نفس

من نہ شادی خواہم ہونے خردی انجہ می خواہم من از تو ہم نوی (ردی)

افلاطون کا یہ بیان حکمتِ ایمانی کی نظر میں اسی وقت کامل مانا جائیگا جب عقل کو بھی شرع کے تحت کر دیا جائے:

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے

جو عقل کا فلام ہو وہ دل نہ کر قبول (اقبال)

امام غزالی کا فلسفہ مذہب

کس لاپس پردہ قنارہ نشد وز سیرت در پینج کس آگاہ نہ نشد
 ہر کس ز سیر قیاس چیزے گفتند معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نہ نشد (غزالیؒ)

میری تحقیق کی رو سے (اور مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے) فلسفہ عقل و استدلال کے ذریعے کسی شے کی آخری و انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور فلسفہ اپنی موزوں ترین شکل میں تمام موجودات کی انتہائی ماہیت کو دریافت کرنے کی سعی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے برخلاف سائنس کا سارا تعلق عالم مظاہر سے ہے، سائنس واقعات تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے۔ عالم سائنس۔ مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ متعلقہ واقعات کو جن کی اس کو تحقیق کرنی ہو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل و ترکیب کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر ان کا اصدطفات کرتا ہے پھر پھر ان شرائط یا علل کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں ان کی یکسانیت عمل کا تعین کرتا ہے، یعنی ان کے قوانین عمل کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کر دیتا ہے اور یہاں پر اس کا کام عالم سائنس کی حیثیت سے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اس نے واقعات تجربیہ یا مظاہر کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا، ان کے طرز وقوع و طریقہ عمل کو سمجھا دیا، غرض عالم سائنس کا کام اس عالم شہادت سے ہے۔ اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر کی جانب لگی رہتی ہے، اس کی توجہ تجربات کی طرف ہوتی ہے۔ اشیاء کے باہمی ربط کو وہ دریافت کرتا ہے، ان کے پیش کرنے میں وہ خرم و احتیاط کا

یہ مقالہ نشر گاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔

کام لیتا ہے اور اس طرح وہ ان قوانین و علل کو معلوم کر لیتا ہے جن کے تحت عالم شہادت کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اس علم سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے اور کائنات کی تسخیر میں وہ کامیاب

ہوتا ہے!

عالم سائنس کے برخلاف فلسفی کو عالم غیب کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ مظاہر کے ماوراء پہنچ کر حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے، حقائق کے انتہائی علوم پر مطلع ہونا چاہتا ہے اس حقیقت کی اہمیت سے واقف ہونا چاہتا ہے جو انتہائی و آخری حقیقت ہے جو اشیاء کا باطن ہے، جو باوجود اشیاء میں شدت ظہور کے غیب الغیب ہے، جس کا علم انسان کے حواس و قیاس و ادراک و فہم و عقل کے لیے مستور ہے۔ اس غیب کے علم کی طلب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کی جستجو و طلب ہی نے اس کو حیوان سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کے تمام علوم و فنون، حکمت و فلسفہ اسی غیب کے یقین اور اس کی پیہم جستجو کا نتیجہ ہیں! اسی غیب کی یافت کی ترپ میں وہ تن کی پرورش کو بھی ایک حقیر و ذلیل عمل مترا دیتا رہا ہے!

لیکن جن غیبوں تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے وہ صحیح معنی میں غیب نہیں بلکہ ہمارے عالم شہادت ہی کے ذرا مخفی اور دور افتادہ گوشے ہیں جن کو محض اضافی یا اعتباری غیب کہا جاسکتا ہے! غالب نے اس حقیقت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے:

ہر غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جگے ہیں خواب میں
باقی اصلی اور حقیقی غیب یا "غیب الغیب" تک انسانی عقل اور ذرائع علم کی رسائی کسی کو بھی نہیں ہو سکتی! اقل انما الغیب باللہ (پارہ ۱۱، ص ۱۱) یعنی غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے کہہ کر قرآن اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے اور انسان سے اس علم کی قطعی نفی کر رہا ہے۔

تاریخ فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ میں ادعائی نظامات کے پیش ہونے کے بعد ہی جب غیب کے کلی یقینی علم کا فلسفیوں نے دعویٰ کیا تو ارتیا بیت اور لا اور میت نے ان کے ان بلند بانگ دعوؤں کی شدت سے تردید شروع کر دی اور انسانی علم

کو عالم شہادت ہی تک محدود کر دیا۔ ہیوم نے فلسفہ جدید میں نہایت قوت کے ساتھ واضح کر دیا کہ انسان کا سارا علم مظاہر ہی کی حد تک محدود ہے، کیونکہ اس کا دار و مدار ارتقاعات یا ان کی نقل "تصورات" پر ہے لہذا محسوس ہی کو ہم موجود کہہ سکتے ہیں اور غائب کا ہمیں کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ ہیوم کی ارتیابیت نے کائنات کو اس کے خواب ادعائیت سے جگایا اور جلگے کے بعد اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حقائق اشیاء کا علم نہ صرف یہ کہ اب تک انسان کو حاصل نہیں ہوا بلکہ عقل و استدلال کی راہ سے ہمیشہ کے لیے ناممکن الحصول پر حقائق اشیاء کو کائنات کی اصطلاح میں 'بواطن' (Noumena) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسانی علم اس کے مقابلہ میں 'ظواہر' (Phenomena) یا قرآن کی اصطلاح میں "عالم شہادت" تک محدود ہے! تاریخ فلسفہ میں غزالی ہی وہ اولوالعزم اور جلیل القدر فلسفی ہیں جنہوں نے وجدان حقائق کو پیش نظر رکھ کر عقل نظری کو علم وحی کے تابع کر دیا اور مشکوٰۃ نبوی سے اخذ نور کر کے کائنات کے متعلق وہ نظریہ پیش کیا جو گو "ماوراء طور عقل" (Supra-rational) ضرور ہے مگر قطعاً ظاہر عقل (Contra-rational) نہیں جس سے واقف ہو کر انسان اس صداقت کا قائل ہو جاتا ہے:

بہر کمال ان کے آشفنگی خوش است ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مہاش
 غزالی عقل و ایمان (جن کو جنون الہی سے تعبیر کیا جاتا ہے) حکمت و شریعت 'علم استدلالی و قبول ایمانی' کے وجدانات سے استفادہ کر کے ہمیں اس حقیقت الحقائق سے مانوس کر دیتے ہیں جن کے یافت و حصول کی تڑپ فطرت انسانی میں روز آفرینش ہی سے موجود ہے۔ اسی لیے محمدی ان کا فلسفہ سب سے زیادہ پسند ہے ہم اس مختصر تحریر میں ان کی اسی یافت کے چند روشن پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کر رہے ہیں۔

غزالی نے اہل عقل کی توجہ اس روشن حقیقت کی طرف منعطف کی کہ جو ہر انسانی

اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے بالکل سادہ پیدا کیا گیا ہے اور اس کو حق تعالیٰ کے لاتعداد عالموں کی ابتداء میں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس کو عالم کی خبر ادراک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ہر ادراک اس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ موجودات کے کسی خاص عالم کا علم حاصل کرے۔ سب سے اول انسان میں قوتِ لامسہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ موجودات کے بہت سے عوالم کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ مثلاً گرمی، سردی، خشکی، تری، سختی، نرمی، مگر یہ قوت رنگ اور آوازوں کے ادراک سے بالکل قاصر ہے۔ ہنگامہ رنگ و صوت اس کے لیے قطعاً معدوم ہوتا ہے! لامسہ کے بعد انسان میں قوتِ باصرہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ رنگ اور شکلوں سے واقف ہوتا ہے، عالم کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرتا ہے! پھر قوتِ سامعہ بیدار ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ آوازوں اور نغموں کو سنتا ہے اور کیف اندوز ہوتا ہے پھر انسان میں قوتِ ذائقہ پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مختلف لذتوں سے بہرہ یاب ہوتا ہے!

اب وہ عالمِ محسوسات کے دائرہ سے گئے قدم اٹھاتا ہے اور سات ساں کی عمر کے قریب اس میں قوتِ تمیز پیدا ہوتی ہے! یہ حالت اس کے اطوارِ وجود میں سے ایک طور ہے اور اس حالت میں وہ ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جو عالمِ محسوسات سے ماورا ہوتے ہیں! پھر وہ ترقی کرتا ہے اور اس حالت پر فائز ہوتا ہے جس میں اس کے لیے عقل پیدا کی جاتی ہے اب وہ واجب و محال، ممکن و ناممکن، جائز و ناجائز کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کا شعور اس کو پہلی حالتوں میں حاصل نہ تھا!

غزالی تبلائے ہیں کہ عقل کی سرحد کے ماورا ایک اور درجہ بھی ہے جس میں انسان کی دوسری آنکھ کھلتی ہے، جس کے ذریعہ وہ غیب کی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کے ادراک سے عقل ایسی ہی قاصر ہے جیسے قوتِ تمیز ادراکِ عقولات سے اور قوتِ حسِ مدركاتِ تمیز سے! اسی درجہ کا نام نبوت ہے!

بعض لوگ اس درجہ کے منکر ہیں، لیکن ان کا یہ انکار صین جہالت ہے اور اس انکار کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں کہ وہ خود اس حالت پر فائز نہیں ہوئے اور چونکہ ان کے حق میں یہ حالت کبھی موجود نہیں ہوتی اس لیے وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ حالت فی نفسہ موجود نہیں، عدم علم سے وہ عدم وجود کا استنباط کرتے ہیں! اگر اندھے کو متواتر روایت کے ذرا رنگوں اور شکلوں کا علم نہ ہوتا اور اول مرتبہ ان امور کا اس کے سامنے ذکر کیا جاتا تو وہ ان کو ہرگز نہیں سمجھتا اور ان کا کبھی اقرار نہ کرتا!

اہل عقل کا نبوت کے درجہ سے انکار ایک معنی میں جائز ہے۔ غزالی خود صراحت کرتے ہیں کہ "تصدیق تو ہمیشہ سمجھنے کے بعد ہوتی ہے" بغیر سمجھنے کے کسی چیز کی تصدیق سخت شوار ہے۔ اس لیے وہ نبوت کی خاصیت کا ایک نمونہ خود انسان کے تجربات زندگی ہی میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے روشن نمونے اور صفات مثال کے بعد انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، ذرا اس نمونہ پر غور کرو۔ یہ نمونہ خواب ہے۔ دیکھو خواب میں انسان کو بعض دفعہ ہونے والے واقعات کا صحیحاً علم ہو جاتا ہے یا تشبیل کی صورت میں ان کا انکشاف ہوتا ہے جو تعبیر کے ذریعہ سمجھ میں آجاتے ہیں (Veridical Dreams) اس بات کا اگر انسان کو خود تجربہ نہ ہو ہوتا اور اس سے یہ کہا جاتا کہ بعض وقت آدمی مردہ کی مانند بے ہوش ہو جاتا ہے، اس کی قوتیں حس، اس کی شنوائی و بینائی زائل ہو جاتی ہے اور غفلت و ذہول کی اس حالت میں اس کو غیب کا ادراک ہوتا ہے، وہ ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو یہ سن کر انسان اس کے مننے سے قطعاً انکار کرتا ہے، اس کو محال قرار دیتا ہے اور اس پر یوں دلیل قائم کرتا ہے کہ آلات ادراک تو قوتیں ہی ہیں جس شخص کو ان آلات کی موجودگی کی حالت میں ایسے واقعات کا ادراک نہیں ہو سکتا تو پھر ان قوتوں کے معطل و زائل ہو جانے کے بعد کس طرح علم ہو سکتا ہے، مگر اس قسم کے قیاس کی تردید کیا وجود اور مشاہدہ سے نہیں ہو رہی ہے؟ جس طرح عقل کے ذریعہ انسان کو وہ نظر حاصل ہوتی ہے جو تعلقات و تصورات کا مشاہدہ کرتی ہے جن کے ادراک سے جو اس بالکل قاصر ہیں، بالکل اسی طرح نبوت کے

مراد ایک ایسی حالت ہے جسکی وجہ سے ایسی نورانی نظر حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ امور غیب اور وہ امور جن کا عقل قطعاً ادراک نہیں کر سکتی ظاہر ہونے لگتے ہیں، لہذا
بند احکامِ عقل میں رہنا یہ بھی ایک نوع کی حماقت ہے (ورد)

ان فلسفیوں کو جو عقلیت کے پرستار ہیں اور عقل کے سوا علم و عرفان کے کسی اور ملک اور قوت کے قائل نہیں، نبوت کے درجہ کی خبر دے کر، اس کے واضح اور جاگرمونہ کو خود ان کے تجربہ میں مبتلا کر اور یہ ثابت کر کے کہ حقائق ایمان کی یافت میں عقل کی آنکھ اتنی ہی معتبر ہے جتنی کہ مادر زاد اندھے کی آنکھ رنگوں کے ادراک میں، اغزالی ارکان و حدود شرعی کی حقیقت کو مشکوٰۃ نبوی سے اخذ کر کے فلسفیانہ طریقہ پر اس کی جو تفہیم کرتے ہیں وہ بڑی دلچسپ ہے؛
زیر شہدیک انگشتِ سانسِ بخت از لذتِ اگر محو نگردی تفت کن

فرماتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے بنایا گیا ہے: جسم اور قلب۔ قلب سے مراد حقیقتِ روح انسانی ہے جو عرفانِ الہی کا محل ہے، نہ وہ گوشت و خون کا ٹکڑا جس میں مردے اور چارپائے بھی شریک ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے جسم ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے جسم کی صحت جسم کے لیے باعثِ سعادت ہے اور اس کا مرض اس کے لیے باعثِ ہلاکت۔ اسی طرح قلب کے لیے بھی صحت و عافیت کی ایک حالت ہوتی ہے اور مرض و تکلیف کی ایک کیفیت، جیسا کہ قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ *فَلَوْ يَهْتَدِ مَرَضٌ* (ان کے دلوں میں بیماری ہے) اللہ کا نہ جاننا زہرِ مہلک ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کر کے احکامِ الہی کو ترک کرنا اور معصیت میں مبتلا ہونا قلب کا سخت روگ ہے۔ اللہ کی معرفت اس کے لیے زندگی بخش تریا ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت اور احکامِ واو امر الہی کی متابعت اس کے لیے دوائے شافی ہے۔ جس طرح بدن کا علاج دوائے استعمال ہی سے ہو سکتا ہے اسی طرح قلب کے امراض کا معالجہ بھی دوائوں کے استعمال ہی سے ممکن ہے جس طرح حصولِ صحت جسمانی میں دوائوں کی تائید

کو عقلاء اپنی بصاعتِ عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس میں ان کو اطباء کی تقلید واجب ہے اسی طرح انبیاء نے امراضِ قلبی کے علاج کے لیے جو عبادتیں خاص حد و مقدار میں مقرر کی ہیں ان کی وجہ تاثر کا سمجھنا بھی عقلاء کی بصاعتِ عقل کے لیے ممکن نہیں، ان کو انبیاء کی تقلید واجب ہے۔ انبیاء نے ان خواص کو نورِ نبوت سے معلوم کیا ہے نہ کہ بصاعتِ عقل سے۔ نیز جس طرح دوائیں نوع اور مقدار سے مرکب ہوتی ہیں کہ ایک دوا دوسری دوا سے وزن و مقدار میں مضاعف استعمال کی جاتی ہے اور ان کی مقدار کا اختلاف حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اسی طرح عبادات بھی جو وقتاً ہیں امراضِ قلوب کی مختلف نوع و مقدار کے افعال سے مرکب ہوتی ہیں، مثلاً سجدہ رکوع سے دو چند ہوتا ہے، نماز فجر مقدار میں نماز عصر سے نصف ہوتی ہے! یہ مقداریں اسرار سے خالی نہیں اور یہ اسرار ان خواص میں سے ہیں جن سے نورِ نبوت کے سوا کسی اور کو آگاہی نہیں ہوتی! جو شخص طریقِ عقل سے ان امور کی حکمت کو جاننا چاہتا ہے یا ان کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ یہ محض اتفاقی طور پر مذکور ہوئے ہیں اور ان میں کوئی ایسا راز نہیں جو بطریقِ خاصیت موجب حکم ہوا ہو، وہ نہایت احمق اور جاہل ہے!

غرض انبیاء امراضِ قلوب کے طبیب ہوتے ہیں جن کے احکام کی تعمیل شفا کے قلبی کے طالبوں کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ شفا کے بدنی کے جو یا کے لیے امراضِ جسمانی کے طبیبوں کی ہدایتیں۔ اور عقل کا فائدہ صاف ظاہر ہے، اسی کے ذریعہ ہیں اس نکتہ کا علم ہوتا ہے! وہ نبوت کی تصدیق کرتی ہے اور خود کو ان امور کے ادراک سے عاجز پاتی ہے جن کو نورِ نبوت نے اور منکشف پاتا ہے! عقل ہمارا ہاتھ پکڑ کر اسی طرح نبوت کے حوالہ کر دیتی ہے جس طرح اندھوں کو راہبر اور متحیر مریضوں کو طبیبِ شفیق کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ عقل کی رسائی اور اس کی پرواز بس ہمیں تک ہے، اس سے آگے وہ قدم نہیں بڑھا سکتی! اب طبیب جو کچھ سمجھائے سمجھ لینا چاہیے، اور اس کی ہدایتوں پر کار بند ہونا چاہیے! اسی مفہوم کو حضرت اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

خرد سے راہِ روشن بھرے خرد کیلے بہ چراغِ رہگزر ہے!
 درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے؟ (ہاں جبریل)

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے مترل نہیں ہر (۷۷)
 جب عقل جذبات اور شہوات کے اثر سے بہک کر نورِ نبوت کا انکار کرتی ہے اور خود غیب کے
 دائرہ میں قدم زن ہوتی ہے تو اب اس کے ارشاداتِ عالیہ کی قیمت ان مستی کے انڈوں سے بھی
 گری ہوئی ہوتی ہے جو کبھی کبھی مرغی بغیر مرغ کے دینے لگتی ہے اور اس قسم کی عقل والے کی باتیں
 سن کر ہم کہہ اٹھتے ہیں :-

ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیر دے خروس
 یہ ہیں غزالی کی یافت کے چند روشن پہلو! وقت کی تنگ دامانی ہیں مزید تفصیل کی
 اجازت نہیں دیتی ورنہ

حسنِ غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
 بمیرد تہنہ مستقی و دریا ہچماں باقی!

تصحیح فکر

اے۔ اور تو ہیں اندیشہ مابقی استخوان دریشہ
گر گل است اندیشہ تو گلشنی در بود خاک تو ہمہ گلشنی (روحی)

افکار و خیالات ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے۔ مقاصد کو دارِ افعال و اعمال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے، جیسی سیرت ویسی قسمت، لہذا جیسے خیالات ویسی کائنات۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي نُبِيٌّ۔

یہ قانونِ ذہن کے دائرہ میں وہی صداقت و اہمیت رکھتا ہے جو قانونِ تجاذبِ دائرہ فطرت میں، قطعی و یقینی، جب سیرت اور قسمت کی تشکیل و تعین میں افکار و خیالات ہی کی کار فرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے افکار و خیالات کی اصلاح اُس کا اپنا تہا بیت اہم فریضہ ہے۔ قوم سازی اور فرد کی روح کی تکمیل اصلاحِ خیال پر منحصر ہے۔
یک تنقیہ دماغی باید کرد

مقاصد و غایات کا دائرہ ذہن انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت و غایت سے خالی نہیں ہوتا، اب مقاصد کا تعین غور و فکر، سوچ اور بچار پر منحصر ہے۔ فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے، اور ہی ان دنوں انسان میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ قوت ہے۔ اس کی تربیت ہی کے متعلق تجھے یہاں کچھ کہنا ہے۔

۱۵۔ یہ مقالہ "بزمِ فلسفہ" کا کرہ نشینی کے موقع پر مستایا گیا جو جامعہ عثمانیہ حیدرآبادہ کن کے شعبہ فلسفہ کی بزمِ مباحثہ ہے، اور "معائنہ" اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے اس کے لئے آپ کو چند قوانین پر عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہاں جائے، پھر اس جگہ کو مسطح اور خش و خاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر ہمیں پھولوں یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب کرنا چاہیے، اور اس عمدگی سے تیاری کی ہوئی زمین میں انہیں بونا چاہیے، ہمیں اس امر کا بھی خیال ہے کہ بیج عمدہ ہیں، ناقص نہیں، پھر موسم گرمیاں ان بیجوں کو پانی دینا پڑتا ہے، تاکہ شدتِ تمازت انہیں جلانہ ڈالے۔ اب ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وقت مقررہ گزر جائے اور بالآخر گل تر رونمائی کرے، اگر بے صبری سے ہم بیجوں کو کھود کر دیکھنا چاہیں کہ یہ جل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجوں کو نشوونما کا موقع نہیں ملے گا۔ بعض دفعہ ہمیں کچھ زیادہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم نے زمین کو خش و خاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کی، آبیاری کی ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ ایک دن زندگی نامن زمین چیر کر پودوں کی شکل میں جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانہ میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یاد دہاراں، آفتاب و حرارت بیجوں کے نشوونما کے لئے ضروری ہے، طوفان تک انہیں نقصان نہیں پہنچا سکے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کر رہی ہیں!

فرض کر دو کہ انتظار کی مدت بھلا اللہ گزر گئی، یا ایک بیجوں نے خوش رنگ و دل فریب لالہ یا سمن کی شکل اختیار کی، فطرت کا زبردست لیکن مانوس مہجرہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، شروع ہی سے ہم جانتے ہیں، اور یہ علم مرتبہ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزاروں یا سمن کیوں کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزوں کا اعادہ کرتا ہے جو اس پودے میں پائی جاتی ہیں، جس کا یہ بیج ہے، کیا اس بیج کو اصلی پھول کی نہ بھولنے والی صورت یاد رہتی ہے؟

پھول کی غایتِ تخلیق سے تو ہم واقف نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ ہمارے

دل کا سرور، آنکھوں کا نور ہے، کسی کے پاکیزہ الفاظ میں ہم اس کو "ربیع قلبی، نور بصری، جلا درحزنی" ذرا بھتی، کہہ سکتے ہیں!

باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہیں، کوئی بات نئی نہیں، لیکن میری دانست میں نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں، جو زندگی کہ فوج میں مستور ہے، وہی ہم میں سے ہر ایک میں موجود ہے، ان چیزوں کے حصول کے لئے ہمیں زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولوں کے بیجوں کی ہم نے کی تھی۔

دلفریب پھولوں کے لئے آپ نے خارج (عالم اکبر) میں باغ لگایا تھا، شادمانی و مسرت کے حصول کے لئے آپ کو باطن (عالم اصغر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محل وقوع ٹھیک کہاں ہے؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدان فکر" میں لگانا ہے، کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں ایک عظیم الشان میدان فکر موجود ہے جس کی وسعت کو ارض و سما نہیں پاسکتے، صرف ہمارا دل ہی اس کو سما سکتا ہے، افسوس ہے کہ یہ میدان خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے، یہ جانتے ہو کہ یہ خس و خاشاک کیا ہے؟ وہی سلبی افکار و خیالات جن کو مختصر طور پر شرانگیز، بد، غلط خیالات کہنا کافی ہوگا، واقفان راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہیں، ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہیے۔ اس راز کو سمجھنے کے لئے اس نفسیاتی قانون پر غور کرو، جس کا ہم نے ابتدا ہی میں ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اب یہ مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں، اعمال کی تکرار عاداتِ راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرت سولہ ان عاداتِ راسخہ کے منظم مجموعہ کے، کوئی اور چیز نہیں، اور ہماری سیرت ہی ہماری قسمت کا دوسرا نام ہے! سلبی خیالاتِ فاسد مقاصد کا

تعیین کرتے ہیں، انہی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادت بن کر سیرتِ بد کی تشکیل کرتا ہے، اب میکائی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات سے ہم سب واقف ہیں، درد و رنج، غم و اہم، رُین و یاس۔

میدانِ فکر کا سبلی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے، اور نیک خیالات کی تخم ریزی لازمی، سبلی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا زور مرد افگن ہوتا ہے، جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے، اب حیات (یا چشمہ حیات) کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں، اس کے استیصال کی خاطر سہی، تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رُخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اور اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اگر ہمیں بے خوابی کا مرض ہے، تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظِ دیگر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائے گی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بھول جائیں تو ہم ٹھنڈی نیند سو جائیں گے، اسی طرح شر کے مقابلہ سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہیے، ظلمت کا مقابلہ نور سے۔ ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہیے۔ ظلمت کا مقابلہ ظلمت سے کرنا "ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے۔ اگر تمہیں نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو، خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و بہت پر نظر جماؤ۔ خود غرضی کے بجائے ایثارِ نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمہیں غصہ کے بجائے حلم، بیماری کے بجائے صحت، کج خلقی کے بجائے خوش خلقی، شکایت کے بجائے صبر و شکر، حلق کی جہہ سانی

۱۵ احادیث میں خطرات و دسائیں کو دور کرنے کے لئے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترقیب دی گئی ہے۔ اوپر جو علاج پیش کر رہے ہیں اس کا استنباط ان کی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عیب الاثر نفسیاتی طریقہ ہے۔

کے بجائے ملازقِ مطلق کا خیال اپنے ذہن میں جمانا چاہیے، تمہارا معروضِ فکر جو ہوگا، رفتہ

رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے، یہی معنی ہیں جامی سامی کے اس قولِ بلیغ کے

گردید دل تو گل گذرد گل باشی ورنبل بے قرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است گردنے چند اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اس فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو، دنیا میں وہی چیز بُری ہے جس کو ہم بُرا

سمجھتے ہیں، اگر ہم اس کو بُرا نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے، لیکن وہ ہمارے

قلب کو چھو نہیں سکتی، یاد رکھو دنیا میں ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے، اور رائے تمہارے اختیار

میں ہے، جب چاہو رائے کو ترک کر دو، پھر اس ملاح کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمت دری

پہاڑیوں سے بچانکا لایا ہو تمہیں ہر طرف سکون نظر آئے گا۔ اگر تم اپنی رائے کو ترک کر دو، تو

پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی، کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا، اس شکایت کو ترک کر دو کہ ہائے

مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ عقلمند آدمی کی خوش قسمتی

یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں۔“

خیالات کا ماحول پر اثر ناقابل انکار ہے، خیالات کی سختگی اور قوت انسان کی روح کو

سخت جسمانی تکلیف میں بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا یعنی

خیال و فکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، ان ہی پر توجہ کو مرکوز

کرتا ہے، ان ہی کو ذہن میں دہراتا ہے، اُلٹا پلٹتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا

مملو ہوتی ہے اور یہی خیالات عالم آثار میں عمل کی عورت اختیار کرتے ہیں، خیال حقیقت ہے

عمل اس کا ظہور ہے۔ ولیم جیمس نے سچ کہا ہے ”زندگی کا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے ساری

مشکل ذہنی مشکل ہے۔“

میدانِ فکر کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو۔ بارغ کے

بجوں کی طرح خیالات کے انتخاب میں بھی حزم و احتیاط ضروری ہے، اور جس طرح بیج کو پوسے کی

شکل میں نمایاں ہوتے کچھ عرصہ لگا تھا، اور تمہیں انتظار کرنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب میں تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل میں ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے، تمہیں پست ہمت نہ ہونا چاہیے اور نہ رنجیدہ۔ اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے، جس دفاشاک کو صاف کیا ہے نیک خیالات کے بونے میں احتیاط برتی ہے، تو شانامانی، دسترت، طمانیت و بردِ قلبی، سرور و کیف وہ گلہائے شاداب ہیں جو نتیجہ کے طور پر تمہیں حاصل ہوں گے۔

ان حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتا ہے، کہ دنیا میں اس کا کوئی دشمن ہے تو خود اس کا نفس ہے، اعدایِ عدو لہ نفسک الّتی بین جنبتک البیہتی من حدیث ابن عباسؓ، اس لئے نہ وہ کسی پر ملامت کرتا ہے اور نہ کسی کی مذمت، بردِ قلبی کے ساتھ مخائبہ نفس کرتا ہے، صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید مرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بد یا سلبی خیال کو داخل ہونے نہیں دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً نیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے، اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حالِ نتیجہ ہے ماضی کا، قسمتِ نتیجہ ہے خیالات کا!

کامل گوید جہان تمام و اہل است ناقص گوید کہ کوتاہ است و اہل است
شطرنج ہماں عرصہ ہماں رخت ہماں ایں بردن و بافتن ز علم جہل است

(سحابی اسرآبادی)

احساس

جانا بقمار خانہ رندے چند اند بامردم کم عیار کم پیوند ند
رندے چند اند کس نداند چند اند برنیہ و نقد ہر دو عالم خندند
(محمود)

اس صداقت سے انکار مشکل ہے کہ 'احساس' فکر سے زیادہ عظیم قوت ہے جب حالت اضطراب میں ہم دلع کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں، تو دُعا کے الفاظ (افکار) نہیں، بلکہ وہ شدید احساس جو اُن افکار کے پیچھے ہوتا ہے زندگی میں تغیر پیدا کرتا ہے! اُن جذبات و احساسات ہی کی قوت کے بل پر ہم چیخ اُٹھتے ہیں۔

کوئین لا چو نعلین اندا ختم و رفتیم!
دیوانگانِ شاہیم رند برہنہ پائیم!

افکار کے ساتھ جب تک جذبہ و احساس کی آمیزش نہیں ہوتی، افکار و تعلقات میں قوت نہیں پیدا ہوتی، وہ بے جان ہوتے ہیں! ان میں گرمی ان ہی جذبات کی 'آتشِ درونی' سے پیدا ہوتی ہے! مجھے اس صداقت کا احساس ابتدا میں ایک بیوہ سے گفتگو میں ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "باوجود بے سرو سامانی کے میں کبھی فقر و قلت میں مبتلا نہیں ہوتی" اور اس کی وجہ اس نے یہی بتلائی کہ وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتی تھی، کہ وہ غنی ہے! یعنی اس کا ہمیشہ یہ یقین رہا، کہ "حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کیا غم، کیا کم!" ایک غنی مطلق کی معیت کا ادراک، اُس کے قلب کو غنا و بے نیازی سے بھر چکا تھا۔ اور اسی احساس نے فقر و اِقلال کو

اس سے دُور رکھا تھا!

حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:-

لَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَابًا

یعنی خدا کے قدیر سے قلت و فقر کے بارے میں ڈرو مت! اگر ہم اس علم صحیح کے بعد قلب سے خوف کو دُور کر لیں اور خود کو غنی محسوس کرنے لگیں تو ہماری تمام ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں اور ابتلا بچ رہتا ہے، کہ ہم انفاق بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہمارے قلب میں فقر کا خوف جاگزیں ہو جائے، تو پھر ہر اچھی چیز ہم سے بھاگنے لگتی ہے! عمل تر بھی خار خشک ہو جاتا ہے۔

یہی حال صحت کا بھی ہے۔ یا وجود بیمار ہونے کے اگر ہم خود کو تندرست محسوس کریں، یا طنی طور پر، تو بہت جلد ہم تندرست ہو جاتے ہیں! یا وجود بیمار ہونے کے تندرست کس طرح محسوس کریں؟ جواب یہ ہے کہ اگر ہم واقعی بیمار ہیں اور صحت قطعاً ٹوٹ گئی ہے تو ہمیں آرام لینا چاہیے اور دوسروں کو اجازت دینی چاہیے کہ ہمارا علاج کریں، لیکن اگر ہماری صحت محض خراب ہے تو تندرست محسوس کرنا تندرست ہونے کی حتمی تدبیر ہے! یہاں بھی یہ احساس کہ حق تعالیٰ "قوی" ہیں اور "سلام" ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ہیں، قریب ہیں، اقرب ہیں، محیط ہیں، ہمارے ظاہر و باطن، اول و آخر ہیں، ہمارے جسم و جان کو صحیح و تندرست رکھنے کے لئے کافی ہے، لیکن محض جاننا کافی نہیں، اس کا تحقُّق ضروری ہے۔ وہ احساس اور وجدان کی چیز ہے۔

تَعْقُلُ عَلَيْهِ حَيْثُ هُوَ اور وجدان قلب علیحدہ۔ تَعْقُلُ يَاعْقِلُ عِلْمٌ عَقِيلٌ ہے۔

روک ہے، مانع و حاجب ہے، اسی لئے عرفان حق کے لئے ہمیں محض عقلی علم کو ترک

کرنا پڑتا ہے۔ جب یہ علم ترک کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا آخری نشان
بھی باقی نہیں رہتا اور اس کی کامل نفی ہو جاتی ہے تو ہمیں سب کچھ مل جاتا ہے
اور ہم صحیح اٹھتے ہیں:

از کناہ خویش یا بم ہر دے من بوئے یار
چوں نہ گیرم خویشتن را ہر شبے اندر کناہ

(ردی)

صداقتِ مطلقہ کی یافت اُس وقت ہوتی ہے جب ہم تنقل کی سرحد عبور کر جاتے
ہیں۔ جب ہم علمِ اکتسابی سے دست بردار ہو جاتے ہیں تو ہمیں وہ دولت مل جاتی ہے
جو ہمیشہ سے ہم ہی میں موجود تھی! جب ہم 'فکر' پھوڑ دیتے ہیں تو ہم 'سیکینت' آگے
سمندر میں تیرنے لگتے ہیں۔ حضور و شہودِ حق! وجدانا و احسانا نصیبِ جان ہو جاتا ہے!
دولتِ قرب و وصال ہمیں حاصل ہو جاتی ہے۔

موج دریاے ہوس اینجا غبارِ سینہ است
گر شود این آب ساکن تختہ آئینہ است

(رد)

تنقل و تفکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کو پانے کی جب تک کوشش کی جاتی ہے، وجدان
قلب پر ایک غلاف "شدید و غلیظ" پڑ جاتا ہے، یہ علم کا "حجابِ اکبر" ہے، یہ حق کی
یافت میں سب سے بڑا حجاب ہے۔ جب ہم قلب کی سخت کوحی کی طرف کر دیتے ہیں، تو
حجاب اٹھ جاتا ہے۔ "آگاہی و حضور" بالمرن قلب کی اسی کشش و نگرانی کا نام ہے جو
ذوق و شوق، سرور و انشراح، جذب و مستی سے ہمیر ہوتا ہے! یاطن کی یہی حالت نہیں
بے کیف بلامرزا حمتِ خطراتِ غیر و خیالاتِ ماصولی بلکہ بلا امتیازِ اعتباراتِ صفاتیہ و
اسماویہ نہ مقام ہے جس کی بشارت "الذین یوصنون بالغیب" سے دی گئی ہے جس کو

متاخرین سلسلہ نقشبندیہ نے کمالات نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے! اب ہمیں کُل میں اپنا صحیح مقام معلوم ہو جاتا ہے! سیاراتِ سماوی کی طرح ہم اپنے محور پر گردش کرنے لگتے ہیں، کامل توازن و تواضع کے ساتھ! ہماری زندگی بے ساختہ دے تکلف ہو جان ہے جس میں ہر چیز اپنے صحیح وقت پر اور صحیح طریقہ پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ہمیں کامل سکینت و طمانینت نصیب ہوتی ہے اور ہمیں "قی جلیب اللہ" ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ذاتِ قیوم کا اسرار مل جاتا ہے اور ہم ساکن ہو جاتے ہیں یا رحمتِ حق کے سمندر میں تیرنے لگتے ہیں اور ہر جانب وجہ اللہ کا شہود ہونے لگتا ہے! ہر شے کو اپنے صحیح مقام پر ہر واقعہ کو اپنے صحیح وقت پر وقوع پذیر ہوتا پاتے ہیں۔

اس دولت کا حصول تعقل یا تفکر سے ممکن نہیں، یہ اور اے طور عقل ہے، عقل شاید درہی تک رہی کر سکتی ہے، اس کے بعد ہمیں وجدان و احساس کی مدد سے آگے قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ قرب و وصال کی نعمت کا اندازہ فکر و تعقل کے ذریعہ ممکن نہیں یہ صرف احساس و وجدان سے کیا جاسکتا ہے۔ "مَنْ ذَاقَ وَجْدًا، جَسَدًا، جَسَدًا، جَسَدًا" اسی کی پرورش ضروری ہے جو تعقل و استدلال سے بالکل مختلف چیز ہے۔

جوں جوں اس راہ میں قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں صداقت سادہ معلوم ہونے لگتی ہے! حق تعالیٰ کے عرفان کے لئے ہمیں زیادہ تر اس علم نظری کو ترک کرنا پڑتا ہے جو ہم نے ان کے متعلق حاصل کیا تھا، یہاں تک کہ ہر عقلی حکم کی نفی ہو جائے۔ جب اس طرح ہر شے کی نفی ہو جاتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں سب کچھ مل گیا! جو ہر جاں نذر کر کے ہم جاناں کو پاتے ہیں! ع

لعل تو چوں حاصل امرت جو ہر جاں گو مباح

عقل کے بتائے ہوئے وہ تمام بچیہ نظریات و رموز و اسرار جو ہم نے سیکھے تھے سب

”گو مباح کے حکم میں آجاتے ہیں، جب ہمیں حق کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو پھر حق کے متعلق سارے نظریوں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی! اب جس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے وہ صرف حضور و شہودِ حق ہے! اسی ”نسبتِ باطن“ کی تقویت ہے! حضور و شہودِ ذاتِ حق علی الدوام بلا ملاحظہ اعتبار کے از اعتباراتِ گرتیہ و مسرور و ملتذ بودنِ باطن بہ اس حالت جذب و کشیدگی دائمی الی اللہ علیٰ نبی بجمول الکلیفیت اس طرح کائنات کی قدیم گتھی حل ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات سے توصلِ تام حاصل ہو جاتا ہے۔ نظری و عقلی طور پر نہیں بلکہ عملی و واقعی تجربہ کی بنا پر!

ہر روز ہم اس مراقبہ کے لئے وقت نکال سکتے ہیں، ہم خدا کی عقلی تعریف کرنے کی کوشش نہیں کرتے، کیونکہ خدا تمام تعریفات سے ماوراء ہے۔ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ۔ ہم خدا کو عقل سے جاننے کی خواہش نہیں کرتے، ہم قلب کی گہرائیوں میں اُس کو پاتے ہیں یا انفس کی گہرائیوں میں اس کی سکینت کا احساس کرتے ہیں! جب ہم مراقب ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ کو ہم اپنے پاس ہی پاتے ہیں۔ إِنَّهُ سَمِجَانَهُ تَعَالَى هُوَ الْأَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ فِي الْوَجُودِ كَذَلِكَ فِي الْوَجْدَانِ۔

تجدنی فی سواد اللیل عبدی

قرباً منک فاطلبنی تجدنی

”رات کی تاریکی میں اے بندے تو مجھے اپنے قریب پائے گا، مجھے ڈھونڈے

مجھے پائے گا ضرور!“

میرا اندر شب تاریک یا بی

ز جانِ خویش ہم نزدیک یا بی

مرا نزدیک خود پیوستہ می دان

نمی دانی و گردانی بیانی

یا پھر جب ہم "مراقبہ" میں خاموش بیٹھتے ہیں۔۔۔ خاموش، اشخاص و
 تعینات سے نظر قلب کو ہٹا کر ماسوائے سے قلب کا تخلیق کر کے، حق سبحانہ تعالیٰ
 کی ذات کی طرف توجہ بے جہت لگا کر نو ہمیں "توحیدِ محمدی" و توحیدِ مطلق کی
 حالت نصیب ہوتی ہے اور مبداءِ فیاض سے فیوض و برکات کی بارش ہونے
 لگتی ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارا مادی جسم تحلیل ہو رہا ہے اور
 ہم روح مجرد بن رہے ہیں! تمام مذاہبِ حقہ کا یہی مقصود ہے۔ مادہ ہے روح
 کی طرف عروج، زمانی و حادث سے سرمدی و لازمانی کی طرف صعود! اسم۔ رسم
 سے گذر کر، نام و نشان سے چھوٹ کر نبلہ تو بہ تنزیہ مطلق و غیب صرف کو قرار
 دینا اعلیٰ ہمت اسی کا نام ہے اور بلند ہمتی حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہے
 إِنَّ اللَّهَ يَجِبُ مَعَالِيَ الْإِهْتِمِ! کیا خوب کہا ہے کسی نے:

آن لقمہ کہ در دہاں نہ گنجد طلبم

کیونکہ مقصود 'وصول' ہے نہ کہ 'حصول' اور مطلوب 'قرب' ہے نہ کہ 'ادراک'

رستم نابدا این غنقا بدامم

تنید نہائے دامش را غلامم

کے لاگر پھہ برگ این سفر نیت

بہ از سود لے او چیزے دیگر نیت

دو دن صورتوں میں، خواہ ہم وصول محکمہ قابل ہوں یا حصول کے 'قرب' کے قابل
 ہوں یا ادراک کے۔ اکابرِ دجودیہ کے پیرو ہوں یا اکابرِ شہودیہ کے، صورت حال
 مادرکے طور عقل ہے، وجدان قلبی کے دائرہ کی چیز ہے اور ہر وقت قلب کا نیاز و
 شکر کے ساتھ ذاتِ الہی کی طرف متوجہ رہنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ توجہ
 الی اللہ بے مزاحمت و خاطر ملکہ بن جائے اور یہی صوفیہ کی اصطلاح میں "حضور" کہلاتا

ہے، ذکر کا مقصود یہی حضور ہے! زندگی کا اصل مجاہدہ یا 'کوشش' یہی ہے، اس کے ساتھ 'کوشش' کی امید لگی رہے!

در کریم سے مایوس و ناپسند ہے۔

عاشق کہ شد یا رہی بالمش نظر نہ کرد

لے خواجہ درویش و گریز بعبیت

حضور کا کام ادا کرنے فرانس و سنن ہو گدہ کے بعد ذکر و مراقبہ کے سوا کچھ نہیں یہاں تک کہ حضور کا بلکہ حاصل ہو جائے اور اس کے نتیجے کے طور پر "فنائے نفس" اور تہذیب اخلاق سے وہ مشرف ہو جاتا ہے اور 'اخلاق اللہ سے تخلیق'!

"فنائے نفس" اصطلاح سلوک ہے جس کا مفہوم 'حالتِ اطمینان' ہے ورنہ نفسِ ناطقہ ہرگز فنا نہیں ہو سکتا، شریعت کی اصطلاح میں یہی حالت "الطمینانِ نفس" کہلاتی ہے اور "نفسِ مطمئنہ" اپنے رب سے یا نبی و مرضی ہوتا ہے، وہی عیدِ کامل ہے اور دخولِ جنت کی اسی کو بشارت دی گئی۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ الْحَسْبَىٰ إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مُّرْضِيَةً فَإِنَّ مَنِيًّا
فِي عِبَادَتِي وَإِذْ خَلِيًّا جَنَّتِي. (عم، ۱۳)

تکے نفسِ مطمئنہ اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

خوب سمجھ لو کہ تمام سیر و سلوک کا حاصل، زندگی کا مقصود تھا سو فی اللہ کی گرفتاری سے دل کا آزاد ہو جانا ہے، دوامِ حضور و شہود کا میسر ہونا ہے، تاکہ اس کے نتیجے کے طور پر صبر پر بلا، بقا بقضا، تحملِ مکر و ملت کی قوتِ قلب کو حاصل ہو جائے اور مشہیاتِ نفسیہ سے وہ رُک جائے۔ جب یہ دولت حاصل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے، کہ تمام مقامات و مراتب

حاصل ہو گئے۔ اب ہم اپنی زندگی طمانیت و سکینت سے بسر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

جَدائی مبادا مرا از خدا

دگر ہرچہ پیش آیدم شاندم

(پہلوان محمود)

قانون تجاذب

اور تعمیری سیرت

بدی کنی و نیک طبع می داری ہم بد باشد ہنر کے بد کرداری
 با آنکہ خداوند کریم است و رحیم گندم نہد بار چو جو می کاری (ردھی)

قانون تجاذب (LAW OF ATTRACTION) ذہنی یا روحانی زندگی کا ایک ضروری کلی اور عالمگیر قانون ہے، نہ اس کی ضد قابل تصور ہے اور نہ اس کا کوئی استثناء ہے۔ کون شہہ کر سکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلت پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیر اثر ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر مائل ہوتی ہیں اسی لیے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے، قانون کی صداقت کا توہر کوئی قائل ہے لیکن یہاں اس کے بعض تصنیفات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے۔

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مماثل خیالات کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور ان کے درمیان امتیلاف یا وابستگی ہوتی ہے، اسی طرح بد، سلی اور شرانگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں، تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے، اب اس کو بخوشی دہر دہر کے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیری قوتوں کو مرکوز کرو، مماثل خیالات کا حضور شروع ہو جائے گا، رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہو جائیگی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگیگا اور تمہارے ذہن کی فضا

ان سے مملو ہو جائیگی، جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار و خیالات پر قابو پیدا کر لیا ہے وہ اس قانون کو تعمیری طریقہ سے استعمال کرتے ہیں اور دنیائے اپنی قوتِ فکری کا لوازمات ہیں!

دیکھو مصنف کسی خاص موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے، ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے، وہ رات دن اسی میں غرق ہوتا ہے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں افکار و تصورات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے، اور نامعلوم دنیا قابلِ علم منبع سے خیالات کا چشمہ اُبلنے لگتا ہے اور جب تک یہ حالت نہ ہو مصنف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا!

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لیے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے، انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے، قانونِ تجاذب کا غیر مرنی عمل مماثل تصور آتا ہے، ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے، ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے اور نظام بھی، یہ سب مبدئاً معلوم سے پیدا ہوتے ہیں، اور مقرر کا ذہن ان کی قیام گاہ ہوتا ہے! یاد رکھو کہ مفکر تصورات کا خالق نہیں حامل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا، وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر اس کو خیالات و افکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، یہ عطا ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

قانون کے نغمہ و تعبیر سے واقع ہونے کے بعد حصولِ مسرت اور تیز کیفیٹس باسیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو، اس کی توضیح میں ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کریں گے۔ فرض کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا، اب بجائے اس کے کہ تم اس کو قبول کر لو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو، اور ذہن کو مماثل وسوسوں اور وہموں کا آئینہ بنا لو تمہیں چاہیے کہ اس وہم کی نفی کرو اور وہ اس طرح کہ مبدئاً علم کی طرف فوراً متوجہ ہو جاؤ، یعنی حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے لیکن

پوسے اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو،

حَصَّنْتُ نَفْسِي بِالْحَيِّ الْقَيُّومِ الَّذِي لَا يَمُوتُ ابَدًا وَدَفَعْتُ عَنْهَا السُّوءَ عِبَادًا
الْفِ لِحَوْلٍ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ

یایوں کہو "میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور آفتوں سے محفوظ و مامون" ان الفاظ کو پکار کر کہنے کی ضرورت نہیں محض ذہنی طور پر یہ کہے جاسکتے ہیں جو شخص اس طرح سلبی خیالات کو ذہن میں اُترنے اور اپنی جگہ بنانے سے روکتا ہے، اور قانونِ تجاذب کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے عمل سے ان سلبی، فاسد اور تباہ کن تصورات کی تعداد میں اضافہ کرے اور قلب کو خوف و ہراس سے بھر دے، بلکہ اس کے برخلاف اپنی حقیقت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصورات کو اخذ کرتا ہے جو قانونِ تجاذب کے عمل سے ہر آن زیادہ ہوتے جلتے ہیں، ہر دم نئی طاقت حاصل کرتے جلتے ہیں، قلب کو قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے ہیں، اور و فور قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں، صحت کو درست کرتے ہیں، ماحول کو خوش گو اور طریقہ سے بدل دیتے ہیں، موافق مرام نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں، یاد رکھو بیماری کی اصلی علت ذہنی ہوتی ہے، کیونکہ اگر ہم جراثیم کے نظریے کو بھی مان لیں تو بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر اس قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (POSITIVE) ہوتا ہے یعنی جو خود کو سلبی خیالات کا بازی گاہ نہیں بناتا جو ہر دم و ساوس اور ہوا جس کی تھی کرتا ہے، اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدل یعنی اپنی حقیقت کو کسی آن فراموش نہیں کرتا، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ شکار کیسے ہو سکتا ہے؟ بیماری طبیعت کی

لہ میں نے اپنے نفس کو محفوظ کیا اس ذات پاک کی مدد سے جو حقی اور قیوم ہے اور جو کبھی نہیں مرتی اور اپنے نفس سے بڑائی کو دور کیا، اسی کی حول و قوت سے۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں ضروری نہیں کہ ان ہی کا استعمال کیا جائے، ان کے بجائے کوئی اور موزوں الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

مذہبی سے پیدا ہوتی ہے، طبیعت اگر قوی ہو تو سب سے بیماری کا وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا نہ ہونا ہی عجیب ہے، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے، سلبی خیالات منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضا کو مضحمل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں، اور اسی لیے ان کو ایجابی و ثبوتی تصورات سے بدل دینا چاہیے ایجابی افکار کا سبب حق تعالیٰ ہیں، جوں ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رخ کیا، گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آئے، اب روشنی کی کرنیں اہستہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، مضحمل اعضا میں توانائی آتی ہے، قلب و جگر تازہ دم ہو جاتے ہیں، کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے صحت کے حصوں کے لیے اور اس کے قیام و بقا کے لیے اس قطعی و حتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو۔

قانون تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو، تم پر کسی نے زیادتی کی ہی تمہارا ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے، تمہیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے، اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں کو مرکوز کر دیتے ہو، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے مثال خیالات کا هجوم قلب پر ہونے لگتا ہے، یہ تار یکپا اندوہ خیز، زہریلے خیالات جو قانون تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں، تمہاری سیرت فنا ہو جاتی ہے، تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے، اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے، آتش انتقام کا سوختہ فاتر دماغ اگر انتقام پر اترے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً مسرت و طمانیت قلب کے لیے مفید نہیں ثابت ہوتے۔

مرغ پرنارستہ چوں بہاں شود لقمہ ہر گربہ راں شود معنی

اب اگر تم دعاً اذہم و توکل علی اللہ (پہ ۳۶) پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کیے دیتے

ہو اور اپنے خیالات کی رو کو بدل دیتے ہو، سلبی خیالات کی بجائے ایجابی افکار کے قبول کرنے کے

لے چھوڑو، ان کا ستانا اور بھروسہ کرنا بند کرنا۔

لیے تیار ہو جاتے جو تو تمہیں ان تمام شرانگیز و فتنہ خیز نتائج سے نجات مل جاتی ہے، اور اب تجاذب کا قانون تمام اچھی چیزوں کے رخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے، اب تم کو حقیقی معنی میں حریت نصیب ہوتی ہے، طمانیت حاصل ہوتی ہے، ہمسرت میسر ہوتی ہے، کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غضب سے پاک کیا، ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا اور تمہاری ہستی کا ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا، اسی لیے تو کسی عارف نے کہا ہے :-

عالم تمام یک گل بے خاری شود! دل را اگر ز کینہ بصفا کند کے
 ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا رد عمل، ہر علت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلی اور ضروری ہے، اب کینہ و غضب کے جذبات کا لازمی و جبری نتیجہ غم و حزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اسی طرح عفو و احسان و رحمت، کرم، صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت و طمانیت تھاقت و الفت، فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ علیت کے اس کلی عالمگیر، وجوبی و لازمی قانون پر یقین ہو جائے تو اَحْسِنُ اِلٰی مَنْ اَسَاؤَ لَیْکُمْ عَلَیْکُمْ کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر تمام المعروفت کے سریلے نغموں میں یوں کرتے ہیں :

ہر کسی درواہ من خلکے نہد من گل بنم! او سزائے خار یا بدن جزائے گل برم
 یہ سن کر اور ماں کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو، کیا یہ میرے بس کی بات ہے، میں بہر حال بشر ہوں اور فطرۃ مائل بہ شر ہوں، فطرۃ ظلم ہوں، جہول ہوں، قلت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں، ان صفاتِ عدمیہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جاسکتا ہے، ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے کہ
 پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے! (غالب)

لے جس نے تمہارے ساتھ بُرائی کی ہے اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو اور ہم تمہیں ایک نفسیاتی طریقہ بتلاؤں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہوگی۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہنچا ہے، اور جس کے خیال سے تمہارے بدن میں سوزش ہوتی ہے اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لیے تمہیں چاہیے کہ کچھ دن اس صداقت پر غور کرو۔

وَمَا آصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ اَوْ تَمَّ كَوْجُوهٍ مَّصِيبَةٍ يَنْخَبِطُ بِهَا تِلْكَ اَيُّهَا
فِي مَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (سورہ بقرہ ۱۷۷)

تو اللہ درگزر ہی کر دیتا ہے۔

نیز انما ہی اعمالکم ترد علیکم ^{واللہ} یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹنے جاتے ہیں
ذرا سوچو اصل میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا
کمایا ہوا ہے، اور اسی کے عین کا تقاضا یہ ہے کہ کسبتا و فوک نفخ۔ دوسرے کو اپنے افعال
کا ذمہ دار قرار دینا تمہاری عقل کی کجی اور جذبات کی خامی کی دلیل ہے، جوں جوں تم اس
صداقت پر غور کرتے جاؤ گے تم پر واقعات کھلتے جائیں گے، اور ہر آفت، ہر مصیبت کی علت تم
اپنی ہی حماقت کو پاؤ گے! اگر سلسلہ تفکر کو چند روز جاری رکھو گے تو حقیقت اس قدر
مبہین ہو جائیگی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری تھی کسی دوسرے کی نہیں اور حق تعالیٰ کی
طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ لِّلْعٰلَمِيْنَ
ہرچہ بہت از قامتِ ناسازی اندامِ باست ورنہ تشریف تو ہر بالائے کس کوتاہ نیست
اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے
کے قابل ہو جاؤ گے۔

۱۔ تیرے ہاتھوں نے کیا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے۔

۲۔ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اگر تم جذباتی انسان ہو عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے اور مذکورہ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے :-

جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی نظروں کے سامنے لے آؤ اور اب اس کو مخاطب کر کے کہو " میں تمہیں (نام شخص) حسبہ اللہ پوری طرح معاف کرتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نورانی کر دیں، آمین"

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل و خلوص دل کے ساتھ کرتے رہو تو کچھ دن رتہ میں یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ تمہارے لیے اس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو ہیں، اپنے اس مجاہد سے اگر تم نے حسن خلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفا کے بادہ ان سے دفائی، رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنایا، اور ان کے لیے بخشش و عفو کی دعا کی، تو اب حقیقی مسرت، طمانیت، سکون، برد قلبی، محبت، وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطیہ کیے جائیں گے، اور وہ تمہیں بطریق اجتناب اپنی جانب کھینچ لینگے۔

راہ بسیار است مردم را بسوئے حق و لے

راہ نزدیکش دل مردم بدست آوردن است

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ، مِثْلُ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ

رپ ۱۷۴

لے بیشک یہی بڑی مراد منی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں محنت کرنے والے۔

قرآن اور سیرت سازی

مشنیت کے تحت علی حصار تا آنکہ نہ شاہانہ مزاجے دارد

یعنی کہ خروس پیش از باب شعور سلطان نشود اگر چه تلجے دارد (درد)

دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شے، سب سے زیادہ گران قدر اور عزیز شے، پاک سیرت ہی زندگی تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ مڑی و معلم ہیں، واقعات و حادثات وہ آلات و ادوات ہیں جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت کی تکمیل کر رہے ہیں، دنیا کی ”روح ساز“ وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت ہی کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، زندگی کی غایت ہی یہ نظر آتی ہے کہ سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے، کیوں اس لیے کہ سیرت ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، سیرت ہی پر فوزِ آخرت کا مدار ہے، دنیا و دنیا کی اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے، سیرت ہی پر جسمانی اور روحانی صحت مبنی ہوتی ہے، اور برد قلبی اور طمانیتِ خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے، بنی آدم کا ”اکرام“ سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو انسان پاک سیرت نہیں وہ صورتہ گوانسان ہے، لیکن حقیقتاً وہ حیوان ہے، یا دیو ہے یا غول ہے، ”شیاطین الانس“ میں اس کا شمار ہے، وہ دنیا، دین اور آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے!

سیرت، علمائے نفسیات کی باریک میں اور دور رس نگاہ میں ان یقینات، عادات، میلانات کا مجموعہ ہے جو فرو کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دوسروں سے متمیز کرتا ہے، اور اس کی وحدتِ کردار کا باعث ہے، ہر فرد دوسرے فرد سے متمیز ہوتا ہے، صورت اور

لے یہ مقالہ سعادت میں مارچ ۱۹۳۳ء میں اول مرتبہ شائع ہوا۔

سیرت میں، صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کی جاسکتی، اور نہ کوئی اس کو رفع کرنا چاہتا ہے، لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہو سکتی ہے، یہ مماثلت عینیت نہیں انفرادیت ناقابل انکار ہے، باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے، اور اس انفرادیت کا سبب اور اس کے وہ اقتضارات و قابلیتات ہیں، جو اپنا ظہور عادات و افعال میں کرتے ہیں اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے، اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرد کے افعال کی پیشین گوئی ممکن ہو جاتی ہے۔

سیرت کی تحلیل میں ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ عادات کی تنظیم کا نام ہے عادت کی تشکیل افعال کی تکرار سے ہوتی ہے، افعال کا صدور و بظاہر محرکات پر مبنی ہوتا ہے، لیکن محرکات کا ماخذ و منبع وہ تیغناات و اذعانات ہوتے ہیں، جو انسان زندگی کے تجربات ماحول کے اثرات، تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ علم یقین عمل و عادات یہ وہ اہم عناصر ہیں، جن میں سیرت کی تحلیل کی جاسکتی ہے، سیرت سازی کے طریقے کو جاننے کے لیے ہمیں ان ہی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی۔

(۱) علم یقین: العلم یقیناً، سیرت سازی کے لیے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجالی علم کافی ہے، پھر عقلی طور پر اس کی تفصیل و توضیح میں دقت رنگے جاسکتے ہیں۔

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است تعلیم کن گرت بدیں دسترس است
گفتم کہ الف، در گفتم بیج در خانہ اگر کس است کجرف بس است

(شیخ عزیزالدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی، حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے، اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشید عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے، اس اقرار کے تصمنات پر غور کرو، جب میں ایمان و اذعان کی شاہد قوت سے حق تعالیٰ کے الہ ہونے کا اقرار کرتا ہوں تو سب سے پہلے میں بیان

رہا ہوں کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہیں، عبادت کیا ہے، غایت
 تذلل کا نام ہے، اظہارِ ذلت کا نام ہے، میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے تو بس میرے قائل،
 میرے مولیٰ، میرے مالک و حاکم ہی کے سامنے جھک سکتا ہے، اور غیر کے سامنے ہرگز
 نہیں جھک سکتا! اظہارِ ذلت کی وجہ کیا ہے؟ میں فقیر ہوں محتاج ہوں، میرا معبود غنی ہے
 قوت و اقتدار سے متصف ہے، علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، مستعان
 ہے، مدد کرنے والا ہے، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہارِ ذلت کرتا ہوں اور
 جانتا ہوں کہ سارا عالم فقیر ہے، اور میرا معبود ہی صرف غنی و حمید ہے، میں اس کا فقیر ہو کر سارے
 عالم سے غنی ہوں، میرا یہ احساس کہ میں اس شہنشاہ کا در پوزہ گر ہوں، جس کے در پوزہ گر سائے
 شاہ و گدا ہیں، مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں کفی باللہ و کیلا کہہ کر عبادت
 و استعانت کے فقط نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہوں، اور فقر و ذلت یا بندگی کی
 نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں، اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لیے امیدوار
 کامرگز بن سکتی ہے، اور نہ خوف و ہراس کا سبب، ان سب کا فقر، ان سب کی ذلت و مجبوری،
 بیچارگی و بے بسی میری نظروں میں اتنی ہی آشکارا و ہویہا ہو جاتی ہے جتنی کہ خود میری سبکی و مجبوری
 ہم سب عبد ہیں، کوئی چیز اصالۃً ہماری نہیں، فقر ہماری ذاتی صفت ہے، امانت چند روز
 کے لیے چند چیزیں ہم کو دی جاتی ہیں، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھتے ہیں، حقیقی مالک کو بھول جاتے
 ہیں، انہی کی محبت میں فریقتہ ہو جاتے ہیں، حقیقی اقدار سے غافل ہو جاتے ہیں، ناگہاں یہ
 طلسم ٹوٹ جاتا ہے، اور یہ ساری محبوب و مرغوب چیزیں موت ہم سے چھین لیتی ہے، اور پھر اپنے
 اصلی فقر و ذلت کے ساتھ ہم نادم و پشیمان اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے
 اعمال کے اثرات کو، اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثار و عواقب کو جو اس دنیا میں
 بھی اپنی موجودگی کا مختلف رنگوں میں ہیں احساس بخش رہے تھے، زیادہ نمایاں زیادہ واضح
 اور جاگرتہ سے دیکھیں، اور حسرت و ندامت کی آگ میں جلیں۔

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، جن کے آگے یہ میرا سر جو سارے جہان کے مقابلہ میں معزز و مغتخر، بلند و بالا ہے، فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے اور حیات و علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی استدعا کر رہا ہے، اور غیبر متزلزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے کہ جو اس کی آنکھ چاہے جو تماشاد کھلائے، اور وہم چاہے جو مانے اور منوائے، یہ ساری نعمتیں حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں، ان کے سوا نہ کسی میں حول و قوت ہے اور نہ فعل و اثر و مابیکہ **مِنْ نِعْمَتِهِ فَمِنْ اللَّهِ**! صورتوں سے جو ہم نے امیدیں باندھ رکھی ہیں، صورتوں کو جو ہم نے خوف کی چیزیں سمجھ رکھی ہیں، صورتوں کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہیں، اور صورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، اور ان کو رب بنا رکھا ہے، کیس قدر عظیم الشان دھوکا ہے، اس کے ضرر و اضلال کا پہلو کس قدر قوی ہے۔ عزتِ نفس کی خونریزی کو دیکھو، اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو، اس کذب و افتراء کے نتائج پر غور کرو، فقیروں کے در پر سوال کرنے سے بھی کچھ ملتا ہے، اس غریب کے ہاں کیا رکھا ہے جو دوسروں کو دے۔ امیدوں کا خون ہونا لازمی ہے، حسرت و حرمان قطعی، جو بیچارہ اپنے درد ڈکھ کو دفع نہ کر سکتا ہو، وہ تمہارے درد و غم کا کیا علاج کر سکتا ہے، وہ تمہارا مولیٰ و رب کیسے ہو سکتا ہے، ہاں تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کر دیا ہے، بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کر رہے ہو، زندے کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوئے ہو! تمہارے وہم نے تمہیں کس انتباس میں مبتلا کر رکھا ہے!

بقول دشمن پیمانِ دوست، شکستی بسیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی!

معبود و مستعان صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی سے ہیں جو بڑنا چاہیے، وہی ہماری امیدوں کے مرکز ہیں، ان ہی کی ناراضی سے ہمیں خوف کرنا چاہیے، اور چوب و سنگ یا گوشت و پوست کے جھوٹے خداؤں سے بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لینا چاہیے، ان سے نفع و ضرر کی توقع قطعاً چھوڑ دینی چاہیے۔

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشیا
بگذرا ز خدائے کہ بصد رنگ تراش

حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت پر یقین، یہ ایمان سیرت کا سنگِ بنیاد ہے، اسی یقین کی پرورش ہونی چاہیے، اگر باطلہ کی نفی، اگر حق کا اثبات قلب کی گہرائیوں میں متکون ہو جائے تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہو، رگوں میں خون کی طرح دوڑ جائے، علم یقین کے مرتبہ سے گزر کر حق یقین کے درجہ تک پہنچ جائے، متحقق ہو جائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے، جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کر سکتی، وہ بھولے نخلقوا باخلاق اللہ خلق الہی سے مزین ہوتا ہے، تمام صفاتِ رذیلہ سے پاک اور تمام اوصافِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے، کامل عبد ہوتا ہے، جس سے بہتر جس سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شے نہیں ہوتی!

توحیدِ معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہیں اور تحققِ عبادت کھڑتے ہیں، ہمارا سر حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے جس کے لگے ساری کائنات سرنگوں ہے، طوعاً و کرہاً اور توحیدِ ربوبیت کی رو سے حقیقی خالق حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں وہی خالق ہیں، وہی نافع و ضار ہیں، وہی زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے، اور انہی سے ہم مدد و اعانت کے لیے درخواست کرتے ہیں! غنی کی فقری ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے!

دیکھو توحیدِ معبودیت و ربوبیت کا سبق ہے کہ عرب کے اُمّی معلم (فداہ ابی و احمی) نے اپنے متبعین کو صفاتِ رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفاتِ حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا، صفاتِ رذیلہ جن سے تمام ملکِ اخلاقِ قلوب کا تزکیہ چلہتے ہیں، اس رباعی میں یوں ادا کیے گئے ہیں:-

خواہی کہ دلت مشور صاف چو آئینہ وہ چیز ٹبروں کن از درون سینہ
حرص و حسد و بغل و حرام و غیبت کذب و غضب و کبر و ریا و کینہ

دیکھو ان صفاتِ قیمہ سے قلب کا تزکیہ سقراط کے "طنزیات" افلاطون کے "مکالمات" ارسطو کی "اخلاقیات" اور جدید فلسفیوں کے عالمانہ "خطبات" کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لادالہ الہ اللہ کے مختصر جملہ کو ملنے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہے، خود ہی کو اس کا مالک جانتا ہے، نہ حرص کا اس کے قلب سے تسلط اٹھ سکتا ہے اور نہ بخل و حسد کا، جون ہی اس نے بچے دل سے توحید فی الآتار کا اقرار کیا، اور یہ مان لیا کہ لہ ما فی السموات و ما فی الارض و ما بینہما، اللہ ہی کے لیے ہے سارے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، تو اس نے اپنی مالکیت و حاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت و حاکمیت کا اثبات کیا، حقیقی مالک و حاکم و متصرف حق تعالیٰ کو جانا، اور اپنی ذات کو محض "امین" سمجھا، اب اس کی سمجھ میں یہی آ گیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، امین امانت کے شرائط کے تحت ہی تصرف کا اختیار رکھتا ہے، اب اگر دولت پر جو اس وقت اس کی امانت میں ہے، کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے، اگر بچ نہ سکے تو جانتا ہے کہ مالک حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے، اور خوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح نہ اس کے جانے والے کا اس کو سنج ہوتا ہے، اور نہ اس کے آنے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اختلال پیدا کرنے والے تاثرات سے پاک اور آزاد رہتا ہے، اور وہ ۶۰:

یک دل دلے بس است یک دوست ترا

کہہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، اور ایک دم رنج و غم، پریشانی و شیمانی کے تمام احساسات و جذبات سے حقیقی معنی میں نجات حاصل کر لیتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

لکیرا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا تاکم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ آیا اور شیخی نہ کرو

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حرص کیسے ہو سکتا ہے، جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے، اور ان احمقوں کو جو اپنی ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں، محتاط کر کے کہتا ہے:-

گماں مبرکہ زرو سیم دادہ اند ترا ودیعتے است کہ داری بدست روزے چند
 چه سو گر لشبوی عنتره بر متلع کے چویش بر سردکان رود شاخرسند
 حرص کے ساتھ بخل و حسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں، جب مال و دولت و دیعت و امانت ہیں اور وہ بھی چند روزہ امانت، موت کے وقت یہ ہم سے واپس لے لی جاتی ہیں، اور دوسروں کے حوالہ کی جاتی ہیں، تو پھر اس علم کے بعد ہماری ذہنیت اس چوہیا کی طرح کیسے رہ سکتی ہے جو بیسے کی دکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک و متصرف جان کر بخل و حرص کا شکار بنتی ہے، غیر کے مال میں بخل بے معنی ہے، بخل ہوتا ہے اپنے مال میں مال اپنا نہیں، پھر بخل کیسا؟ حرص کی بنیاد ہی اس خیال پر قائم ہے کہ مالک ہم ہیں، حقدار ہم ہیں، ہم کو نہیں مل رہا ہے، دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے! جب مال میرا ہے نہ تیرا بلکہ مالک حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد و حرص اور ان کے لازمی نتائج ہم و غم، درد و جزب و سنج و الم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا، یعنی شرک کا، جو ہی شرک کی جڑیں قلب سے لالہ لالہ اللہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں، اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہو گئی انسان ان تباہ کن جذبات کے خنجر سے نجات پا جاتا ہے، حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، سکون و برد قلبی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

کبر و فخر و عجب کی اس قلب میں گنجائش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم، مالک نہیں مملوک، رب نہیں مرئوب، مولیٰ نہیں عبد سمجھتا ہو، اپنی محکومیت و مملوکیت کا یقین جو موقد کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے، فخر و غرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔

اس کی عضویت اس زہر کو قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی۔
 اب توحید فی الربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو جب تم نے فاعل حقیقی حق
 تعالیٰ کو مان لیا، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ کے قائل ہو گئے، نافع و ضار فی الحقیقت
 انہی کو سمجھنے لگے، تو خوف و حزن سے تم نے رستگاری حاصل کر لی، غیر کو نافع و ضار
 قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہنچنے کی امید ہوتی ہے، اور اس امید
 کی شکست حزن و غم کو ضروری طور پر پیدا کرتی ہے، اس سے ضرر کا اندیشہ تمہارے سینہ کو
 خوف سے بھر دیتا ہے، جو نہی تم نے وہم کے اس بت کو توڑا، اور حق تعالیٰ کی اس تشبیہ
 کو یاد کیا، کہ

وَلَا تَذُنُّ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ
 وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا
 مِّنَ الظَّالِمِينَ ۝ (پ ۱۶۶) ہو جائیگا ظالموں میں۔

غیر اللہ کی ربوبیت تمہارے قلب سے فنا ہو گئی، نفع کی امید، ضرر کا خوف تمہارے سینہ
 سے جاتا رہا، اور حزن و خوف سے تم نے ہمیشہ کے لیے نجات پالی۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا
 فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ
 (پ ۱۶۷) ثابت قدم رہے تو نہ ڈریں ان پر اور نہ وہ
 غمگین ہوں گے۔

ربوبیت پر جہاں تم نے استقامت پیدا کر لی کہ دنیا اور زندگی کے متعلق تمہارا سارا نقطہ
 نظر بدل گیا، نقطہ نظر کا بدلنا تھا، کہ زمین و آسمان بدل گئے۔

چو بجزیند خیال از چشمِ احوال زمین و آسماں گرد و مہدل
 ایک وہم تھا، خیال تھا جس نے تمہیں خوف و حزن کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، اب تم
 نے اس خیال کی تصحیح کی، ذہنی صحت تمہیں حاصل ہوئی، نور کی طرف تم نے اپنا منہ کر لیا،

اور تمہاری روح اپنے خالق و حاکم کو مخاطب کر کے جینج اٹھی۔

اللَّهُمَّ اسَلِّمْتُ نَفْسِي إِلَيْكَ وَ
وَجَّهْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ وَكَوَّضْتُ أَمْرِي
إِلَيْكَ وَالْجَأْتُ ظَهْرِي إِلَيْكَ رَغْبَةً
وَرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنجَاءَ مِنْكَ
إِلَّا إِلَيْكَ ۝

کا مرکز تو ہی ہے۔

اس اقرارِ ربوبیت کے ساتھ ہی تم نے اپنے قلب میں طمانیت و راحت محسوس کی، اعمال و یقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمہیں نفع و ضرر سے خالی، تمہارے ساتھ تعاون و عمل کے لیے تیار، تمہارا رفیق و خادم نظر آنے لگا! زندگی کے راستے میں تمہارے قدم جیسا کہ انداز میں اٹھنے لگے، تمہارا سینہ کینہ سے پاک ہو گیا، کیونکہ تمہارا یہ وہیم دور ہو گیا کہ سوائے حق تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہو سکتا ہے، جو اس کی آنکھوں کو دشمن بے رحم دیکھ رہی تھی، ایمان کی آنکھ اس کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلا رہی ہے اور سعدیؒ کے پراثر الفاظ میں کہہ رہی ہے

چوں دشمن بے رحم فرستادہ اوست بدعدم اگر نہ دارم این دشمن دوست
اسی وقت غیظ و غضب سے بھی تمہارا نفس پاک ہو گیا، دوست پر غضب کیسا؟ اس یقین کے بعد کہ ہر آفت ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے، مسلم حقیقی کی طرف سے تباہی ہے جو ہمیں اپنے نقائص و ذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کی اصلاح کا موقع دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمارا رخ پھیر دیتی ہے، حق تعالیٰ سے جوڑتی اور نفس و شیطان سے توڑتی ہے، ہاں پھر اس یقین و اذعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ و غضب کا محل کیسے بن سکتا ہے؟

۱۔ یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے۔ رواہ ابی جعفر عن البراء بن عازب، رسول اللہ ﷺ نے وقتِ آخری چیز پڑھتے تھے۔

ریا جو خلق کے لیے اپنے اعمال کی تڑپیں ہے، اسی وقت ممکن ہے، جب خلق کو نافع و
 ضار سمجھا جائے، خلق سے توقعات وابستہ ہوں، یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور
 ہو جانے کے ساتھ ہی ریا کاری اور تصنع و نمائش کی جڑیں کٹ جاتی ہیں، عمل صرف حق
 تعالیٰ ہی کے لیے جاری ہو جاتا ہے، حور و قصور کے لیے نہیں رہتا، کیونکہ یہ بھی مخلوق ہیں،
 اور مخلوق سے نہ راحت ہے اور نہ سرور و عزت اور نہ یہ مقصود بالذات۔

کذب یا دروغ بانی کا محرک یا تو لفع کا حصول ہوتا ہے یا ضرر کے دفع کا خیال، یا
 پھر خود بینی و خود ستائی، کبر و فخر، عجب و ریا، ہم نے اوپر دیکھا کہ ربوبیت حق ان صفات
 ذمیرہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لیے موقد کا قلب صداقت کا خزانہ ہوتا
 ہے، وہ وعدوں کا پکا، قول کا سچا ہوتا ہے، وَالْمُؤْمِنُونَ بَعَثْنَا فِيهِمْ أَخِيًا لَهُمْ كَلِمَةً
 صَادِقَةٌ۔

اسی طرح غیبت شرک فی الربوبیت کا نتیجہ ہے، غیبت کی وجہ یا تو صداقت ہوتی ہے
 جس کا محرک نقصان و ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی
 شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اس پر یقین ان تمام ذمائم کی بے خطا دوا ہے، صیا
 کہ ہم نے اوپر ثابت کیا، غیر اللہ کو حقیقی نافع و ضار قرار دے کر عداوت و بغض و حسد میں
 مبتلا ہوں، اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ التباس کو صحت علمی نے
 دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی۔

غرض تزکیہ نفس و تصفیہ قلب یعنی سیرت سازی کے لیے سب سے پہلے شرک فی
 المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے، لا کی شمشیر سے مالکیت حاکمیت
 اور ربوبیت ذواتِ خلق سے کاٹ دی جاتی ہے، اور الّا سے اس کا اثبات ذاتِ حق میں
 کیا جاتا ہے، اور اس طرح اخلاقِ الہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا
 کی جاتی ہے، اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لیے ضروری ہیں اس کی توضیح

لمہ پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں۔

میں چند مقامات کا پیش نظر رہنا لازمی ہے۔

ابتداء میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے، لیکن علم سے مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہیے، جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے لیکن قلب میں جا کر نہیں ہوتا، اس لیے عمل کی صورت میں نمایاں ہونے کی قوت نہیں رکھتا اور اس لیے منفعت بخش نہیں ہوتا۔ علم سے مراد ہماری مراد وہ یقین و اذعان ہے جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے، خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے، دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے، اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، ایسا یقین تفکر و تہجد پر مراقبہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے تفکر کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے، تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے مضبوط ہوتا ہے، تلویں جاتی ہے، تمکین رونما ہوتی ہے اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا قاریح میں ظہور کرتا ہے۔ جب عمل کی تکرار ہوتی ہے، تو عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو فطرتِ ثانیہ کہلاتی ہے، اب عمل کے لیے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی، خیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے، مضائقہ رفع ہو جاتی ہے، سہولت پیدا ہو جاتی ہے سیرت قائم ہو جاتی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے بع

چند روز جہد کن باقی سب بند

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

(۲) **مجاہدہ**: پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدہ کے ممکن نہیں، اسی طرح بغیر عمل صالح اور مجاہدہ کے اس کی تمام خوبیوں کا نمایاں ہونا بھی ممکن نہیں

لہ لیے علم سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اعدو ذباک من علم لا ینفع و من قلب لا یختم۔

لہ تفکر ساعة خیر من عبادۃ سبعین سنة (الدیلمی در روی ابوشیخ من حدیث ابو ہریرہ)

تم قل انی اعظکم بواحدة ان تفوموا لله مشتی و فرادی ثم تفکر و (پارا۔ ۱۲۷) سے تفکر کا حکم صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

اسی لیے فرمایا گیا: جَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ اور صحیح عقیدہ مجاہدہ کی چشم بصیرت فروزا
 کے سامنے نیکیوں کی تمام راہیں کھول دیجاتی ہیں۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ
 سُبُلَنَا، اب ہمیں مجاہدہ کی ماہیت اور اس کے طریقوں کو سمجھ لینا چاہیے۔

ذرا اپنے ذہن کے نہان خانہ کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظہ خیالات، تصورات،
 خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے؟ علم کا ایک دریا ہے کہ اٹلا چلا آ رہا ہے،
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لامتناہی مبداء سے نکل رہا ہے، اس کی ماہیت و نوعیت
 پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا اضلالی۔ اس کی آمد
 کسی طریقے سے روکی نہیں جاسکتی، کونسی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو
 محض ارادہ کی قوت سے پیدا نہ ہونے دینا بشری طاقت سے باہر ہے، خیالات آزادی
 کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ
 ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور نہ ان کے فنا کرنے پر! لیکن انسان کو اتنی طاقت دی
 گئی ہے کہ اپنی توجہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدایتی علم کی طرف مبذول کرے، یا
 نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے، یہی مجاہدہ
 کی ماہیت ہے، ذہن میں سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری و اضطراری طور پر پیدا ہو رہا
 ہے، اب یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس خیال کو گلے سے لگاؤں، پیار کروں، قلب کے
 میدان میں تخت بچھا دوں، اور اس کو معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے بٹھا دوں، یا یہ
 کہ اس کے ذہن کے دروازہ سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو
 اس کی سرکوبی کے لیے آؤں، اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑا دوں، ظاہر
 ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلہ میں نور ہی کامیاب ہوگا، کیونکہ ظلمت نور ہی کے غیاب کا

لے مجاہدہ کروا اللہ کے واسطے جیسا کہ چاہیے اس کے واسطے مجاہدہ کرنا (پہلے ۱۷)

لے جنہوں نے پہلے سے واسطے مجاہدہ کیا بہانہ کو اپنی ماہیں بھاری گئے (پہلے ۱۷)

تو نام ہے، نور ہی کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے چھا سکتی ہے! مجاہد حق تعالیٰ ہی کی حول و قوت سے اضلالی علم کے بجائے ہدایتی علم پر عمل کرنے کا نام ہے، اضلالی خیالات کے ذہن میں خطور کرنے ہی مجاہد کی روح "خیر کے مبدئ" کی طرف استعانت کے لیے متوجہ ہو جاتی ہے، استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہیں کرتی اپنی بچاؤگی سے واقف ہوتی ہے، لامتناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہنچ جاتی ہے، اور حج اٹھتی ہے:-

”سبحان ذی الملک و الملکوت سبحان ذی العزّة و الجبروت سبحان الحق
الذی لا یموت اعوذ بعفوک من عقابک و اعوذ برضاک من سخطک و
اعوذ بک منک جلّ و جہک“

اور یہ لامتناہی عزت و جبروت، یہ لامحدود ملک و ملکوت والا آقا ہم سے دور نہیں، وہ جو بالذات ہے جہاں میں موجود ہر جگہ ہمارے پاس ہی تو ہے، رگ جان سے زیادہ قریب ہے، ہمارا نزدیک تر! وہ النیات کی اس پکار پر شانِ رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اور اس کی تجلی کے ساتھ ہی قلب کے ضرر و اضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے، اور شر کا صدور ہی نہیں ہونے پاتا۔ نفسیات کے اس سلسلہ قانون کو یاد کرو، جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے، کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے، اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے، اور عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے، مجاہدہ سلبی یا بد یا اضلالی خیالات کا گویا دروازہ ہی پر مقابلہ ہے جوں ہی ان خیالات نے کتم عدم سے سز نکالا، ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے ان سے ٹکر لی، اپنی محدود کمزور قوت سے ان کا مقابلہ نہیں کیا، بلکہ نامتناہی قوت و جبروت کے مبدئ سے اقد فیض کیا۔ اور اس طرح بے پناہ

۱۔ اس حدیث کے الفاظ ہیں جس کو عالم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگا دی اور ان کا قلع قمع کر دیا جب عمل ہی کا صدور اس طرح روک دیا گیا، اور ابتداء ہی میں روک دیا گیا، تو تکرار کی نوبت ہی کہاں، عادت کا قیام کس طرح ممکن اور سیرتِ بد کی تشکیل کا کیا ذکر، یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے جب وہ تخیل کے دروازے سے خانہ قلب میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب دربانِ قلب غفلت کی نیند سوراہا ہو، چوکس نہ ہو، ہوشیار اور خبردار نہ ہو، یا پھر اپنی حول و قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے! اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور مردانگن ہے، ان سے مقابلہ بچوں کا کھیل نہیں، یہ بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے پچھاڑ سکتے ہیں، ان کے داؤں تیج سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں، ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے، ان کے دروہ کے وقت ہی انہیں پچھاڑا جائے، سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور حق تعالیٰ کے حول و قوت سے ان کا سامنا کیا جائے **اللَّهُمَّ اعْذِنِي مِنَ شَرِّ نَفْسِي** کی فریاد فوراً بلند ہو، **اعوذ بك منك** کی چیخ فوراً نکلے، پھر شکست ناممکن ہے، کامیابی قطعی ہے، حق تعالیٰ کی پناہ میں آکر مغلوبیت کیا معنی رکھتی ہے، ناکامی کیا چیز ہے، ان کی معیت کے ساتھ ہی بندی نصیب ہوتی ہے **مَا تَعَالَىٰ أَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ** کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے۔

یسی نفسیاتی الہیاتی طریقہ بد عادات کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے، بد عادت سے مراد کوئی عادت ہے، جو ہمارے اختیار و تصرف میں نہیں، بد عادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے، بد عادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ بردِ قلبی اس کو نصیب ہو سکتی ہے، چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہے، اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصور ہوتا ہے، لہذا بد عادت کی شکست خیال کی تبدیلی پر

لے لے اللہ میرے نفس کے شر سے مجھ کو پناہ دے۔

مے تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہیں (پہلا باب ۸۷)

منحصر ہے، عادت کے قائم ہو جانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو، لیکن خیال ہمارے تصرف میں آسکتا ہے، اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر لیا جائے تو خواہش بھی مغلوب ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو۔ اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے، اور یہ خواہش یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ چل کر مینا چاہیے، خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسرے دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بناتا ہے اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں“

بہر طور بڑی عادتوں کے آہنی پنجہ سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا، اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت دکھینی پڑے، تو ہمیں مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے، مجاہد کے نزدیک یا اس کفر ہے گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادت بد کا پھر ایک مرتبہ (باوجود عزم برائے کے کہ ایسا نہ ہوگا) شکارِ غضب کے بعد جو ندامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو حزنِ ملامت کہ وہ محسوس کرتا ہے، وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر مفید ہوتے ہیں اور وہ وقت بہت جلد آ پہنچتا ہے، جب وہ محض اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو کر فاتحانہ شان سے اپنی خود ساختہ بیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتا ہے، عارفِ رومی نے مجاہد کے اس اعتبار کو اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے؟

اندریں رہ می تراش می خراش تادمِ آخردے فارغِ مباحش

تادمِ آخردے آخسر بود کہ عنایت با تو صاحبِ سر بود

دوست دارد دوست این آشفنگی کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی!

کار کے کن تو لو کاہلِ مباحش اندک اندک خاکِ چرامی تراش

چوں زچلے می کنی ہر روز خاک عاقبت اندر سی در آب پاک
چوں نشینی بر سر کوٹے کسے! عاقبت بینی تو ہم روٹے کسے

بہر حال مجاہدہمت سے کام لیتے ہیں، حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار رکھا ہے، اس کو استعمال کرتا ہے، اور عزم راسخ رکھتا ہے کہ جب تک گوہر مقصود ہاتھ نہ آئے قلب کا تزکیہ روح کا تجلیہ نہ ہو جائے، وہ دم نہ لیگا، اور حق مجاہدہ ادا کرے گا، ولولہ انگیز طریقہ سے ہر قدم پر وہ گنگنا تا جاتا ہے۔

دست از طلب ندارم تا کار من بر آید

یا تن رسد بجایاں یا جان ز تن بر آید

کامیابی و فتح مندی اس مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے گانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ
کا وعدہ اس سے متعلق ہے! ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا كَا قَوْلِ
پورا ہوتا ہے۔

مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا، راتوں میں کم سونا، فاقہ پر فاقہ کرنا، حقوق نفس کو تلف کرنے کا نام نہیں، مجاہدہ "حقوق نفس" کا ادا اور غیر شرعی "خطوطِ نفس" کا ترک کرنا ہی، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے، روح کا تجلیہ ہے، اس کا بہترین طریقہ خیالاتِ فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہے، جو شخص اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو سبلی افکار کے بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے، وہ اعمالِ سیدہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے، اس کے لیے اقتالِ مامور، اجتنابِ مخطور، اور رضا بہ مقدر آسان ہو جاتے ہیں، جو عارفِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے الفاظ میں دین کا خلاصہ ہیں!

ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جو ششم ہیں تمام محامد و محاسن کا، تمام خوبیوں اور نیکیوں کا، جو مبدئ ہیں طمانیت و سرور کا، علو و

لہ فتوح الغیب مقالہ اول۔

إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً قَرْضِيَّةً فَادْخُلِي
 فِي عِبَادِيَ وَأَدْخُلِي جَنَّتِي ۝
 پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری
 (پتار ۱۴) بہشت میں۔

نفسِ مطمئنہ کا حصول، رضائے الہی کا تحقق، جنت ذات میں دخول، یہ نتائج ہیں اس
 مجاہدہ کی تکمیل کے! جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے، جو مستی اس کی یافت و شہود سے
 حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں "لذاتِ جہاں" پہنچ ہیں، جامی اس ذوقِ مستی کو اس والہانہ
 انداز سے ادا فرماتے ہیں:-

کے بلبلِ جاں مست بیاد تو مرا دے پایہٴ غم پست بیاد تو مرا
 لذاتِ جہاں را ہمہ در پانگند ذوقیکہ دہد دست بیاد تو مرا
 حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری رہے، فاذکرُوا
 اللہَ ذِکْرًا کَثِيرًا۔ پر عمل ہو، اٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ ہو، اس سے مقصود درصنا، و قرب الہی ہو
 جب تمہاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافاتِ دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکوز ہوگی، تو
 خود بخود فاسد، سلیبی پریشان کن خیالات و وساوس کا دروازہ بند ہو جائیگا، اور جو نہی
 خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی ایک روحانی کیف و طمانیت سے تمہارا قلب
 مملو ہو جائیگا اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ کے یہی معنی ہیں، ذکر کا قیام مشن اور مجاہدہ سے
 آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے اور ذہول و غفلت کا ارتفاع ہو جاتا ہے۔ اس دولت کے حامل
 ہو جانے کے بعد تم تمام چیزوں سے عننی ہو جاتے ہو، نہ کسی چیز کے حصول سے تمہیں لذت
 ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج! لَکِن لَّا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَاَنَّا کُمْ وَاَلَا
 تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاکُمْ کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو رکھ کر تمہیں کسی چیز کی خواہش
 نہیں رہتی، تم عارفِ روم کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو:-

روزگار رفت گور و باک نیست تو ہاں لے آنکہ جز تو پاک نیست

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گُر تمہیں بتلاتے ہیں، یہ تو تم مانتے ہو کہ ہر شے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شے، ان کی مخلوق ہے، ہمارا رات دن سابقہ ان ہی اشیاء سے ہوتا ہے، یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ہیں، انہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھی ہوتے ہیں، چونکہ یہ فانی اور گریزا ہیں، ان کا زوال اور ان کی فنا پذیری ہمارے غم و حزن کا باعث ہوتی ہے، اب قانون ایٹم ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تم یہی کوشش کرتے رہو کہ شے، کو دیکھ کر تمہارا خیال شے کے خالق کی طرف جائے، اس طرح تمہیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آئے گا، اور ایسا تو لو افتم وجہ اللہ کے معنی کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گا۔ شے کی سلبی جہت سے توجہ ہٹ کر جہت حق کی طرف مرکوز ہو جائیگی۔ اور اس طرح یاد قائم ہونے لگیگی، تمہارا معروض فکر اب شے نہیں حق ہوگا، اور ان تمام احوال سے تمہارا قلب معمور ہونے لگیگا جو وجود اللہ کی طرف رُوح کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ سعادت و مسرت کا سرچشمہ خود ہمارا قلب ہے، حق تعالیٰ کی جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے، آفاق میں حق تعالیٰ ظاہر ہیں ہر شے کے ساتھ جہت حق موجود ہے، صحیح علم کے استعمال سے وہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی، نقطہ نظر بدلا، معلوم ہوا کہ انفس و آفاق میں حق تعالیٰ نہاں و عیاں ہیں، انہی سے تعلق قائم کرنا، انہی کی یاد کا جمانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور ذہول اور خلق میں استعراق اور فنایت تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہوتا ہے **مَنْ يَعْزِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْ عَذَابًا صَعَدًا** جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے، چڑھتے عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے (پہلے صفحہ ۱۱۷)

اسی مفہوم کو رومی کے **دل نشین الفاظ میں یاد رکھو:-**

گر گریزی بہ امیدِ رخصتے ہم از آنجا پیشت آید آفتے

بیچ کنبے بے دد بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست
 حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق میں محویت، خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دلکش نظر
 کیوں نہ آئے نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے، اور ظلمت سے ضیق، غم و حزن و
 خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے، ظلمت میں چیزیں اپنے صحیح ضد و خال میں کہاں
 نظر آتی ہیں، کسی شے کا حسن و جمال تاریکی میں کیا دکھائی دے گا! پھر تمہاری نظر میں اشیا
 کی یہ دلفریبی تمہارے نفس کا دھوکہ ہے، التباس ہے، تمہارا واسمہ بھی تو خلاق ہے کیسی
 کیسی دلربا صورتیں یہ تمہاری خوشی کے لیے پیدا کرتا ہے، ان سے تمہیں بھی لذت حاصل
 ہوتی ہے، کھوڑی ہی دیر بعد غم کا سا یہ تمہارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی اعتماد ہوتا ہے
 ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے، اور تم کانپ اٹھتے ہو، تمہاری طبیعت میں استقلال
 نہیں، استحکام نہیں، تمہاری کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اٹھو، اگر تمہاری
 چشم بصیرت کھل جائے، اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے، تو تمہیں اشیا ویسی ہی
 دکھائی دینے لگیں گی جیسی کہ وہ ہیں، اب تم کو حیاتِ طیبہ نصیب ہوگی۔ طمانیت و بردباری
 حاصل ہوگی، خوف و حزن زائل ہو جائیگا، استقلال و استحکام عطا ہوگا، اور حق تعالیٰ
 کے اس وعدہ کا ایفادہ ہوگا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ وَأُنْشِيَ وَ
 هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۗ
 يٰۤاُدْحِیْ كُوْقَامُ كَرْنِ، تمہارا رخِ ظلمت سے نور کی طرف پھرنے، مجاہدہ کے راستہ کو آسان
 کرنے، خلق سے ٹوڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکیوں کی صحبت عجیب و غریب اثر رکھتی ہے، صحبت
 کا اثر نفسیات کا ایک مسلمہ اصول ہے، ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے تضایا کو قبول کرنے

۱۔ و مثل جلس الصالح كمثل صاحب المسك ان لم يصيبك منه شيء اصابك من ريحه
 و مثل جلس السوء كمثل صاحب الكبران لم يصيبك من سواده اصابك من دخانه
 (ابوداؤد و نسائی عن ابن مسعود)

نیک پیشین کی مثال مسک والے کی سی ہو اگر تم سے کسی نے نہ ملے تو خوشبو تو ضرور پہنچے گی اور بڑے ہنشین کی مثال کبریا کی
 بھلی کی سی ہے، اگر اس کی سیاہی تم کو نہ لگے تو دھواں تو ضرور پہنچے گا۔

کی استعداد یا صلاحیت پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں، تو اس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایجازی" (AUTO SUGGESTION) کہا جاتا ہے۔ اور جب کسی خارجی ذریعہ سے حاصل ہوں تو "غیر ایجازی" (HETERO-SUGGESTION) کہا جاتا ہے، رات دن ہم خود ایجازی اور غیر ایجازی کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں، اور ان کو جزو ذہن بنا رہے ہیں، اگر سبلی یا اضلالی افکار غیر ایجازی قوت کی وجہ سے ہمارے قلب میں جگہ پارہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بُری صحبت میں ہیں، اور ان کے تیقنات و اشغال کی نقل کر رہے ہیں، اور اضطرابی طور پر ان سے متاثر ہو رہے ہیں، ان کے سمی اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صحبتِ ناجنس سے قطعی احتراز کریں۔

زاحمقاں دگر یزچوں عیسیٰ گریخت
صحبتِ احمق بے خونہا بریخت

سبلی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لیے نیکوں کی صحبت کی تلاش کرنی چاہئے، اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم اپنے اندر خاص اثر و قوت رکھتا ہے، وہ قلب کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے، یقین و اذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے، علمِ حق کو شیخ اکبر محمدی الدین عربیؒ نے "علم اذواق" قرار دیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ علم الحق علم الاذواق لا عن الاوراق وهو العلم الصحيح وَمَا عَدَاهُ فَخَدِثٌ وَتَحْمِینُ لَیْسَ الْعِلْمُ اَصْلًا یعنی علمِ حق ذوق و وجدان سے حاصل شدہ علم ہے، محض کتابوں سے حاصل کردہ نہیں، اور یہی علم صحیح ہے، باقی اشکال بچو، مطلق علم نہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں، مبدع و نبوت سے اخذ کردہ ہے، قطعی و یقینی ہے، حقیقی و واقعی ہے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلم ہو گئے ہیں، اور اب وہ براہِ راست اسی سبب سے علم حاصل کرنے لگتے ہیں، اَللّٰهُمَّ عَلِّمْنَا اللّٰهَ اس پر دلیل ہے، اسی لیے ایک

دوسرے رازداں کی نصیحت ہو کہ خذ العلم یا فواہ رجال اللہ، لا من الصحائف الدفاتر
 مردانِ حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دستروں سے نہیں، کیونکہ ان کتابوں
 میں قیاس و تخمین اور ظن و رائے کے سوا کیا رکھا ہے، اہل اللہ کی صحبت خالص کو کیا کرتی
 ہے، ان کے افعال و اعمال ان کے افکار و خیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے
 جاتے ہیں اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہو، اور بدی سے مجتنب
 اور محرز اور بالآخر ظلمت سے نکل کر نور کی طرف تمہارا منہ ہو جاتا ہے، عارفِ روم نے
 صحبتِ مردانِ حق کے اثرات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی یا در رہ دیں صاحبِ دردے گردی

اس را بجز از صحبتِ مردانِ مطلب مرے گردی چو گردِ مردے گردی

یہ کو تو مع الصبا دقین کے حکم کے پہاں فائدوں کی اجمالی توضیح ہے۔

سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کی گئی، اس کو اجمالاً ایک دفعہ
 پھر دہرایجیے اذ انکر و تقدر، تکرار سے چیزیں زیادہ دلنشین ہوتی ہیں، سیرت کی عمارت کا
 سنگ زاویہ لا الہ الا اللہ پر نچتہ یقین و اذعان ہے، تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا
 کہ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الہ غیرہ، اے قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا
 تمہارا کوئی معبود رب نہیں، اللہ ہی لائق عبادت ہیں استعانت انہی سے کی جانی چاہیے
 میرا سر انہی کے سامنے جھک سکتا ہے، غیر کے سامنے نہیں اس بنیادی عقیدہ کا زبان
 سے اظہار اور قلب سے اقرار ضروری ہے، زبان سے بار بار کی تکرار یقین کو نچتہ کرتی ہے
 جس قدر یقین میں سختی ہوگی اسی قدر عمل میں سہولت ہوگی، یقین میں شدت پیدا کرنے کے لیے
 غور و فکر، تدبر و مراقبہ ضروری ہیں، یقین اس شدت کا پیدا ہو جائے کہ شک و شبہ کی
 مطلقاً گنجائش نہ رہے، تم جانتے ہو کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے تمہارا ہاتھ جل جائیگا اسی
 طرح تمہیں توحید فی المعبودیت و توحید فی الربوبیت کا یقین ہو جانا چاہیے، ذلت (جو عبادت

کی اصل ہے حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جو ہمارے مالک ہیں حاکم ہیں، مولیٰ ہیں، خالق ہیں، رب ہیں، وکیل و نصیر ہیں، حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہیں، معزز و منزل ہیں، حاجت و مراد سوا ان کے کوئی پوری نہیں کر سکتا! اسی لیے انہی کے سامنے دستِ سوال دراز ہو سکتا ہے، کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں، زبان پر یہ دعا جاری رہے اور قلب میں اس کا مفہوم متکمن۔

اللَّهُمَّ كَمَا صَنَعْتَ وَجْوهَنَا ان تَسْجِدَ الِیْهِ مِنْ طَرَحٍ تَوَلَّى بِهَلْكَهٖ جِهْرًا كَوَفَّيْكَ لَكَ سَجْدًا
لِغَيْرِكَ فَصْنِ اَيْدِيَنَا ان تَمْتَدَّ كَرْنًا سَعَى بِحَالِيهَا اِیْ طَرَحٍ بِهَلْكَهٖ اِیْ تَحْتُوْنَ كَوَافِيْ
بِالسَّوَالِ لِغَيْرِكَ - غیر کے آگے سوال کرنے سے بچائے رکھ۔

اس عقیدہ اور یقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کر سکتا ہے، اس کی سیرت
فلاموں کی سی کیسے ہو سکتی ہے وہ نفع و ضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے، اور اپنی عزت
اس وہی نفع و نقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے، مجاہد اسی یقین اساسی کو بچتے کرتا ہے اس
کا طریقہ یہ ہے کہ خواطر کی نگہبانی کی جائے، سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی و ہدایتی علم سے بدل لیا جائے
قانون تقطیب افکار (Law of the Polarisation of thought) تقیات کا
ایک مسلمہ قانون ہے، اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں تبدیل کیا جاتا
ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی افکار کو ذہن میں ہمیشہ جلنے کی کوشش کرنی چاہیے،
اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جب یہ قلب پر چھا جاتا ہے، تو قلب
تمام ظلمتوں سے پاک ہو جاتا ہے، نورانی ہو جاتا ہے، نور ہو جاتا ہے، اللہم اجعل فی نفسی نورًا
للہم اجعلنی نورًا کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سرور و طمانیت ہے، مسرت و سعادت
ہے جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے، نیک سیرت شخص سرور و مطمئن ہوتا ہے، اس کی
جان اس کا تن راحت میں ہوتا ہے، وہ قطرہ نور ہوتا ہے، یہ روحانی مسرت ہے، جو طبی غم و حزن
میں باقی رہ سکتی ہے۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا

يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ - (پ ۱۱ ع ۱۱)

قوة ایمانیہ و ظہور غیب

چشم بگذاشته ازین محوسها یافتہ از غیب بینی بوسها
خود نمی یابم یکے گوشے کہ من نکتہ گویم از ان چشم حسن

مدتوں ہم اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہمیں "صداقت" کا علم ہے، لیکن یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیوں صداقت کے وہ آثار ہماری زندگی میں نمایاں نہیں ہوتے جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفوز فی الفضا امور تکوینی میں کامیابی و کامرانی نزل الشہداء، ایسی اعلیٰ قسم کی میزبانی بینی کہ شہیدوں کی جنت میں ہوگی، عیش السعداء، سعیدوں کا ساعیش، النصر علی الاعلاء، دشمنوں پر فتح کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے؟ کیوں رحمت کے وہ آثار ظاہر نہیں آتے، جن سے ہمارے دل کو ہدایت ہو (تھدی بھا قلبی) ہمارے کاموں میں جمعیت ہو (جمع بھا امری) ہماری ابتری دور ہو، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں (تلمو بھا شعتی) ہمارا دین سنور جائے (تصلو بھا دینی) ہمارا فرض ادا ہو جائے (تقضى بھا دینی) ہماری نظر سے غائب چیزوں کی نگہبانی ہو (تخفظ بھا غائبی) ہمارے پیش نظر چیزوں کو بلندی عطا ہو (ترفع بھا شہدی) ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے (تبیص بھا وجہی) ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے (تزکی بھا عملی) رشد و ہدایت کا ہمارے قلب میں الہام ہو (تلمنی بھا رشدی) حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے فطری جذبات الفت از سر نو پیدا ہو جائیں (تورد بھا الفتی) اور ہر برائی سے بچے رہیں (تعصمی بھا من کل سوء)

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم یقین صادق کے درجہ کا نہیں، یا پختہ یقین نہیں، اور وہ ایمان ہمیں حاصل نہیں ہو سکا، جس کے مانگنے کی ہدایت ان الفاظ میں

کی گئی ہے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَغِيثُ بِإِيمَانِي بِمَا شَرَّ قَلْبِي لِي أَتَى فِي تَجَهُّدِي مِنْهُ إِيمَانٌ مَا نَكَلْتَهُ لِي بِمِيرَةِ دَلِّ

وَيَقِينًا صَادِقًا الْخُ
میں پوست ہو جائے اور پختہ یقین الخ

ہمیں علم یقین کی وہ کیفیت حاصل نہیں جس کے پیدا ہو جانے کے بعد حضرت مسیح کے الفاظ

میں حریت تامہ حاصل ہو جاتی ہے!

ہم میں سے اکثر ایک ایسے سادہ طریقہ کی تلاش میں اپنی مختصر زندگی کے دن گزار دیتے ہیں،

جس کا حصول اور جس پر مداومت ہمیں ایمان کے ان آثار و برکات سے مالا مال کرے، جن کا ادھر

ذکر ہوا، ہمیں ایک ایسی چیز کی تمنا ہے، جو ایمان کو ہمارے قلوب میں پوست کرے، وہ پختہ یقین عطا

کے جس سے ایک بڑی تعداد محروم ہے، اور جس کے حاصل ہو جانے کے بعد ہماری ساری پریشانیوں

سب کچھ جائیں، ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے اور ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے، اور تمام امور میں کامرانی و

کامیابی نصیب ہو!

یقیناً ایک ایسا سادہ طریقہ موجود ہے، اور وہ اتنا سادہ اور سیدھا طریقہ ہے کہ اکثر اس کو

جان کر بھی اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے! بعض کا تو یہ عقیدہ ہے کہ زندگی میں پریشانیوں سے نجات

اور جمعیتِ خاطر کا حصول ناممکن ہے! ان کا خیال ہے کہ۔

'آدم' از کثرتِ پریشانی می کشد جستجوی جمعیت

آدم آمد سر حزن و دہرہ جدا نشود جمع تا دم میت

بعض کا خیال ہے کہ یہ طریقہ پایا تو جاتا ہے، لیکن وہ ایک رازِ نہفتہ ہے، اس تک ان کی

رسالی ممکن نہیں، وہ رازِ سینہ ہے، سفینہ پر نہیں ملتا، اور اس راز کے جاننے والے کا معدوم ہیں،

بعض سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ سخت مشکل ہے، اس پر عمل ناممکن ہے! یہ شخص کے بس کی چیز نہیں، الفاظ

یا تعبیرات کی کثرت نے اس کو چھپا رکھا ہے اور دلائل کی کثرت نے اس کا ادراک مشکل کر دیا ہے۔

ازدلائل می شود مشکل بہا ادراک حق!! ایں رہ از بسیاری سنگ نشاں ہوا ز نیست!

حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ موجود ہے اور وہ اتنا سادہ ہے کہ بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں، بوڑھی خواتین بھی سمجھ سکتی ہیں! الہامی صدائقوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں بچوں کی طرح سلیم فطرت بن جانا چاہیے، اسی وقت ہم میں وہ شعور پیدا ہوتا ہے، جس کی بیداری کے بعد ہمیں کامل حریت نصیب ہوتی ہے! یہ طریقہ مختصر الفاظ میں یہ ہے۔

۱۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ان ظاہری و باطنی نعمتوں اور عنایتوں کو یاد کرنا چاہیے، جو ہماری پچھلی زندگی میں ہم پر کی گئیں اور ان پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔
 ۲۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ان آئندہ نعمتوں اور عنایتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے!

اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے :-

۱۔ ایمان ان اشیاء کا جو ہرے جن کی ہم حق تعالیٰ سے امید رکھتے ہیں، اور ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، حق تعالیٰ پر ایمان، ان سے حسن ظن، ان سے انس و محبت مومن کا طرہ امتیاز ہے: **لَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ** اس ایمان حسن ظن، انس و محبت ہی سے وہ تمام نعمتیں جو ابھی پردہ غیب میں ہیں، خارج میں ظاہر ہوتی ہیں، یہ وہ پل ہیں جن سے گزر کر حق تعالیٰ کی نعمتیں مومن تک پہنچتی ہیں، اس لاکو عارف روحی نے یوں فاش کیا ہے :-

اَنْ كَرَّ شَدَائِشْ بِشَاهِ فَرْدِ خَوِشِ يَافَتْ دَرْمَانَكْ جِلْمِ دَرْدِ خَوِشِ

ایمان اور انس مسلسل شکر و حمد سے قوی ہوتا ہے، جب ہمارے قلب میں ان نعمتوں، راحتوں، عنایتوں، احسانوں کا احساس موجود ہوتا ہے، جو حق تعالیٰ نے ہم پر ہماری پچھلی زندگی میں کی ہیں، ہم اس احساس کو تازہ کر کے ان نعمتوں کی جزئیات و تفصیلات پر نظر کر کے چیخ نکلتے ہیں:

بے لطف تو من قرار نتوانم کرد احسان ترا شمار نتوانم کرد

گر برتن من زباں شود ہرے یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد

(ابوسعید منہدی)

بجائے پھلی زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں پر شعور کو مرکوز کرنے کے ہمیں یاد کرنا چاہیے کہ کس طرح حق تعالیٰ نے پھلے زمانہ میں ہمیں خوف و حزن سے نجات بخشی، غم و مصیبت سے آزادی مرحمت فرمائی، مرض و الم سے شفا عطا کی! ہمیں ان موقعوں کو یاد کرنا چاہیے، جن میں حق تعالیٰ کی کارسازی و بندہ نوازی نے ہماری جان کو آرام بخشا اور ضیق و پریشانی سے نجات دی، غم و مصیبت کی لہ پناہ قوتوں نے ہمارے ضعیف جسم کو تباہ کرنا چاہا تھا، اور شرکی تباہ کن طاقتوں نے ہماری روح کے شیرازہ کو منتشر کرنا چاہا تھا لیکن حق تعالیٰ کے کرم نے ہماری حفاظت کی، ان کے احسان نے ہمیں تباہی سے بچالیا!

کجا لب صدق و شکر ابر نیان ست! کما از شمار برون قطره ہائے باران ست! (عظا)
 ہاں ہم اپنے احسان مند قلب کی گہرائیوں سے حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ ہی کے تھے، ہماری حول و قوت کو اس میں کچھ دخل نہ تھا، اَلْحَوْلُ وَ الْوَكَا
 قُوَّةُ اِلَّا بِاللّٰهِ! جب ہم شکست خوردہ دل سوختے تھے ان کی ربوبیت نے ہماری دستگیری فرمائی
 جب ہم برگشتہ و پریشان تھے ان کی رحمت نے ہمیں راہ دکھائی! جب ہم غلط راہ پر پڑے
 تھے، ان کی حکمت نے ہدایت کی طرف ہماری رہبری کی، جب ہم غم و مصیبت، خوف و حزن
 میں مبتلا تھے، اُن کے فضل عمیم نے ہمیں سنبھالا!

اے خدا و قربانِ احسانت شوم! ایں چہ احسان است قربانت شوم!

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَذْبَعُ لِحِجَابِ لِحْجَابِ وَ جِهَكَ وَ عَظِيْمُ سُلْطَانِكَ!

ہر روز کچھ دیر کے لیے ہمیں اپنی گزشتہ زندگی کے ان تجربوں کو تازہ کرنا چاہیے، جب کہ حق تعالیٰ نے ہماری خاص طور پر مدد فرمائی، اور ہمارے لیے نجات کا سامان فراہم کیا، ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں ایسے تجربات و واقعات ضرور گزرے ہیں جن کی یاد ہم تازہ کر سکتے ہیں، ہمیں انہیں یاد کرنا چاہیے ان پر حق تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کرنا چاہیے! عارف حق شناس ہوتا ہے، غیر عارف ناسپاس!
 عارف آن باشد کہ باشد حق شناس ہر کہ عارف نیست گرد ناسپاس (عطار)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کے احسانات کا یوں شکر ادا کیا ہے :-

اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ بِمَا هَدَيْتَنَا تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور
 وَلَكَ الْحَمْدُ بِمَا أَلَمْتَنَا وَلَكَ تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں عزت دی اور تیرے
 الْحَمْدُ بِمَا سَتَرْتَنَا وَلَكَ الْحَمْدُ ہی لیے حمد ہے کہ تو نے ہماری ستر پوشی کی، اور تیرے ہی لیے
 بِالْقُرْآنِ وَلَكَ الْحَمْدُ بِالْأَهْلِ حمد ہے قرآن پر، اور تیرے ہی لیے حمد اہل و مال پر اور تیرے ہی
 وَالْمَالِ وَلَكَ الْحَمْدُ بِإِعْفَائِهِ لِيءِ حمد ہے درگزر کرنے پر، اور تیرے ہی لیے حمد ہے یہاں
 وَلَكَ الْحَمْدُ حَتَّى تَرْضَى وَ تَبْ تک کہ تو خوش ہو جائے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے جب
 لَكَ الْحَمْدُ إِذَا رَضَيْتَ کہ تو خوش ہو جائے اے وہ جس کی ذات سے ڈرنا چاہا ہے
 يَا أَهْلَ التَّقْوَى وَ أَهْلَ (ڈرنے کے قابل بس تیری ہی ایک ذات ہے اے وہ کہ تو
 الْمَغْفِرَةَ ! ہی مغفرت کر سکتا ہے۔

ان ہی انعامات پر جو ہماری پھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیے ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

نحمد الله خالق الاشياء نشكر الله رازق الاحياء (مظہر الحق)

یاد رکھو ایسا کرنے سے ہمارا ایمان مضبوط ہوتا ہے، ہمارا قلب یقین کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے اور ہم حق الیقین کے طور پر جاننے لگتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر حال میں ہمارے لیے کافی ہیں، ہمارے قلب کی گہرائیوں سے یہ صیغہ نکلتی ہے۔

الله الكافي، كافي! قصدت الكافي وجدت الكافي

لکل كافي كافي كفاني الكافي ونعم الكافي والله الحمد!

ہمارا خوف دور ہو رہا ہے، امیدیں جاگ اٹھتی ہیں، نور یقین ہمارے قلب کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے اور ہم حق تعالیٰ کے قرب و معیت کی روشنی میں داخل ہو جاتے ہیں، اور ہمیں وہ شاندار آزادی حاصل ہوتی ہے جو مقربین بارگاہ النبی کا حصہ ہے، وہ فرحت و سرور نصیب ہوتا ہے جس کو عیش السعداء

سے تعبیر کیا گیا ہے: اور اسی سرور کی حالت میں ہم بیدل کی زبان میں انگڑا نے لگتے ہیں:

تا مزرع ہزار آسماں خواہد بود تا خرمی بارغ جہاں خواہد بود
ہر تخم کہ ریشہ بروں خواہد بود شکرِ کریم ترا زباں خواہد بود

حق تعالیٰ کے ان گذشتہ احسانات کا حمد و شکر کے ساتھ یاد کرنا وہ طریقہ ہے جس کو ہر زمانہ کے صلحاء و صدیقین نے اپنے ایمان کی قوت کے از دیار کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے، اور اس حد تک کیا ہے کہ ان سے عجیب و غریب کرامات و خوارق عادات کا ظہور ہوا ہے، ان کی کامیابی کا یہی ایک راز تھا، اسی طریقہ نے قوتِ الہیہ کے دروازوں کو ان پر کھول دیا تھا، ان کو حق تعالیٰ کے قریب کر دیا تھا، اور حق تعالیٰ کو ان سے قریب، اس کی وجہ سے ان کے لیے ایسی چیزیں ممکن ہو گئی تھیں جو عام طور پر انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔

دیکھو جب حضرت دانیال علیہ السلام کو بخت نصر نے ایک اندھے کنویں میں ڈو شیروں کے ساتھ قید کر دیا تھا تو انہوں نے کہا جاتا ہے کہ یہ دعا کی گئی:۔

الحمد لله الذي لا يجيب من دعا
حمد اس خدا کی ہر جو اپنے! انگنے ولے کو محروم نہیں

والحمد لله الذي لا يكل من توكل
کرنا، حمد اس خدا کی ہر جو اس شخص سے نہیں ٹھکتا

عليه الحمد لله الذي هو ثقتنا حين
جو اس پر بھروسہ کرے، حمد اس خدا کی ہر جو ہمارا آسرا

تقطع عنا الحيل الحمد لله الذي
ہر جب ہماری تدبیریں منقطع ہو جاتی ہیں، حمد اس خدا

هو رجائنا حين يسود قلوبنا باعمالنا
کی ہر جو ہماری تکلیف کے وقت ہماری مصیبت کو دور

الحمد لله الذي يكشف ضرنا عند
کرنا، حمد اس خدا کی ہر جو احسان کا بدلہ احسان سے

كوبتنا، الحمد لله الذي يعجز
دیا، حمد اس خدا کی ہر جو صبر کا بدلہ نجات د

بالاحسان احساننا، الحمد لله الذي
رستگاری سے دیتا ہے!

يعجز بالصبر نجاتنا، (رواه ابن الدنيا وسنده حسن)

یہ ساری دعا حق تعالیٰ کی حمد و ثناء سے بھری ہوئی ہے، اس کا ہر جملہ ان تجربوں کو حافظہ میں تازہ کرتا ہے

جب کہ حق تعالیٰ کی خاص تائید ہمیں ہوئی تھی اور طوفانِ حوادث سے ہماری کشتی نکل آئی تھی اور ہماری زبان سے بے اختیار یہ جملے نکلے تھے۔

اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ شَكَرًا وَلَكَ
الْمُنَى فَضْلًا أَنْتَ رَبُّنَا حَقًّا
وَمَنْ عَبِيدُكَ رِقًّا۔
ہر اور ہم تیرے بندے ہیں، نا تو ان و مخرج۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مقابلہ کو چلے اور جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خین کی لڑائی کے لیے نکلے، تو ان کی زبان پر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ہی جاری تھی۔

كُنْتَ وَتَكُونُ وَأَنْتَ حَقٌّ لَا يَمُوتُ
تَمَامُ الْعِيُونَ وَتَكَرَّرَ الْجُؤْمُ وَأَنْتَ
حَقٌّ قِيَوْمٌ لَا تَأْخُذُكَ سَنَةٌ وَلَا
نَوْمٌ يَا حَيُّ يَا قِيَوْمُ!
تو ہے اور رہیگا، تو ایسا زندہ ہے جس کو موت نہیں!
آنکھیں سوتی ہیں اور سانسے بدلنے ہیں، تو زندہ اور
زندہ رکھنے والا ہے، تجھ کو اونگھ اور نیت نہیں چھو سکتی!
یا حئی یا قیوم!

یاد رکھو کہ حق تعالیٰ کی رحمت و رافت جو ہماری پھلی زندگی میں ہمارے ساتھ رہی، وہ اب بھی ہم پر محیط رہی اور ہی ثبوت جو گزشتہ زمانہ میں ہماری دستگیری کرتی رہی ہے، اب بھی ہماری مدد کر رہی ہے، وہی فضلِ عمیم جس نے اب تک ہمیں سنبھالا ہے، اب بھی ہمیں سنبھال رہا ہے۔

حق تعالیٰ اب بھی وہی ہیں، ان میں تغیر نہیں، وہ تغیر سے منزہ و ماوراء ہیں، یہ امر واقعی کہ انھوں نے ہمیں گزشتہ زندگی میں بلا و غم سے نجات دی ہے، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہی عدم تغیر و عدم بفرکی وجہ سے، میں ہرگز فراموش نہ کریں گے!

سعدیؒ اسی طریقہ کو جو ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، اصولاً استعمال کرتے ہوئے حق تعالیٰ کے گزشتہ احسانات کو یاد دلانے ہوئے فرماتے ہیں :-

فراموش نہ کردا یزد در آں حال کہ بودی لطفہ مد فون و مد ہوش
روانت داد عقل و طبع و ادراک جمال حسن و ربائے و فکر و دہوش

وہ انگشت مرتب کر دے رکھتے دو بازو دیت مرتب ساخت پر دوش!

کنوں پنداری اے ناچیز تمہیں کہ خواہد کردنت رونے فراموش!

خوب سمجھ لو کہ صداقت جس وقت تک کہ وہ محض ایک ذہنی قفل بنی رہتی ہے ہماری مدد

کرنے سے قاصر ہوتی ہے، لیکن جب ہمیں اس کا تحقق ہوتا ہے وہ ایک ہمہ توان قوت بن جاتی ہے

اب اہم بات جاننے کی یہ رہ جاتی ہے کہ صداقت کا تحقق کس طرح ہوتا ہے؟ یاد رکھو کہ جب ہم

یہ یاد کرتے ہیں کہ ہماری پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا احسانات کیے ہیں، تو ہم

اس صداقت کے تحقق کے قابل ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس کے پہلے کیا ہے وہ اب

بھی کر سکتے ہیں، معاذ اللہ حق تعالیٰ کو اہم کمزور نہیں ہو گئے ہیں کہ وہ ہماری حفاظت نہ کر سکیں

اور ہمیں پہچان نہ سکیں، اور نہ معاذ اللہ وہ بہرے ہی ہیں کہ سن نہ سکیں، وہ سمیع و بصیر و وہ علیم و

قدیر ہیں، وہ ہر طرح کافی ہیں: اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا؟ كَفَىٰ بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَ كَفَىٰ بِاللّٰهِ نَصِيرًا

اگر ہم حق تعالیٰ کے ان احسانات کو یاد کرتے رہیں، جو پچھلی زندگی میں ہم پر بارش کی طرح

نازل ہوتے رہے ہیں تو ہمیں شدت سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا

کریں ان کے جملہ احسانوں کا، جملہ عنایتوں اور بکرموں کا، نعمتوں اور راحوں کا، اب ہمیں ایسا کرنا چاہیے،

اور خوب خوب کرنا چاہیے! وحی غیر متلو کے الفاظ میں ہمیں کہنا چاہیے:

اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا تَدْرِي تَقْوَلُ، وَ حَقُّ تَعَالَىٰ اَبَّكَ لِيَسْمَعُ جِيسِي كَمَا اَبَّكَ فَرَمَلْتَنِي

خَيْرًا مِّمَّا تَقْوَلُ، اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اور اس سے بڑھ کر کہ ہم کہتے ہیں: حَقُّ تَعَالَىٰ اَبَّكَ لِيَسْمَعُ جِيسِي

كَلِمَةً وَلَكَ الشُّكْرُ كَلِمَةً وَلَكَ الدَّلِيلُ تعريف ہے سب کی اور آپ ہی کے لیے شک ہے سب کا، اور

كَلِمَةً، وَلَكَ الْخَلْقُ كَلِمَةً، يَبْدِكَ آپ ہی کے لیے حکومت ہے سب کی، اور آپ ہی کے لیے ہے

الْخَيْرُ كَلِمَةً، اَلَيْكَ يَرْجِعُ الْاَمْرُ مخلوق سب کی، آپ ہی کے احسان میں بھلائی ہے سب کی

كَلِمَةً اور آپ ہی کی طرف امور رجوع ہوتے ہیں سب کے سب۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي كَفَانِي وَاَوْفَانِي وَ سب تعريف اس اللہ، جو مجھ کو کافی ہوا اور جس نے

اطعمنی وسقانی والذی من علیؑ مجھ کو ٹھکانا دیا، اور کھلایا اور پلایا اور مجھ پر احسان اور
 وافضل والذی اعطانی فاجزل فضل کیا، اور مجھ کو مال و دولت دی اور بہت دی،
 الحمد لله علیٰ کل حال۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔

اللهم لك الحمد كما ينبغي لجلال
 وجهك وعظيمة سلطانك۔ بزرگی اور تیری بڑی بادشاہت کے سزاوار ہو!

اس طرح حمد و شکر ادا کرنے سے، تسبیح و تقدیس سے ہم میں ایک اعلیٰ شعور پیدا ہوتا ہے، ایک
 پختہ یقین، باطنی وقوف، براہ راست وجدان پیدا ہوتا ہے، جو عقلی علم یا تعقل سے ماورا ہوتا ہے،
 اس کی کیفیت کا الفاظ میں ادا کرنا ممکن نہیں، ہمیں اس امر کا تحقق ہو جانا ہے کہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ
 نے اب تک کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں۔

”إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَبِالْحَبَابَةِ جَدِيرٌ، نِعْمَ الْوَلِيُّ وَنِعْمَ النَّصِيرُ!“

۲۔ اب ہمیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا جو زمین و آسمان کے خالق ہیں جن کے
 ہاتھ میں سب کی بھلائی ہے، اور جن کی طرف سب امور رجوع ہوتے ہیں، ان نعمتوں کے لیے
 شکر ادا کریں، جن کی ہمیں اب حاجت یا ضرورت ہے، ہمیں اس پر ایمان ہے، ہمیں اس امر کا تحقق
 حاصل ہے کہ حق تعالیٰ ہر دشوار کو آسان کر سکتے ہیں، ان کے لیے ہر دشواری کو آسان کر دینا آسان
 ہے اور ان تیسیر کل عسیر علیک یسیر پھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ایسا کیا ہے اور اب بھی وہ کر سکتے
 ہیں، قطعاً کر سکتے ہیں، اس لیے ہم ان کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ انہوں نے ہماری دعائیں لی، اس
 نعمت کا ظہور جس کی ہمیں حاجت ہے پردہ غیب سے قطعاً ہو رہا ہے، اور غیب میں تو وہ ظاہر ہو چکی ہماری
 برادریوں میں مل چکی، ہمارا ایمان اس لائق قوت پر ہے جس کے لیے ہر دشوار آسان ہے، جس کے لیے
 ہر ناممکن ممکن ہے اور ہم ان چیزوں کا جو ظاہر نہیں ہوئیں اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کہ وہ ظاہر ہو چکیں
 ہی تاکہ یہ ہمارے محبوب و مطلق صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی۔

أدعوا لله وانتم موقنون بالاجابة تم دعا مانگو، اور تم کو اس کے قبول ہونے کا یقین ہو۔

حق تعالیٰ کا ایک نام عجیب بھی تو ہے، یعنی دعا اور سوال قبول کرنے والے، ان کا ارشاد ہے:

أَدْعُوْنِي اسْتَجِبْ لَكُمْ
مجھ کو پکارو میں تمہاری دعا قبول کر لوں گا۔

أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا
جب کوئی مجھے پکارتا ہے، تو میں پکارنے والے کی بات

دَعَاَنِ
کا جواب دیتا ہوں۔

من يدعوني فاستجب له
کوئی مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کر لوں

ما من مسلم يدعوا بدعاء
جو مسلمان کوئی دعا کرتا ہے، تو اس کی دعا مستجاب

الاستجابة له
ہوتی ہے۔

یہ ادا اس طرح کی اور یقین آفرینیوں کے بعد اور خود اپنے ذاتی تجربہ کے بعد ہم دعا کے ساتھ ہی اجابت کی قبولیت کے یقین کے ساتھ حق تعالیٰ کا اس نعمت پر شکر ادا کرنے میں جس کی ہمیں حاجت ہے اور یقین رکھتے ہیں یہ نعمت ہمیں حاصل ہو چکی ہے، گو کہ ابھی پردہ غیب سے اس کا ظہور نہیں ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ عام آدمی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے پہلے نعمت کا ظہور ہو چکا ہو وہ ظہور نعمت کے بعد شکر ادا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کی دعا اکثر موثر نہیں ہوتی، جو شخص نعمت الہی کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے اور حق تعالیٰ کا محض اس وجہ سے شکر ادا نہیں کرتا چاہتا کہ ابھی اس کی دعا کی قبولیت کے آثار و نتائج نہیں پیدا ہوئے ہیں، وہ ایمان کامل کی دولت سے محروم ہے، شکر گزار (شکرانہ ذاکر) و مطلق و فرمانبردار، روح حق تعالیٰ کی نعمتوں اور عنایتوں کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، تحمید و تسبیح ہم میں وہی شعور پیدا کرتی ہے جو ہم میں اس وقت خود بخود پیدا ہوتا، جب ہماری دعا قبول ہو چکی ہوتی!

ہم اپنا رخ اس ذات کی طرف کیے ہوئے ہیں، جو فاطر سماوات و ارض ہے، اس کے ثنا خواں ہیں، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کر رہے ہیں، عرض کر رہے ہیں کہ حق تعالیٰ آپ خیر محض ہیں، رحمت مطلق ہیں، فکر تمام ہیں، کماں مطلق ہیں، محسن ہیں، مکرم و منعم ہیں، مفضل ہیں، داب ہیں، نافع، حمیم و رحیم ہیں، عجیب ہیں، آپ ہمارے حالات میں کامل الہی تطابق پیدا کر رہے ہیں، یہ تطابق ہمارے

تخیل، ہمارے منصوبوں سے کہیں زیادہ کامل ہے، ہم نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کر دی ہیں اور اپنا منہ آپ کی طرف کیا ہے، اور اپنا کام آپ کو سونپ دیا ہے۔ (لا ملجاء ولا منجاء الا الیک!) اس دعا و شمار کے نتیجہ کے طور پر ہمارے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے، تاریکی دور ہو جاتی ہے اور قلب کی فضا نورانی ہو جاتی ہے، قلب مسرت سے بھر جاتا ہے، اطمینان، سکینہ، وقار، سرور کا مبداء فیاض کی جانب سے مسلسل فیضان ہونے لگتا ہے، باطن انوار و کیفیتِ محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، ہم جان لیتے ہیں کہ اب ہم حصارِ سلامتی میں ہیں، اور ہماری عاقلیہ عالمِ قدس میں پہنچ چکی ہیں، اب جو کچھ ہوگا، وہ خیر ہوگا! گو ابھی خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، معاملات ویسے ہی نازک ہیں لیکن ہمارا باطن یقین و مسرت سے پُر ہو جاتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایمان ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے، جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، ایمان ان اشیاء کی حقیقت یا جوہر ہے، جن کی ہم حق تعالیٰ سے توقع کرتے ہیں۔

اس یقین و مسرت و سکینت کی وجہ سے ہم پھر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی حمد و ثنا کرتے ہیں، تسبیح و تقدیس میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس نعمت کے لیے اس بخشش و فضل کے لیے جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے اور جس کا وقوع ابھی قریب نظر نہیں آتا، ممکن ہے کہ اس کا کچھ عرصہ کے لیے ظہور نہ ہو، وقوع نہ ہو، لیکن یہی عدم ظہور و عدم وقوع ہمیں اپنی قوتِ ایمانیہ سے کام لینے کا موقع عطا کرتا ہے کہ ہم اس یا رِ پسندیدہ کے حمد و ثنا میں مشغول و مصروف رہیں جس کے ہاتھوں میں سب کی بھلائی ہے، اور ہر چیز کا پورا اختیار ہے، فَسُبْحَانَ الَّذِي يُبْدِيهِ مَلَائِكَتٌ كُلِّ شَيْءٍ وَالَّذِي يَرْجِعُهُنَّ

جَامِي اَزْيَارِ پَسْنَدِيدِه مَبْرِيْدِه حَاشَا

کَاں پَسْنَدِيدِه جَزَا رِ پَسْنَدِي نَكْتَدُ

ہم شکر ادا کرتے ہیں، حمد و ثنا کرتے ہیں، اس نعمت پر بھی جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، لیکن جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے یقین دلاتا ہے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے ہمیں عطا کر دی ہے، اور وہ

ظاہر ہونے والی ہے، کہا جاتا ہے کہ جب بارش کی دعا کے لیے لوگ جمع ہونے لگے، تو ایک بچی اپنی چھتری ساتھ لیے دعا میں شریک ہونے پہنچی، اس کو یقین تھا کہ بارش اب قطعاً ہوگی، ہمارا ایمان بھی اس معصوم جان کی طرح ہونا چاہیے کہ سبدا رفاض کی جانب سے وہ نعمت ہمیں قطعاً عطا ہوگی جس کا سوال ہم نے کیا ہے! جس قدر ہماری قوتِ ایمانی قوی ہوگی اسی قدر ہمارے تمام امور میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوگی، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں گی، مومن اپنی قوتِ ایمانی ہی سے ہمیشہ کام لیتا ہے، اور کامراں ہوتا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس نعمت کا خارجی ظہور نہیں ہوتا، جب ایسا ہو تو یقین رکھو کہ یہ ہمیں ایک بہتر حالت کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہو رہا ہے اور ہمیں حق تعالیٰ کی حکمت و رحمت کا عمیق علم عطا کرنا مقصود ہے، اس لیے بچکے حزن و یاس کے ہمیں حق تعالیٰ کی حمد و ثناء میں مصروف رہنا چاہیے، یہ ہمارے ایمان کی بڑی آزمائش ہے، اس خاص وقت کی دعا یہ ہے :-

اللہم لك الحمد حمدا دائما مع	اے اللہ حمد تیرے ہی لیے ہے۔ ایسی حمد کہ تیری ہمیشگی کے
دوامك ولك الحمد خالد امع	ساتھ وہ بھی ہمیشہ ہے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی
خلودك ولك الحمد لا منتهی	حمد کہ تیرے دوام کے ساتھ وہ بھی دائم ہے، اور
لذدون مشیتك ولك الحمد	تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ اس کی انتہا تیری مشیت
لا یرید قائلہ الا رضاك ولك	کے ادھر نہیں اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ اس
الحمد حمدا عند كل طرفة عین	کے قائل کا مقصود تیری ہی خوشنودی ہے، اور تیرے
تنفس، اللهم اقبل بقلبی الی	چچ ہی لیے حمد ہے ایسی حمد جو ہر لپک بھپکانے اور سانس
دینك واحفظ من دراشئنا	لینے کے ساتھ ہوا، اے اللہ میرے دل کو اپنے دین کی
حرثبتنی ان	طرف متوجہ کر لے اور ہماری حفاظت ہمارے اوپر رکھ
اول واهدنی، ان اضل	اپنی رحمت کے ساتھ اے اللہ مجھے ثابت قدم رکھ کہ میں

ہم اس عین مصروف رہتے ہیں حق تعالیٰ کی ثنا و حمد میں مشغول رہتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ مصیبت سے نجات کا سامان پردہ غیب سے ظاہر ہوا ہے کہ نہیں اور بالآخر شعور کا وہ نکتہ نمایاں ہوتا ہے، جب اس نجات کا خیال ہی قلب میں خطور نہیں کرتا، اور ہم حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں صرف حق تعالیٰ ہی کی خاطر مشغول و مصروف ہو جاتے ہیں، رضا و موافقت مولیٰ کے مقام کی طرف ہمارا عروج ہوتا ہے، اب نہ ہم میں کوئی ارادہ باقی رہتا ہے، نہ کوئی خواہش، نہ فعل نہ اختیار، یہ سب ارادہ و فعل حق میں غائب و فانی ہو جاتے ہیں۔

آمد خبرے ز آمد او من بعد خبر نماند مارا

یہی شیخ جبل کے الفاظ ہیں الرَّاحَةُ الْكُبْرَىٰ وَالْجَنَّةُ الْمَعْجَلَةُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، اسی کا نام اطمینان قلب ہے جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ
بِذِكْرِ اللَّهِ الْأَبَدِيِّ وَاللَّهِ تَطْمَئِنُّ
الْقُلُوبُ! (پ ۱۳۴ ص ۱۰۶)

جو لوگ ایمان لائے، اور ان کے قلب اللہ تعالیٰ کے
ذکر سے مطمئن ہو گئے، ان اشرفی کے ذکر سے دل
کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اطمینان قلب یا نفس مطمئنہ کے حصول کے بعد بندہ مومن حق تعالیٰ سے راضی ہو کر حُبِّ ذات میں داخل ہو جاتا ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اذْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَأَدْخِلْنِي فِي
عِبَادِي وَادْخِلْنِي جَنَّتِي. (پ ۱۳۶ ص ۳۰)

یہی حریت نامہ ہے، یعنی حق تعالیٰ کا پانا اور ان سے راضی و مسرور رہنا:-

یا ربنا است چه حاجت کہ زیادہ طلبم

دولت صحبت آن مونس جاں مارا بس (حافظ)

فَلِلَّهِ الشُّكْرُ ذَرْهُمُ!

ضمیمہ

شکر کے ذریعہ سلوک کے طے کرنے میں مندرجہ ذیل دعائیں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں، سحر کے وقت ان کا ورد رقتِ قلبی کے ساتھ جاری رہنا چاہیے :-

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ الْيَاقِينِ إِنَّا الصَّغِيرُ الَّذِي رَبَّيْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الضَّعِيفُ الَّذِي قَوَّيْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْعَارِيُّ الَّذِي كَسَوْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْجَائِعُ الَّذِي أَشْبَعْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الضَّمَانُ الَّذِي سَقَيْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْفَقِيرُ الَّذِي غَنَيْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْبَاهِلُ الَّذِي عَلَّمْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْمُهَانَ الَّذِي كَرَّمْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا السَّائِلُ الَّذِي أَعْطَيْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الرَّائِبُ الَّذِي أَرْضَيْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْخَائِفُ الَّذِي أَمَّنْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْعَائِبُ الْعَيْبُ الَّذِي أَوْقَيْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْخَاطِبُ الَّذِي غَفَرْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الذَّائِلُ الَّذِي عَزَّزْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْمَجْهُولُ الَّذِي عَرَّفْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَإِنَّا الْعُورُ الَّذِي سَتَرْتَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ عَيَّيْتَنِي فِي كُلِّ كَرْبٍ فَلَكَ الْحَمْدُ وَأَنْتَ رَجَّيْتَنِي فِي كُلِّ شِدَّةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ وَأَنْتَ خَيْرُ الْأَوْلَادِ عِنْدِي فَلَكَ الْحَمْدُ وَأَنْتَ قَدِيمُ الْعَقْرِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلِعِزَّتِي لَسَوْءٌ عَلَيَّ قَطُّ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُوَاخِذْنِي بِمَعْصِيَتِي فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُثِمِّتْ بِي عُدُوِّي فَلَكَ الْحَمْدُ وَمَا يَثِبُ فَضِيحَتِي بِعَمَلٍ فَلَمْ تُعَدِّ بِي وَلَمْ تُفْضِحْنِي فَلَكَ الْحَمْدُ وَارْتَجَبُوا الْخَيْرَ فَتَبِيرُهُ وَأَخَافُ الشَّرَّ فَتُصَرِّفُهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَتَلَطَّفْتَ بِي فِي الصَّغْرِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَهَدَيْتَنِي لِلْإِسْلَامِ فِي الْكِبَرِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَآرَبَيْتَنِي التَّنْيَاتِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَعَلَّمْتَنِي مَا لَمْ أَكُنْ أَعْلَمُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَارزُقْنِي مَا لَمْ أَكُنْ أَحْسِبُهُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَتَحَنَّنْتَ بِي مَا لَمْ أَكُنْ مُقَرِّبًا فَلَكَ الْحَمْدُ عَظُمْتَ وَكَبَّرْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ بِكَ مَا صَبَّرَهُ وَأَمْسَى فَلَكَ الْحَمْدُ بِيَدِكَ مَوْتِي وَحَيَاتِي فَلَكَ الْحَمْدُ رَبِّ الرَّحْمَنِ

وَأَنَا أَسْأَلُكَ وَلَا تُعَذِّبْنِي وَأَنَا أَسْتَغْفِرُكَ رَبِّ لَا تُخْرِمْ نِي لِقَدِّ سُلَيْمِي وَ
 لَا تُعَذِّبْنِي لِكَثْرَةِ ذُنُوبِي وَارْحَمْنِي مِنْ أَجْلِ ضَعْفِي وَأَعْطِنِي مِنْ أَجْلِ
 فَقْرِي وَارْحَمْنِي وَأَعْفُ عَنِّي تَعْلَمُ مِنْ دُنُوبِي فَإِنْ تُعَذِّبْ
 فَإِنَّا الظَّالِمُونَ إِن تَعَفُّ فَإِنَّتِ، أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ
 وَإِنْ تَعَفُّ فَطَوَّلْ مِنْكَ وَإِنْ تُعَذِّبْ
 فَغَيْرُ ظَالِمٍ وَلَا مُسْتَوْلٍ

ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

گرچہ دیوار افگند سایہ دراز بازگرد سوئے اوآن سایہ باز

اس جہاں کوہ است فعلِ ماندا سوئے ما آید ندادا راصدا

قرآن عظیم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں ایک لامتناہی حکمت، رحمت و کرم کے ساتھ مصروف عمل ہے اور زندگی کے ہر قدم پر ہماری رہبری کرنے پر آمادہ ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں اور اعتصام کے طریقوں سے واقف ہو کر اس کے دامن میں خشک ماریں، ہمیں کائنات میں بے یار و مددگار بے ولی و نصیر نہیں چھوڑا گیا ہے، ساری زندگی لطفِ حق شامل حال رہتا ہے، زندگی حق تعالیٰ کی نعمت و فضل سے مملو ہو جاتی ہے، اطمینانِ قلب و جمعیتِ خاطر نصیب ہوتی ہے، اگر ہم رضا کے حق کے تابع ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو کافی سمجھ کر سارے کام ان کے سپرد کر دیں!

حق تعالیٰ ہمیں سلامتی و نجات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ
ان تجربات میں کامیاب کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور جن سے ہم خوفزدہ ہیں! اِنَّ
اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلٰى النَّاسِ (بقرہ ۳۲۶) وہ ہلکے ضعف و کمزوری سے واقف ہیں، وہ ہمارا
بوجھ بھکا کرنا چاہتے ہیں۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَاخْلِقَ الْاِنْسَانَ ضَعِيْفًا ذَلِيْلًا
۵۲ حق تعالیٰ ہمیں برترین مسرت عطا کرنا چاہتے ہیں اور اس سرور سے ہلکے قلب کو مملو کرنا چاہتے
ہیں جس کا خود ہمیں اندازہ نہیں فَلَا تَعْلَمُوْنَ نَفْسًا مَّا اَخْبَرْتُمْ لَهْمُ مِنْ قَوْلِنَا فَتَحْتَمِلُوْنَ جَزَاءَ مَا كَانُوا
يَعْمَلُوْنَ۔ آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان خزانہ غیب میں موجود ہے اس کی کسی کو خبر نہیں (البقرہ)

لے یہ مقالہ پہلی مرتبہ برہان بابت جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا

دنیا میں ہر جگہ ایک کامل الہی نظم موجود ہے جس میں توافق و ہم آہنگی بھی ہے اور سرور و سکینہ بھی! حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی اس نظم الہی کے دائرہ میں بسر ہو اور زمین پر رہ کر ہم جنت کی خوشبو سونگھے رہیں: **هُوَ الَّذِي يُصَلِّحُ عَلَيْكُمْ دِينَكُمْ وَ مَلَائِكَتُهُ يُخْرِجُكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَ كَانِ بِالْمُؤْمِنِينَ رَجِيمًا** (الاحزاب ۶۶) حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے مومن پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں، حق تعالیٰ انہیں تارکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ مومن پر بہت مہربان ہیں۔

اسی زندگی میں ہمیں نعمت مل سکتی ہے اور حق تعالیٰ ہی ہمیں اس کو عطا کر سکتے ہیں، **وَمَا أَلِمْتُمْ قَبْلَ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ**! اگر ہم حق تعالیٰ پر کامل بھروسہ کریں تو ہماری مثال اس درخت کی سی ہوجاتی ہے جو پانی کے چشمے کے بازو اٹکا رہی، ہر وقت روحانی قوت و حیات کے سرمدی چشموں سے ہمیں تازگی پہنچتی رہتی ہے!

صد جو عالم در نظر پیدا کند چونکہ چشمت را بخود بینا کند (رومی)
 اگر ہماری آنکھیں حق تعالیٰ کے مشاہدے کے لیے کھل جائیں اور ہم ہدایت و نظم الہی کے دائرہ میں اپنی زندگی بسر کریں تو ہماری ساری خارجی مشکلیں حل ہوجاتی ہیں یا غائب ہوجاتی ہیں:
 گر جہاں پُربرف گردد سر بسر تاب خور بگدازوش از یک نظر (رومی)
 اس عقیدہ یا ایمان کی مضبوط چٹان پر کھڑے ہو کر زندگی کے کچھ قدیم دستور اصول ہم سے سنو اور زندگی کے تجربات، حالات یا ماحول میں ان سے کام لو، زندگی "گریہیم" نہ رہیگی، "خندہ یکدم" ہوجائیگی!

یاد رکھو کہ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ ہماری باطنی زندگی یا نفس، جیسا ہوگا ویسا ہی عکس ہمارے خارجی حالات ہونگے، ویسا ہی ہمارا آفاق ہوگا۔ آفاق تابع النفس ہے۔ آفاق میں تغیر نفس کے تغیر کا تابع ہے۔ اس صداقت کو قرآن حکیم نے ایک سے زیادہ جگہ واضح کہا ہے، شک و شبہ سے نکالنے کے لیے ہم اس کا ذکر کر رہے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا وَ اَقَمِ لِحَقِّ اللّٰهِ كَيْفَ تَقُوْمُ كِيَوْمِ تَقُوْمُ

مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الرعد ۲۶) جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے
 ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا یہ بات اسی سبب سے ہے کہ حق تعالیٰ کی نصیحت
 نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُفْتَرُوا کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ
 مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الاتفال ۷۶) وہی لوگ اپنے انفس کو نہیں بدل دالتے۔

خارج کا تغیر، ماحول کا بدلنا، حالات پر قابو پانا ہو تو باطن کا تغیر، انفس کا بدلنا ضروری ہے
 اگر باطن میں کجی ہو، انفس خام و ناشائستہ ہو، تو خارج میں کجی، ناہمواری، عدم توافق یا دوسرے الفاظ
 میں درد و غم، قلت و اقلل، ضیق و پریشانی کا ہونا ضروری ہو۔

باطن یا انفس سے مراد ظاہر ہے کہ نفس اور اس کے صفات ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے
 افعال و اعمال ہیں۔ اب ماحول کی ناسازگاری، ضیق و پریشانی، رنج و غم، غم و الم راست نتیجہ میں
 باطنی زندگی کا یعنی رذائل اخلاق کا، اتباع ہوا کا، جرم و معصیت کا، بدکرداری و گناہ کا، قرآن
 مبین نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فِيمَا كَثِيرٌ (شوریٰ ۵۶) اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہو وہ تمہارے ہی
 كَسَبَتْ آيِدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْكُمْ ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہر اور بہت
 کثیر (شوریٰ ۵۶) تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی اصول کو کسی اور جگہ اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

أَدَلَمَّا أَصَابَكُمْ مِّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَذَا؟ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (پ ۸۶۳) اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی کہ تم اس سے
 دو چند پہنچا چکے ہو تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی؟ آپ فرمادیں گے کہ یہ تکلیف تم کو تمہارے
 ہی طرف سے پہنچی۔

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا:

انما هي اعمالكم ترد عليكم یہ تمہارے اعمال ہیں جو تم پر لوٹتے جاتے ہیں۔

دوسری جگہ یوں لکھا :

إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُخْصِيهَا يَا
عَلَيْكُمْ فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَيُحْمَدُ (تمہارے نامہ اعمال میں لکھواتا جاتا ہوں کہ ان کا پورا پورا بدلہ تم
اللہ ومن وجد غيرهما فلا كونه) اگر تم میں سے کوئی خیر پائے تو اللہ کا شکر کرے اور اگر
يلومن آت نفسه . اس کے خلاف پائے تو سوائے اپنے نفس کے کسی پر ملامت نہ کرے

اس اصول کی وضاحت میں صوفیہ کرام نے جو مثال استعمال کی ہے وہ نہایت صحیح اور
صاف ہے، وہ شخص اور اس کے سایہ سے اس اصول کو سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ظل یا سایہ شخص
کے تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے ٹیرھی ہو تو اس کا سایہ بھی ٹیرھا ہوگا اور اگر سیدھی تو سایہ بھی سیدھا
ہوگا۔ نفس شخص کی مانند ہے اور باحوال اس کا سایہ ہے، یا صفات و اعمال شخص کی مثال ہے، حالات
واقعات ان کا عکس و سایہ ہیں۔ شیخ ابوالنجا اپنے احباب سے کہا کرتے تھے۔

اعلموا ان جميع الوجود يقابلكم بحسب يعني "جان لو کہ جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں وہ
ما برز منكم من الاعمال، فانظروا ہی تمہارے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، اسی لیے ذرا
كيف تكونون، فان الظل تابع اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے
الشخص في العوج والاستقامة تابع ہوتا ہے کبھی و راستی ہر دو میں۔

اس صداقت پر امام شعرانی کو اتنا یقین تھا کہ اگر اپنے دوستوں یا بیوی یا نوکروں سے کجروی یا
نشوز و گریز اپنے معاملہ میں پاتے تو ذمہ دار اپنی ذات کو کھٹراتے اور اپنے ہی پر ملامت کرتے۔ ان
کا یہ قول مشہور ہے۔

إِنَّ الوجود يعاملني على صورة عاملته يعني "لوگ میرے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں
یہ، فاللوم على لاعلمهم في الاصل جیسا کہ میں ان کے ساتھ کرتا ہوں، پس مانت
لانهم كظل الشخص على حد سواء میری ہی ذات پر چونکہ ان کی ذات پر کیونکہ
فان كان الشخص مستقيماً فالظل ان کی مثال کسی شے کے سایہ کی مانند ہے۔ اگر

مستقیماً او اعوج فالظل اعوج شے سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہے اور اگر شے
ومن طلب لاستقامة الظل طیرسی پر تو سایہ بھی ٹیڑھا۔ جس شخص نے اس بات
مع عوج الشاخص فقد دام کی توقع کی کہ طیرسی شے کا سایہ سیدھا ہوگا تو
المحال۔ اس نے محال کی تمنا کی

قرآن عظیم نے کل نفس بما کسبت رھینہ اور کل امری بما کسبت رھینہ اور لھا ما
کسبت وعلیھا ما کسبت اور من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فطیفا کما کر
اس صداقت کی توضیح کی ہے، اس اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو! یہ وہی اصول ہے
جس کو امیر مینائی نے عاشقوں کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

یہ رونا بھونائی کا یہ شکوہ کج ادائیگی کا سزا بردل لگنے کی امزہ پر آخانی کا
فلسفہ اخلاق کی زبان میں اس کو یوں بیان کرتے ہیں: الناس مجزیوں باعمالہم
ان خیرا فخر وان شرافش۔ لوگوں کو اعمال کی جزا ملتی ہو اگر اعمال اچھے ہوں تو ان کی جزا
بھی اچھی ہوتی ہے، اور اگر اعمال بد ہوں تو ویسی ہی ان کی جزا ہوتی ہے!
بنیادی اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب ماحول یا واقعات زندگی کے سلسلہ میں تمہیں چند
باتیں سمجھنی ضروری ہیں۔

اوپر بیان کیے ہوئے اصول پر غور کرنے سے تمہیں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ
زمین و آسمان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے لیے کا بدلہ دیا جائے اور قرآن
کریم نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کر دی ہے:-

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکمت کے ساتھ
يَجْزِي كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُوَ پیدا کیا کہ ہر شخص کو اس کے لیے کا بدلہ دیا جائے
لَا يُظْلَمُونَ۔ (الہامیہ ۲۶) اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جائے۔

یاد رکھو کہ زندگی کا مقصد طفل شیرخوار کی طرح ہماری دایہ گری کرنا نہیں! یہ فرائض و واجبات کا

ہیں دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تجربات کے ذریعہ سیرت کی تکمیل کریں، اپنی پوشیدہ و
 منفرد روحانی قوتوں کو ظاہر و نمایاں کریں جو الٰہی قوتیں ہم میں بالقویٰ ہیں انہیں بالفعل کریں
 اور ہم اسی صورت میں ارادۃ اللہ کے ساتھ توافقی قائم کر سکتے ہیں جب ہم اپنی زندگی کے واقعات و تجربات
 کے ساتھ برضا و رغبت اشتراکِ عمل کریں، اور جو سبق وہ ہمیں سکھانے کے لیے رو نما ہو رہے ہیں انہیں
 سیکھیں نہ کہ ان سے تجاہل برتنے کی کوشش کریں:

در ریاضِ بندگی رعنا تر از شلخِ گلست گروئے کز بارِ تسلیم و رضا خم می شود!

تمام تجربات کا مقصد یہ ہے اس راہ پر لے چلنا ہے جو خدا کی طرف لے جاتا ہے ہم اپنے جبل
 کی وجہ سے اس راہ سے بھٹک جاتے ہیں، دور جا پڑتے ہیں! جذبات و شہوات ہمیں صراطِ
 مستقیم سے ہٹلے جاتے ہیں، صراطِ مستقیم کی طرف ہلکے قدم اسی وقت اٹھ سکتے ہیں جب
 ہماری سیرت کی تکمیل ہو اور ہمارا روحانی ارتقا عمل میں آئے، اب زندگی میں رو نما ہونے والے سبق
 تجربات و واقعات ہماری سیرت کی تکمیل کرتے ہیں اور ہلکے روحانی ارتقا میں مدد دیتے ہیں تاکہ ہم
 اس صراطِ مستقیم پر چلیں جو حق تعالیٰ کی طرف ہمیں لے جاتی ہے۔ لہذا تجربات و حالات خوشگوار ہوں
 یا ناخوشگوار، مسرت بخش ہوں یا غمناک، بہر طور یہ ہلکے خیر برتے کے حصول کے لیے ضروری و لا بدی
 ہیں، ان میں ہلکے لیے ہدایت کا ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے اور جس پر عمل پیرا
 ہونے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے اور جوں ہی ہم نے اس ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہمیں
 شقاوت و گمراہی سے نجات مل جاتی، اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج ضیق، خوف و حزن
 سے بھی!

مَنْ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ تُو جُو شخص میری اتباع کرے گا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور
 وَمَنْ أَعْرَضَ عَنِّي ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ نَعْتًا وَنَحْسًا تُو جُو اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض
 مَعِيثَةً ضَنْكًا وَنَحْسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا عینا ہوگا اور قیامت
 آغوشی (طہ ۱۷) کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

ہر تجربہ، ہر واقعہ زندگی کا خیرِ امتنا ہی کی طرف لے جاتا ہے، تصادم کی بجائے اس سے توفیق ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے، رضا بالقضائے اس کو کہا جاتا ہے، ہماری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں نازل ہوتا مگر وہی جو حق تعالیٰ نے پہلے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ پہلے سے مولیٰ ہیں، آقا ہیں ہمیں اپنے سب کام انہی کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

شاد و خداں پیش تیش سربہ، ہجو آھیل پیش سربہ (رومی)

تمام تجربات و حادثات دوا و معالجہ کی غرض سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں، پھر ان دردناک حادثات کی تکرار عموماً نہیں ہوتی، پھر راحت و طمانیت ہی میں زندگی گزرتی ہے۔

بسود گرم جہاں خاطر چوراضی شد تمام عمر تر آب سرد و نان گرم است (سلیم)

جب تک ہم حادثاتِ زمانہ سے سبق نہیں لیتے بجز وہی و گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں، اتباعِ شہوات میں گرفتار رہتے ہیں اور ان مصائب و آفات کو خود پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے ہم نجات پانا چاہتے ہیں، جب ہم نے سبقِ ہدایت حاصل کیا، ہماری سیرت بدلتی ہے۔ ہم میں تقویٰ کے صفات پیدا ہوتے ہیں، ہمارا نقطہ نگاہ بدلتا ہے، قانونِ الہی کے مطابق ہم فکر کرنے لگتے ہیں، حق تعالیٰ سے ربط قائم کرنے لگتے ہیں، ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ آفات و مصائب کا دور و جس غرض کی تکمیل کے لیے ہو رہا تھا اب وہ غرض چونکہ پوری ہو چکی ہوتی ہے، وہ بھی بتدریج غائب ہونے لگتے ہیں۔

دردناک تجربات و حادثات ہی سے ہمیں سبقِ ہدایت حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ ان تجربات و حالات سے بھی جو خوشگوار اور راحت بخش ہوتے ہیں سبق لیکھنا ضروری ہے۔ آسائش و نعمت کی حالت میں بھی ہمیں شکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کی یاد میں رہنا چاہیے چنانچہ تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے

فلیکثر الذعاء عند الرجاء عین و آسائش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو۔

چین کی حالت میں دعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر نعمت کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھا جائے وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ کیونکہ درحقیقت منعم وقاسم نعمت حق تعالیٰ ہی ہیں، لہذا ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے جب ہمیں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں، جب ہم عافیت کی حالت میں ہوتے ہیں، جب ہمیں صحت و تندرستی ملتی ہے، امراض و آلام سے محفوظ ہوتے ہیں، فراخی و آسائش سے متمتع ہوتے ہیں تو یہ سب ہماری آزمائش و ابتلا کے لیے ہوتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اس عافیت کے نتیجہ کے طور پر ہم میں کبر و عجب تو نہیں پیدا ہو گیا، ہم شہوتوں اور لذتوں کے درپے تو نہیں ہو گئے، موجودہ نعمتوں کو حقیر و خوار تو نہیں سمجھنے لگے اور ان نعمتوں میں عیب و نقصان تو نہیں نکالنے لگے؛ دیکھا جاتا ہے کہ کیا نعمتوں اور راحتوں کی وجہ سے ہم حق تعالیٰ کی اطاعت سے روگرداں ہو کر گناہوں اور معصیتوں میں منہمک تو نہیں ہو گئے! اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ نعمت کی آزمائش مصیبت کی آزمائش سے زیادہ سخت ہوتی ہے، خوشی کا فتنہ تکلیف کے فتنہ سے بہت بڑا ہوتا ہے! صاف بات ہے کہ گناہوں پر قدرت ہونے کے باوجود ان سے رک جانا یا صبر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے! عیش و آرام سے انسان کا جسم فریب ہونے لگتا ہے عیش و آرام بغیر اس کو صبر نہیں آتا اور دوام عیش اسی وقت ممکن ہے جب اس کے حصول میں وہ لوگوں سے مدد چاہے اور ظالموں سے التجا کرے اور یہ امور نفاق، کذب، ریا، بغض، دشمنی کا سبب ہو جاتے ہیں اور ان سے تمام روحانی سلکات پیدا ہوتے ہیں، قلب کے سارے امراض جنم لیتے ہیں، اسی لیے صادق مصدق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ”دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے!“

جب انسان نعمت و عافیت کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ عموماً حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے، از دیار دولت کی تدبیریں، اپنے بچاؤ کا خیال، مال کی حفاظت کا بندوبست، اس کے خرچ کرنے کا انتظام، یہ تمام امور اس کے قلب پر هجوم کرتے ہیں، اور یہ سب اس کے

لصاحب الدنیا راس کل خطیئة (رواہ البیہقی فی الشعب وابن ابی الدنیا)

دل کو سیاہ کرتے اور حق تعالیٰ کی یاد سے غافل کرتے ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

الْفُكْمُ الشَّكَاظُ مُمَخْتِي نُرْدَتُهُ غَفَلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص کے یہاں

المَقَابِرِ تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو

اسی لیے عیش سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

فرمایا کہ تم تنعم سے بچو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش کرنے والے نہیں ہوتے (إِنَّ عِبَادَ اللَّهِ لَيُسُو

بِالْمَتَعَمِينَ)

یعنی کہ نعمت کا فتنہ مصیبت کے فتنے سے بہت زیادہ سخت ہوتا ہے اور نعمت و مصیبت

ہر دو ہمارے لیے ابتلا دیا آزمائش ہیں! اسی حقیقت کو قرآن حکیم میں حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں:

وَقَطَعْنَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَّمًا مِنْهُمْ ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں۔

الضَّالِّحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ وَ ان میں سے بعض نیک تھے اور بعض اور طرح

بَلَوْنَهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّكُمْ کے اور ہم ان کو خوش حالیوں اور بد حالیوں

يَرْجِعُونَ (پ ۱۱۶) سے آنکھیں کھولیں۔

اسی طرح فرمایا:

وَنَبَلَّوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (پ ۱۳۶) اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اسی طرح آنکھیں کھولیں۔

نعمت و عافیت کی حالت میں مرد مومن مشکور ہوتا ہے، یہی اس حالت کا ادب ہے۔

المؤمنُ مَشْكُورٌ عِنْدَ الرَّحْمَاءِ مومن چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے

دل و زبان و اعضا کے فکری سے نعمتیں سلب نقصان سے محفوظ ہوتی ہیں اور ان میں اضافہ

ہوتا ہے!

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ اگر تم شکر کرو تو بیشمار نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں

خوب سمجھ لو کہ اجابت دعا، رزق و عطا، توبہ و مغفرت کا انحصار اپنی مرضی پر رکھا ہے کہ چاہا

تو دیا، چاہا تو نہ دیا، لیکن شکر کے سوا دوسرے میں زیادتی نعمت بلا تعلق ہے! اسی لیے حضور انور صلی

نے سرایا:

مَنْ نَزَلَتْ إِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا جِس كُو نِعْمَت لے وہ اس کا شکر ادا کرے!

نیز فلیکنزل الدعاء عند الرخاء چین و آسائش کی حالت میں زیادہ دعا کرتے رہو
زندگی کے تجربے، حادثے، تغیر و تحول ہماری آزمائش، ہماری سیرت کی تعمیر و تکمیل، ہماری
صلاحیتوں کو بیدار کرنے، بالقوی کو بالفعل کرنے ہی کی غرض سے رونما ہو رہے ہیں، ان کی
دو قسمیں ہیں ملامت و ناملاتم اور انسان کے نفس کی بھی دو حالتیں ہیں، تیسری حالت نہیں۔
ایک عافیت دوسری بلا، ناملاتم یا دردناک حادثات کا درد اس لیے ہوتا ہے کہ ہم کجروی سے
باز آجائیں، شہوتوں کے اتباع سے رک جائیں، سیرت کی اصلاح کر لیں! سو ہانِ قضا ہما
بیکر خالی کو پختہ دہوار بناتا ہے، اس کی کمی و خامی کو غم و الم کے انگارہ سے دور کرتا ہے بقول آقا:

ہمان ما کہ جزا نگارہ نیست اسیر القلاب صبح و شام است
ز سو ہانِ قضا ہوار گرد ہنوز این سپر گل ناتمام است

فحس کی اس حالت کو بلا و مصیبت کی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ملاتم یا نعمت و عافیت کے حالات سے بھی ہماری آزمائش ہوتی ہے، اگر ہم ان حالات میں
یا حق سے غافل نہ ہو جائیں، اپنا رخ حق تعالیٰ ہی کی جانب رکھیں، ان کی نعمتوں کو ان کی
مرضی کے مطابق استعمال کریں تو ہم اپنے باطن میں یہ ندا سنتے ہیں:-

أَرْكَضُ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسِلٌ اپنا پاؤں مارو یہ نہلنے کا ٹھنڈا پانی ہے
بَارِكْ وَ شَرَابٌ (پتہ ۶۱۱) اور پینے کا۔

یعنی ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت، لطف و منت کے دریا سے سیراب ہوتے ہیں، ہم پلان
کی نعمت و ناز و محبت کے دروازے کھل جاتے ہیں، ظاہر و باطن کی نعمتیں ہم پر تمام کر دینا
ہیں اور حق تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ہماری پرورش و پرورش کرتے ہیں اور یہ حالت
سوت کے وقت تک باقی رہتی ہے اور موت کے بعد وہ اپنے فضل و کرم سے ایسی نعمت عطا

کرتے ہیں جس کو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا اور نہ کسی کے دل پر اس کا خطرہ گزرا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجده ۲۶)

ناملائم یا دردناک واقعات و حادثات پر غالب آنے کا طریقہ تامل، عجز، کسل، صبر، ہزول، ماتم و سینہ کو بی نہیں، نہ مزاحمت و مقابلہ، سرکشی و سب و شتم ہی ہے بلکہ جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی ان حادثات کے سبق ہدایت سے مستفید ہونا، صبر و استقامت، حکمت و عقلمندی سے اپنی سیرت و اخلاق میں تغیر پیدا کرنا ہے! ہم میں سے اکثر کے لیے اس امر کا اعتراف سخت مشکل ہے کہ ہماری زندگی میں جو کچھ بھی درد و غم، اندوہ و الم کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس کی اصلی علت خود پہلے نفس میں پوشیدہ سرگرم عمل ہوتی ہے، شیخ محمد الدین اکبرؒ کی یہ تہنیت کہ "یلاک کسبتا و فوک فحہ" یہ تیرے دونوں ہاتھوں کی کمائی ہے اور تیرے منہ کی مانگ ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور ہم الزام زندگی پر رکھتے ہیں، حق تعالیٰ پر تہمت لگاتے ہیں یا اپنے ہم جنسوں کو مستہم ٹھہراتے ہیں، اور اس سبق کو سیکھنے سے انکار کرتے ہیں جو حادثات و المناک واقعات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی لائقناہی حکمت میں سکھلانا چاہتی ہے۔ ہم ٹوٹے ہوئے دل لے کر چیخ اٹھتے ہیں کہ "لوگو! دیکھو، میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہے! ایک مصیبت ختم نہیں ہونے پاتی کہ دوسری اس سے زیادہ آفت مجھ پر نازل ہوتی ہے!

بتلاؤ میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب میری تقدیر کا نوشتہ ہے! اہلے تقدیر!

ظالمے دارم آنکا زپے آب

گر دم سوئے بھر بر گرد

ور بدوزخ رومے آتش

آتش باز رخ نسرده تو گرد

ور زکوه التماس سنگ کنم

سنگ نایاب چوں گھر گرد

گر سلایم بر دم بہ نزو کے

ہر دو گو شتم بکرم کر گرد

در بصر ا روم بختن خاک

خاک عالی بدوزخ زر گرد

این چہیں حالہا بہ پیش آید

ہر کرا روزگار بر گرد

لے دیکھو فنون الغیب علیہ السلام

سورۃ الطغیہ

لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہلکے روحانی ارتقا کے لیے جن حالات کی ضرورت ہے ہم خود انہیں اپنی طرف جذب کرتے ہیں، ان تمام بلاؤں اور آفتوں کا باعث خود ہم ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع و مانع الفاظ میں ہماری تھری متبع و شیعہ مطاع خواہشات نفسانی جن کا اتباع کیا گیا اور وہ مرض جس کی پیروی کی گئی ہے، جب ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ ازماست کہ برماست "ازماخیزد ہر ماریند" اور زندگی میں کامل انصاف ہے تو پھر ہم صحیح اٹھتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ
النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ وَيَسْئَلُونَ
بِشَيْءٍ لَّهُمْ لَعْنَةً وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

بہم اپنا رخ حق تعالیٰ کی طرف کر لیتے ہیں "انصار اللہ" بن جاتے ہیں، حق تعالیٰ کی مخالفت ترک کر دیتے ہیں، ان کے قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتے، ان کے قوانین کی پابندی نے لگتے ہیں، اسی میں ہماری عظیم الشان کامیابی ہے!

احول پر غالب آنے کا بس یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے قلب کا جائزہ لیں اور خارجی مشکلات و آفات کے اسباب و علل کی تلاش و افسس میں کریں۔ اگر ہم دیکھیں کہ حق تعالیٰ کی محبت سے ہوا قلب عاری یا خالی ہے، ذیوی لذتوں اور شہوتوں سے مملو ہے، اس کے کردار پر گریہ ہو، اس کے رنگ و بو پر فدا، اس کے خندہ گریہ آمیز مرقبان، تو ہمیں اپنے نفس کو مخاطب کہہ کے کہنا چاہیے کہ

فَلَا تَحْزَنْكُمْ أَلْمِئَاتُ الَّذِينَ يَبَايَعُونَ
بِغَيْرِ اللَّهِ وَالْعَرُودُ رِجَالٌ لَا يُلَاقُونَ
الْحَرْبَ وَلَا يَدْرُونَ الْحَرْبَ

انفس کے تغیر کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیے اور اس وقت کے انتظار میں نہ رہنا چاہیے جب حالات کا نزول ہونے لگے اور ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑے۔ عموماً ایسی ہوتا ہے کہ ہماری یہ کاری کی سے ہلکے قلب کی محبوب ترین چیز ہم سے چھین لی جاتی ہے، اور اس وقت ہم شدتِ حزن سے

فریاد غم سے ہر چیز سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کے قدموں پر گر جاتے ہیں اور ہمارے قلب سے چیخ نکلتی ہے۔

اللَّهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِي وَتَرَى

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا

مَكَانِي وَتَعْلَمُ مِثْرِي وَعَلَانِيَتِي

ہر اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے! تجھ سے میری

لَا يَخْفَى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ اَمْرِي

کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ ہوں

وَ اَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ الْمُسْتَفِيتُ

محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں ترساں

لِلْمُتَجَبِّرِ الرَّجُلِ الْمَشْفِقِ لِلْمَقْرَءِ

ہوں، ہراساں ہوں اپنے گناہوں کا اقرار کرنے

الْمُعْتَرِفِ بِذُنُوبِي اَسْأَلُكَ

والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، ترے آگے

سَأَلَةَ الْمَسْكِينِ وَابْتِهَالُكَ

سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں تیرے

ابْتِهَالُكَ لِلذَّنْبِ الذَّنْبِ اِدْعَاؤُكَ

تگے گڑا گڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل و خوار گڑا گڑاتا

رُغَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيءِ وَرُغَاءَ

ہر اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوف زدہ آنسو

مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتَهُ وَ

رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس

فَاضَتْ لَكَ عِبْرَتُهُ وَذَلَّكَ

کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور اس کے آنسو

جَسَدِهِ وَرَغْمَكَ اِنَّهُ اَللَّهُمَّ

بہرے ہوں اور تن بدن سے وہ ترے آگے فرو تھی

لَا تَجْعَلْنِي بِذُنُوبِكَ شَقِيًّا وَكُنْ

کیجئے ہوتے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑتا ہوا ہے

لِي سَرْمُوقًا رَحِيمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُولِينَ

اگر تجھ سے دعا لگنے میں ناکام نہ رہ سکے اور میرے

وَيَا خَيْرَ الْمُعْطِيينَ !

حق میں بڑا مہربان نہایت رحیم ہو جاؤ گے سب مانگے

رُكُوْا اَسْأَلُ مِنْ اَبْنِ جِبَالِشَ وَرَبِّ بَيْتِ جِبْرِائِيلَ

جاملے والوں سے بتوں کے سبب دینے والوں سے بتوں

بِلا کے نزول کے بعد ہم وہی کرتے ہیں جو نزل سے پہلے بھی رضا و رغبت کے ساتھ کر سکتے

تھے غم و الم کے انکار سے بچنے کے پہلے اگر ہماری عہدیت، کی ہی کیفیت ہوتی تو ہم پر یہ عذاب

ہی نازل نہ ہوتا:

مَا ضَعَلَ اللهُ بِعَمَلٍ يَكُوْنُ شُكْرًا اِنَّهُ تَعَالَى كَمَا كُوْنُ مَطْلَبًا لَكَ اَنْ تَجْعَلَ اَنْ تَعْلَمَ

اللہ تعالیٰ تم کو طلب سے کر لیا اگر تم فکر کرو

کامیاب زندگی کا قرآنی تصور

۶۔ تقصیر مکن دانہ خود را شجرے کن (صاب)

کامیاب زندگی! کتنا پاکیزہ، کتنا بلند نصب العین ہے، زندہ دلوں کا مقصود ہے، مطلوب ہے، محبوب ہے، اس کے چہرہ زیب سے ذرا لعاب تو اٹھا دو، دن کی پوری روشنی میں اس محبوب کے ضد و قال نظر آئیں اور ہم چیخ اٹھیں۔

دستے کہ سیکر تو ہیں آبِ تاب بخت گرد رہت بر آئینہ آفتاب رخت (بخودروانی)
ورنہ بقول عرفی "خوابِ نادیدہ" کی تعبیر تو کچھ بے معنی چیز ہوگی۔

کامیابی کا لفظ آپ اپنا مفسر ہے، مقصود کا پانا کامیابی ہے، زندگی وہ کامیاب ہے جو اپنے مقصود سے ہم آغوش ہے، اب زندگی کا مقصود کیا ہے؟ بچوں کو سادہ زبان میں سمجھا کر اس سوال کا جواب پوچھو، تو وہ کھیل کود، تماشاء، امور و لعب ہی کو مقصود زندگی قرار دینگے۔ لیکن جب بچپن کی منزل سے گزر کر جوانی کی دلفریب وادی میں قدم زن ہوتے ہیں، تو اب ان کا مقصود نئی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے، اب وہ زیب و زینت و آرائش و زیبائش اور تفاخر کو غایتِ حیات قرار دیتے ہیں، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو تمام "اقدار" سے بالاتر! التباس کا یہ زمانہ بھی گریز پاتا ہوتا ہے، اور وہ بہت جلد زینت و تفاخر کو بچپن کی بے معنی خواہش سمجھنے لگتے ہیں۔ جب ان کی عقلوں میں غمگی پیدا ہونے لگتی ہے تو پلٹ کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہیں، اور کہہ اٹھتے ہیں

اے آنکہ تمام آرزو ہوئی طفلی مستی منجلی خود چہ کسی! (ربیع و اخلا)

اب زینت و آرائش سے زیادہ ٹھوس قیمتوں کی طرف ان کی نگاہیں اٹھتی گئی ہیں، وہ صالح دولت کے بگاڑ، جاہ و مرتبت کے ترفع کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتے ہیں، اوز بچپن اور جوانی کی خام آرزوؤں کو خطا اورستی سے تعبیر کرتے ہیں، پختہ عقل کی پسند کی ہوئی قیمتیں اب ان کا نصب العین ہوتی ہیں، انہی کے حصول میں وہ شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ بس ملن کو پا کر وہ سائے عالم سے غنی ہو جائیں گے، طمانیت قلب ان کو میسر ہوگی، اور راحتِ جان نصیب! اسی مغالطہ میں ان کی زندگی کے مختصر و معین دن گزرتے جلتے ہیں، رنج و راحت کی مقدر مقدار انہیں ملتی ضرور ہے لیکن اہل کی درازی اور عمر کی کمی بالآخر ان کی زبان سے یہ کہلواتی ہے۔

شد عمر تمام و نامتسا میم ہنوز درد و نوح حسرتیم و خایم ہنوز
 عمریت کہ در راہ طلب گام ز نیم دی طرفہ کہ در نخست گایم ہنوز (ہومن یزدی)

پیری کی منزل میں قدم بکھرا انسان کی بصیرت میں عموماً روشنی پیدا ہو جاتی ہے، اب وہ زندگی کے مختلف تجربات سے واقف ہو جاتا ہے، ان کے تمام التباسات کو جانتے لگتا ہے اور نظر کا دھوکا جس کا ہر قدم پر جوانی میں وہ شکار ہو رہا تھا، اب اس سراب کو آبِ خوب کو خرابِ عطر کو شراب کہنے اور سمجھنے پر مجبور نہیں کرتا، اب وہ اشیا کے حقائق کا کسی قدر عارف ہو جاتا ہے، زندگی کے گونا گوں تجربات کا ذخیرہ تصورات کی شکل میں اس کے حافظہ میں محفوظ ہوتا ہے، ان ہی سے کام لے کر وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہو جاتا ہے، اس کا تخیل زندگی کو ہری بھری کھیتی کے مشابہ پاتا ہے، جس کی چند روزہ رونق و بہار نظر فریب ہوتی ہے، دلکش ہوتی ہے ہوش رہا ہوتی ہے، فریب خوردہ عقل اس کو دائمی اور مستعمل سمجھتی ہے، اس کی پریشانی لگتی ہے، اس کو اپنا مطلوب بنا لیتی ہے، اور اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے، یکایک اس کھیتی کا رنگ بدلنے لگتا ہے، یہ زرد پڑ جاتی ہے، آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں۔ گان نہ تعن بالامس!

احوال جہاں واصل ہیں عمر کہ بہت خوبے و خیلے و فریبے و دے است (خیام)
قرآن کریم نے اس حقیقت کو چند پاکیزہ جملوں میں یوں ادا کیا ہے :-

إِعْمَلُوا إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ تم خوب جان لو کہ نبوی حیات محض لہو و لعب اور

لَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال

فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمِثْلِ نَخْلٍ فِي الْأَمْوَالِ واولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ تہلانا

أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهَيَّبُهُ مَقْرَءٌ ہر جیسے پتھر کی اسکی پیداوار کا شکاروں کو اچھی

مُضَعَّرٌ ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ﴿٦﴾ معلوم ہوتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، تو اس کو زرد

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی) دیکھنا ہے، پھر وہ چمچا چمچا ہو جاتی ہے

بہتوں کے لیے زندگی کا مقصود یا تو لہو و لعب ہے یا زینت و تفاخر، یا تکاثر اموال و اولاد،
فلسفیانہ و اصطلاحی زبان میں اس کی تحلیل کرو تو معلوم ہو گا کہ اہل دنیا برترین اقداریا
تولذت کو قرار دیتے ہیں یا دولت کو یا شہرت کو، اور دولت و شہرت سے بھی ایک قسم کی
لذت و راحت ہی مطلوب ہوتی ہے، اور ان کے نزدیک کامیاب زندگی سے مراد وہ زندگی
ہے جو ان کی تھقیق میں کامیاب ہوتی ہے۔ ہیں ذرا سنجیدگی سے یہاں زندگی کے ان
اقداریا غایات کا امتحان کرنا ہے :-

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ گنی

کیا لذت مقصود زندگی ہو سکتی ہے؟ کیا ہم لذت اندوزی اور دل خوشی کے لیے پیدا ہوئے
ہیں؟ کچھ مفکرین کا یہ خیال ضرور رہا ہے، مشرور و درس کا خیال تھا کہ ہر اچھی چیز کا تعلق شکم سے
ہوتا ہے اور فراموشی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا لور و مرکز آل تناسل ہے،
سائرنی مذہب کا ہانی اس بتوس لذت ہی کو مقصود حیات قرار دیتا ہے۔ اپنے پیروں کو اس

لہ اور انسان کی حالت کئی سے بہتر نہیں جو ہمیشہ علو سے ہی کی شیفٹ ہوتی ہے۔

ہر جا کہ گس پدے بلاد چ پست جز شیفٹ و رہودہ علوانیت رحمانی استرادی

اس کی تلقین تھی ۷

ہجومت اعتقاد باید کردن مژ خوردن اندوہ جہاں نا خوردن

اپیکورس خوش باشوں کا بادشاہ اپنی اخلاقیات کا اولین محرک جلب لذت اور دفع الم قرار دیتا ہے، لیکن اتنی بات مسلم ہے کہ لذت کو خیر برقرار دینے سے اپیکورس کی مراد کسی عیاش کی لذتوں سے تھی نہ شہوانی تعیشات سے بلکہ بدن کا درد و الم سے اور روح کا پریشانی و غم سے نجات دہانا اس کے پیش نظر تھا، فرصت کی زندگی ہو، آلام و افکار سے نجات ہو، دوستی و محبت کا لطف ہو، فلسفے کا مطالعہ ہو، یہ تھے لذت کے تصنیفات

اپیکورس کے خیال میں، خیام کی زبان میں ان کو اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے ۷

تنکے مریعل خواہم و دیوانے سدرے باید و نصف نالے

وانگہ سن و تو نشستہ بہ ویرانے خوشتر بود از مملکت سلطانی

خود خیام نے جہاں بی وفا کا حاصل لذت کے سوا کچھ نہ پایا، صاحب نظر جب عالم پر خود

کرتا ہی، ہر شے کا جائزہ لیتا ہے، تو اس کو خیام کی رائے میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ۷

در عالم خاک از کراں تا بکراں چنداں کہ نظر کنند صاحب نظران

حاصل ز جہاں بی وفا چیزے نیست آئے مریعل و عارضین خوش پسران

ایک روز مرزا ضرور ہے بے مونس و بے حریف و بے ہدم و جنت قبر کے گوشے میں سونا

ضرور ہے، اور یہ بھی صحیح ہے گو ایک راز نہفتہ کہ ۷

ہر لالہ پڑمردہ نخواہد بشگفت!

تو پھر جلب لذت و دفع الم کے سوا زندگی کا مقصود ہو کیا سکتا ہے؟ لذتیت کے اسی

بنیادی اصول کو خیام قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے ۷

کم خورد غم روزگار نا ساز شدہ مے خورد ز کف ساقی د ساز شدہ

کاف کز کس مادر آمد امروز برون فردا بینی بکون زن باز شدہ

کسی راستہ چلنے والے عامی کو روک کر پوچھو کہ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ انسان کوئی استعمال کرے اس کا مدلول و مفہوم ہوگا وہی جو جلب لذت و دفع الم سے تم سمجھتے ہو! وہ درد و غم سے نجات چاہتا ہے، اور لذت و خوشی کا طلبگار ہے، اشیاء کا اچھا یا بُرا ہونا اس کے نزدیک لذت بخش یا الم رسان ہوتا ہے، وہ الم رساں و تکلیف دہ شے کو بُری سمجھتا ہے، اور لذت بخش اور فائدہ رساں چیز کو اچھی! اس کی خواہش کا انتہائی مطلوب کسی نہ کسی صورت میں لذت ہی ہوتی ہے! یہ ہے "نفسیاتی لذتیت" کے حامیوں کی تھن اور ادعا، اس نفسیاتی تھن سے قطع نظر کہ انسان ہمیشہ لذت ہی ڈھونڈتا ہے، لذت ہی پر جان دیتا ہے، لذت ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، یہ دعویٰ کہ انسان کو لذت ہی ڈھونڈنی چاہیے لذت ہی کو اپنا مقصود و حیات قرار دینا چاہیے، "اخلاقیاتی لذتیت" کے قائل پیش کرتے ہیں۔

ذرا غور کرو کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے لذت ہی کی تلاش میں اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں؟ یا اس کو صرف لذت ہی کی تلاش کرنی چاہیے لذت ہی کو اپنی غایتِ قصویٰ قرار دینی چاہیے! کیا یہ صحیح ہے کہ

جہاں اپنے شادی و دل خوشی است نہ از ہر بیداد و محنت کشی است؟
یا سچی بات دراصل یہ ہے کہ

نہ ایم آمدہ از پیدل خوشی مگر کز پیہ رخ و محنت کشی؟

متفکر! اطلاق کونہ من لست بھالین!

لذتیت کی نفسیاتی شکل کا بطلان تو تم پر تھوڑے سے نفسیاتی غور و فکر سے خود ظاہر ہو جائیگا دیکھو بات یہ ہے کہ ہماری خواہشات کا مبدأ دراصل ہماری احتیاجات ہیں، اشتہات ہیں، ہماری خالص انسانی اغراض ہیں جب ان احتیاجات وغیرہ کی تشفی ہوتی ہے، تو لذت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، لہذا کم از کم بعض مثالوں میں تم کو یہ ماننا ہی پڑیگا کہ ہماری خواہشات کا مطلق اصل میں وہ اشیاء ہیں جن سے ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے، نہ کہ مجرد لذت، دیکھو، میں پہلے

بھوک لگتی ہے، اور پھر کھانے کی لذت حاصل ہوتی ہے، یعنی باقل احتیاج، پھر اس کی تشفی اور نتیجہ
 کے طور پر لذت، یہی بات تمام لذتوں کے متعلق صحیح ہے، لذت ہماری احتیاجات کی تشفی
 کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور احتیاجات کا وجود تشفی سے مقدم ہوتا ہے، اس میں شک نہیں
 کہ جب اس طرح ہم لذت کی چاشنی سے واقف ہو جاتے ہیں تو بعض دفعہ لذت کی لذت
 ہی کی خاطر خواہش کرنے لگتے ہیں، مثلاً بھوک کی تشفی سے جلدت حاصل ہوتی ہے، اس کو
 جان لینے کے بعد ممکن ہے کہ بغیر بھوک کے لذت ہی کی خاطر بنگلے لگیں، اور اس طرح دانتوں کے
 اپنی قبر اپنے ہی پیٹ کے اندر رکھ دینے لگیں، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں ہماری
 خواہشات کا مطلوب لذت نہیں ہوتا، احتیاج کی تشفی، درد کی دوا، اشتہا کی تسکین ہر ضرورت ہوتی
 ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کو لذت و فرحت محسوس ہوتی ہے، تو لذت بریلے کے
 کے الفاظ میں نام ہے تحقق ذات یا تکمیل نفس کے احساس کا، کیونکہ فطری احتیاجات و اشتہات
 کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے، ان احتیاجات میں بدن و ذہن باوجود
 دونوں کی ضروریات شامل ہیں۔ انہی ضروریات کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے، لہذا خواہش براہ
 راست لذت سے متعلق نہیں ہوتی لذت براہ راست معروض خواہش نہیں اور نہ بذات خود ہمارے لیے قیمت رکھتی ہے
 ہاں اس کو مقیاس قیمت قرار دیا جاسکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ تھرمامیٹر کا درجہ حرارت خود
 حرارت نہیں ہوتا، بلکہ مقیاس احرارت ہوتا ہے، لذت ہر جسمانی و روحانی اقتضا کی تکمیل کے
 بعد لاحقہ کے طور پر نمودار ہوتی ہے لیکن خود کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، اس لیے لذتیرہ
 کا یہ کہنا کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے، نفیات کی رو سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔
 اگر ہماری یہ سیدی سادھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے، تو خود تجربہ کر کے دیکھو،
 لذت کو مقصود بالذات قرار دو، اور اس کے حصول کی کوشش کرو بہت جلد تم کو معلوم ہونے
 لگیگا کہ اس طرح لذت کا پانا اپنے سایہ کے پکڑنے سے زیادہ دشوار ہے، یہ عجیب بات ہے اور
 ہر تجربکار لذت پرست کو شاید اس کا اقرار ہے بلا فلاسفی اس کو استبعاد لذتیت کے نام سے موسوم

کرتے ہیں، کہ لذت کی جتنی تلاش کرو اتنی ہی وہ بیخ نکلتی ہے، جتنی زیادہ اس کی خواہش کرو اتنی ہی وہ کم ملتی ہے، اور جس قدر بے پروا اس کی طرف سے ہو جاؤ، اسی قدر وہ بے پیچھے دوڑتی ہے، پروفیسر ڈیوسے کے یہ الفاظ حکیمانہ صداقت کے حامل ہیں:-

جب جذبہ بکار بھان باطن کی طرف ہوتا ہے، تو وہ اپنی فنا کا آپ باعث ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے کے طور پر انسان یا تو کلیت اختیار کر لیتا ہے اور سرزدوقی میں مبتلا ہو جاتا ہے یا پھر ہر لحظہ نئی چیز کی تلاش میں رہتا ہے، جدید ترین احساس کا خواہشمند ہوتا ہے، جو اس کی نیت اور دراندہ جذباتی فطرت کو اکسانے، اور اس میں نئے سب سے جان ڈالنے اور کوئی شہر معضحتی زندگی بسر کرنے کے لیے وجود کے قوانین کو توڑتا ہے، اور ان اشارے سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے جن کے ساتھ یہ احساسات طبعاً پائے جاتے ہیں تو اس کی قوت احساس رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے مقصد کی شکست کا آپ باعث ہوتا ہے، وہ جذباتی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسی صداقت کا علم ہونے کے بعد سیرینیا اور اتبارع اسپیکورس نے یہ مان لیا کہ ایجابی لذت کا حصول انسان کے لیے ناممکن ہے، ان کی لذتیت میں قنوطیت کی جھلک پیدا ہو گئی البتہ وہ بجائے حصول لذت کے دفع الم کو مقصد حیات قرار دینے لگے، اسپیکورس کا یہ قول مشہور ہے جو چیزیں زندگی کو مسرور بناتی ہیں، وہ نہ پیہم شرب، نہ ام ہی اور نہ صنعت نازک کی صحبت اور نہ مرغ و ماہی اور قسمتی ماکولات سے آلاستہ کیے ہوئے دسترخوان بلکہ سنجیدہ و مستین خود و فکر جو ہر عمل انتخاب و اجتناب کے اسباب و وجوہ کا امتحان کرتا ہے، اور ان ہیودہ خیالات و اوام کو دور کرتا ہے، جو روح کی پریشانی اور اختلال کا باعث ہوتے ہیں۔

۱۰۰

۱۰۰ نفسیات ص ۲۹۹ سے دیکھو بیک دل کی کتاب The Source Book of Ancient
Philosophy ص ۲۰۰ تا ۲۰۱ اور راقم کی کتاب فلسفہ یاس ص ۸۹۔

اصلاح مزاج از ضروریات است یک تنقیہ داغ می باید کرد! (واقف)
 ارس تی بوس کا مشہور پروہے گی سی لیس (Hedonism) لذت کو مقصود حیات قرار
 دیتا ہے، اور اس کی طلب میں کوشاں ہوتا ہے، بہت جلد تجربہ اس کو سکھاتا ہے کہ بارغِ جہاں
 میں غم ہی کا تو میوہ ہر شخص کو نصیب ہوتا ہے، اور اگر کوئی بے غم ہے تو وہ بنی آدم نہیں،
 طرفہ جانور ہے!

عالم ہمہ دردست مسخا میخواید از خوانِ کرم برگ و نوا میخواید
 کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویشِ غذا، شہاشہتا میخواید
 (سجالی شتر آبادی)
 جب لذت مقصود حیات اور وہ ناقابل حصول تو پھر زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، دنیا
 استخوانِ بے مغز ہے، عاقل اس استخوان کو کتوں کے آگے پھینک دیتا ہے، موت کو زندگی
 پر ترجیح دیتا ہے، موت ہی میں راحتِ جان پاتا ہے، موت ہی سے سائے درد و الم رفع ہو
 جاتے ہیں، اور غم و ہم دور! ایجابی لذت ناقابل حصول، لیکن سلبی لذت ممکن اور وہ موت
 کے ذریعہ، لہذا

با چرخِ ستیزہ کار مستیز و برو با گردشِ دہر در میا میز و برو
 یک کاسہ زہر است کہ مرگش خواند خوش در کش و جرعه در جہاں بند برو
 (امیر نوابین)
 یہ تھا استدلالِ گے سی لیس کا، اور اس قوتِ واثر کے ساتھ یہ پیش کیا گیا، کہ لوگوں نے خود کشی
 شروع کر دی اور اس کو "داعی الی الموت" کا خطاب دیا، جو لوگ زندگی کا مقصدِ حید لذت
 اندوزی اور ذواقیت کو قرار دیتے ہیں، انہیں اسی طرح استدلال کرنا پڑے گا۔

لذتیت سے قنوطیت ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے، جب لذت پرستوں کا تجربہ یہ ہو
 تو بتاؤ کہ ۶

باقیہ مستورہ لذت چہ کند کس!

اخلاقِ قیاتی لذتیت کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ لذت ہی کو زندگی کی غایتِ قصویٰ

قرار دینا چاہیے، دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ نہیں لذت زندگی کی غایت نہیں، عقلمند لذت کی ماہیت و مقام سے واقف ہوتا ہے، طیباتِ حیات کو طہارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا لیکن وہ زندگی کا مقصود لذت اندوزی نہیں قرار دیتا، مجرد لذت کا کبھی تعاقب نہیں کرتا اس کو موجِ سراپ اور جوشِ جناب سمجھتا ہے، اور اس کے دھوکے میں نہیں آتا۔ ۶

إِنَّ اللَّيْبِ بِمِثْلِهَا لَا يَخْدَعُ ۶

وہ اپنے مقصود کے حصول میں سرگرم عمل ہوتا ہے اور مسرت خود سایہ کی طرح اس کا پچھا کرتی ہے، مقصود کے حصول میں اس کا ہر عمل لطف انگیز، ہر حرکت فرحت بخش ہوتی ہے، جاننے ہو کہ یہ مقصود کیا ہے؟ رضائے حق! حق تعالیٰ ہی سے اس کو آرامِ جاں اور بردِ قلبی نصیب ہوتی ہے اور عارفِ روم کے ساتھ مل کر وہ لذت سے کتا ہے۔ ۷

گر گریزی بہ امیدِ راستے ہم از آنجا پیش آید آفتے

بہیج کئے بے درد و بے دام نیت جز بخلوت گاہِ حق آرام نیت

جب لذت مقصود زندگی نہیں تو کیا شہرت یا اشتہار خلق، جاہ و مرتبت نام و نمود وہ اعلیٰ اقتدار میں جن کا حصول زندگی کی غایت قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہم میں سے بہت سارے ایسے ہیں جنہیں زبان کی لذت سے کان کی لذت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے، وہ اس لطیف لذت کے لیے اپنی تمام کثیف لذتوں کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، مصائب میں گرفتار ہونے سے نہیں گھبراتے، درد و غم برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، آفتوں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شہرت کی قیمت بلا و مصیبت ہے تو بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوتی، ان کے لیے شہرت غایت الغایات ہے، خیر و برترین ہی مطلق قیمت ہے، اضافی قیمت نہیں!

شہرت کی خواہش ہر انسان میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے، اس کا ما زیسہ کہ انسان کا نفس تنقیص کو نظر آنا پسند کرتا ہے، اور علو و بلندی کو طبعاً پسند! بندہ ہونا اس کے

نفس پر شاق ہوتا ہے، ربوبیت طبعاً محبوب ہے، ہر شخص کے باطن میں وہ جذبہ موجود ہے جس کی تصریح فرعون نے اپنے اس قول سے کی تھی "انار ککم الا علی" اس کی رفعت کا جب لوگ اقرار کرتے ہیں، تو وہ خوش ہوتا ہے، بقول عارفِ روم، فریب ہوتا ہے:-

جانور فریب شود از راہِ نوش آدمی فریب شود از راہِ گوش

شہرت کا طالب دراصل لذت ہی کا پجاری ہے، اس کا معبود بھی ایک قسم کی لذت ہی ہے، وہ اپنے نفس کی کبریائی کا اعلان چاہتا ہے، تشہیر چاہتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت کو ادا کرنے پر تیار ہوتا ہے۔

اب غور کرو وہ اپنی مسرت، اپنی بردِ قلبی کی عمارت کس بنیاد پر قائم کر رہا ہے، ہوا پر تعریف جو خلق کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ آخر ہوا ہی تو ہے، جس کا حقیقت سا جھونکا بھی ہمارے بیمار شہرت کے دل کے غنچے کو شگفتہ کر دیتا ہے، مگر کیا کوئی عقلمند اپنی مسرت کے قلعہ کو اس قدر کمزور بنیادوں پر قائم کریگا؟ کیا ہوا پر اس کا اقتدار ہے؟ کون جانتا ہے کہ آج ہوا کا رخ کس طرف ہوگا؟ عوام کا لانگام آج اپنے ہیرو کو اور ج آسمان پر جگہ دیتے ہیں اور کل بغیر کسی وجہ کے خاکِ مذلت پر ٹپک دیتے ہیں، آج تحسین و نصیحت ہو اور کل زجر و تنبیخ، اور کچھ دن بعد مطلق ذہول اور فراموشی، یہ المناک تجربہ تقریباً ان تمام پرستارانِ شہرت کا جنہیں عوام نے کچھ دن کے لیے بت بنا کر پوجا تھا، ولنکٹن واٹر لو کا فلاح اعظم نیولین کوجک دیتا ہے، اپنے زمانہ کی تہذیب و تمدن کو غارت و برباد ہونے سے بچا لیتا ہے، عوام اس کو سزا نکھوں پر بٹھاتے ہیں، بطل اعظم کا خطاب دیتے ہیں، اور کچھ ہی دن بعد لندن کی گلیوں میں یہی مشتعل و غضب آلود مجمع پھروں سے اس کے خود کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، بس کو ولنکٹن اپنی موت کے دن تک محفوظ رکھتا ہے۔ جو لیس سیزن ایک دن دنیا پر حکومت کرتا ہے اور دوسرے دن احسان فراموش دوستوں کے ہاتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ سکندراعظم کی لاش تیس دن تک بے گور و کفن پڑی رہتی ہے، اس کو عزت کے ساتھ خاک کے سپرد کرنے کو

بھی کوئی نہیں ملتا، یہ ہے انجام ہر شہرت و رفعت کا!

گرم پیرا کہ رستم و شام شدی یا خسرے نیمروز یا شام شدی

نہ زور گورنی توں برد نہ زر افسوس کہ کیمپکے اوام شدی

شہرت کا اثر سیرت پر کیا ہوتا ہے؟ شہرت سے عجب و پندار پیدا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہی ذات کو کبیر اور سائے عالم کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتا ہے! مقید ہو کر مطلق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، بندہ ہو کر خدا بنتا ہے، جب اس کو خدا سے ڈرایا جاتا ہے تو اپنے تکبر اور عزت کے گھمنڈ میں حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے۔ **وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِتْمَانِ** (پ ۹۶۲) جس شخص کا دماغ اس قدر الٹ جکے اس کو مسرت و طمانیت قلبی کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ اس کو ہر قدم پر خلاف طبیعت عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کوئی اس پر طعن کرتا ہے اور کوئی حسد، کوئی اس کو قطرہ آب گندہ کہتا ہے، اور کوئی طرفہ جانور اس کا ہر عیب دنیا کے سامنے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کی کوئی غلطی لوگوں کی نگاہوں سے چھپ سکتی شہرت کی وجہ سے گویا وہ آفتاب کے نیچے کھڑا ہوتا ہے، اور اس کا ہر نقص اب نمایاں ہرگز اور بقول عارف روم اس کی حالت یہ ہوتی ہے۔

ختمہا و چشمہا و اشکھا! برسرت ریزد چو آب از مشکھا!

ایک آرزوئے شہرت، تمنائے رفعت، خواہشِ علو اس کو ہزاروں غموں اور آفتوں میں مبتلا کرتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حق سے کٹ کر خلق سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، اور خلق سے سوائے غم و اندوہ کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے، وہ خلق کے قلوب کو ہمیشہ مسخر رکھنا چاہتا ہے، اور اعتماد کرتا ہے، سمندر کی موجوں پر گھر بنا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا پاس پانی اور مستقل ہے، فی الحالجب! خلق کے وہ سے وہ خوش ہوتا ہے، لیکن اس کی خوشی کی مدت ایک رات سے زیادہ نہیں۔

وعدہ ارباب دنیا آچو خوابِ احتلام شب ہر شب عیش و عشرت باشد فراموش

ایسے اہم پر ترس آتا ہے، مگر اس کے مقصودِ حیات کو کوئی عاقل اپنی زندگی کا مقصود بنانا پسند نہیں کرتا۔

نہیں، ہم محض حصولِ جاہ کو زندگی کی غایت نہیں قرار دے سکتے، اس میں گو کسی قدر لذت ضرور ہے، لیکن یہ غیر مخلوط لذت نہیں، درد و آفت، رنج و مصیبت کا عنصر اس مرکب میں بہت زیادہ ہے، یہ انسان میں کبر و غرور پیدا کرتا ہے، اور متکبر نہ دنیا میں راحت و طمانیت پاسکتا ہے، اور نہ آخرت میں فوز و کامیابی، وہ دل کا اندھا ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی نشانیوں کی پہچان سے محروم رہتا ہے، حق بات اس کو نظر نہیں آتی، حق کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جب دیدِ حق نہ رہے تو پھر اس میں پوست کے سوارہ کیا جاتا ہے؟

آدمی دیدت و باقی پوست است دید آن باشد کہ دید دست است (رومی)
 سا صِرْفُ عَنْ آيَاتِ الْاٰلٰئِن میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانیوں سے برگشتہ ہی
 يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ رکھو گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کا ان کو کوئی
 الْحَقِّ (پ ۶۶۹) حق حاصل نہیں۔

اسی کی طرف اشارہ ہے، اور اسی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کا مبغوض ہو جاتا ہے۔ اِنَّهُ لَا يُحِبُّ
 لِلْمُسْتَكْبِرِيْنَ! جب دیدِ حق کھو چکا، حق تعالیٰ کا مبغوض قرار پا چکا، تو پھر اس کے ہلاک ہونے
 میں باقی کیا رہا، انانیت، اپنی ذات سے محبت اپنے ہی ذکیہ کے انتشار کی خواہش، اپنی ہی
 تعریف کی محبت اور اس سے پیدا ہونے والی لذت، یہی تو ہیں اجزا اور اس کی ہلاکت اور
 بربادی کے! اسی لیے نفس انسانی کے امراض سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے حکیم
 نے فرمایا تھا کہ

اِنَّهَا هَلَاكُ النَّاسِ بِاَتْبَاعِ ہوئی وہوس کی پیروی اور اپنی تعریف و توصیف
 الْهَوٰى وَحُبِّ الثَّنَاءِ کی محبت لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

ایک اور طریقے سے اسی صداقت کا اظہار شدت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

ذئبان ضاربان اسلافی ذرۃ دو بھڑیے حملہ کرنے والے جو بھیروں کے گلے
 غم لیسابا اکثر فساد امن حب میں چھوڑ دیے جائیں اتنا نقصان نہیں کھنے
 الشرف والمال فی دین الرجل جتنا کہ شرف اور مال کی محبت مسلمان آدمی کے
 (المسلم) دین میں کرتی ہے۔

اسی حب الشرف سے ارادہ رخت یا ارادہ علو پیدا ہوتا ہے، اور جب تک انسان اس سے غالی نہیں ہوتا، اپنی آخرت درست نہیں کر سکتا۔

• **تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فسادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقِيْنَ** (پ ۱۲۷) اور نیک نیت متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اس آیت کو مرنے وقت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ پڑھے پڑھے جان دی!

خوب سمجھ لو کہ ہم حصولِ کمال سے نہیں منع کر رہے ہیں، ہم علم میں منفرد با کمال ہونے کی آرزو کو جائز سمجھتے ہیں، ہم کمالِ حریت یعنی شہوات و جذبات سے آزادی، دنیوی ترددات سے نجات کو حقیقی کمال قرار دیتے ہیں، ہم حق تعالیٰ اور ان کے صفات و افعال، مالکیت و حاکمیت کے علم کو سب سے زیادہ اعلیٰ و حقیقی کمال سمجھتے ہیں، اور ہلکے عقیدے کی رو سے یہ علم یہ معرفت عارفین کے لیے مرنے کے بعد نور بنیگی۔

نُورُهُمْ يَسْجَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَيُؤْتِيهِمَ الْبَيْتَ الْمَقْدِسَ ان کا نور ان کے سامنے دوڑتا
 يَقُولُونَ رَبَّنَا آمِنَّا لَنَا نُورٌ ہوگا، یوں دعا کرتے ہو گئے کہ اے ہمارے پروردگار

ہلکے لیے ہلکے اس نور کو آخر تک رکھو۔ (پ ۲۸۷-۲۸۸)

۱۷ دیکھو مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد سوم ص ۲۷۹۔

اور جو اس نور معرفت سے بے بہرہ ہونگے ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا، جو اندھیریوں میں پڑا ہے۔
 کمن مثله فی الظلمات لیس اس شخص کی طرح جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں
 بخارج منها (پے ۱۲۷) میں ہے، ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا۔

ہم اس جذبہ کی خدمت کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے کمال کے پیدا ہونے کے بعد ایک شخص اپنی
 ذات کو کبیر اور سارے جہان کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے، یا پھر کمال اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے
 کہ لوگوں کے دلوں اور جسموں پر حکومت کرے، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت منوشی
 کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے، اس خصوص میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا کی
 صورت میں سید سے راستے کی تعلیم فرمادی تھی۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي صَبُورًا وَشُكْرًا وَحَقُّ تَعَالَى لِي صَابِرٌ وَشَاكِرٌ، مجھے اپنی آنکھوں میں
 اجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيرًا وَفِي عَيْنِ صَغِيرٍ كَمَا فِي عَيْنِ صَغِيرٍ كَمَا فِي عَيْنِ صَغِيرٍ
 للناس كَبِيرًا لِي

جب میں خود اپنی آنکھوں میں حقیر رہوں، اپنی بندگی و بیچارگی کو بھول نہ جاؤں، اپنی ظلمت و
 جہل سے باخبر رہوں، تو پھر مجھ میں نہ اپنی تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نہ کبر کا مذموم
 جذبہ، اب حق تعالیٰ اپنے اس متواضع بندہ کو رفعت عطا فرماتے ہیں، اور حقیقی کمال سے حصہ
 وافر، یہ بزرگی اور کمال کا عطیہ ہے اور اس کا استعمال معطلی کے احکام کے مطابق ہی کیا
 جاسکتا ہے۔

مقصود حیات اگر شہرت یا اشتهارِ خلق نہیں تو کیا مال و دولت کو زندگی کی انتہائی غایت
 قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس امر میں شاید کسی کو ہم سے اختلاف نہیں ہوگا کمال ہمیشہ ایک ذریعہ ہے کسی غایت کے
 حصول کا، جو غایت نہیں، ہم نے ان ظلمات میں سے بعض پراد پر بحث کی ہے، اور ان کو

لے یہ دعا حضرت بیدہ کی روایت سے سنہ ہزار میں ملتی ہے۔

زندگی کا مقصود نہیں قرار دیا، یعنی اگر مال سے جاہ طلبی یا لذت اندوزی مقصود ہو تو پھر مقصود کے باطل
 سے ذریعہ کا باطل ہونا بھی لازم آئیگا، اور اگر جائز مقصدِ حیات کے حصول میں یہ استعمال ہو تو پھر
 یہ ایک زبردست قوت ہے اور عظیم الشان نعمت ہے۔

ال راگر ہریریں باشی جمول نعم مال صراح لغفتش رسولؐ

اب ہمیں زندگی کے حقیقی مقصد کے تعین کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کی ہدایت
 کی روشنی میں مقصودِ حیات کا تعین ضروری ہے، حق تعالیٰ کی معرفت اور ان کی عبادت جہل
 کی تخلیق کی غایت ہے صریح ارشاد ہے، مَا خَلَقْتُ الْبَشَرَ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِي

عبادت بغیر عرفانِ حق کے ممکن نہیں، لہذا وحدت ذاتیہ حق کی معرفت اور اس کی عبادت
 کے سوا جہان کا کوئی مقصود نہیں، بہرہی اور ہر رسول کے پیغام کا خلاصہ بس یہی تھا۔
 يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ شَيْءٍ عِندَهُ إِلَّا حِسَابُ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامِ
 تہارا کوئی معبود اور رب نہیں۔

جاتی نے اس مقصود کو ان دل پذیر اشعار میں ادا کیا ہے :

از زندگی بندگی تست ہوس بر زندہ دلاں بے تو حرام ست نفس

خواہ ز تو مقصود دل خود ہر کس جاتی ز تو ہمیں ترا میخواستہ دس

زندگی کا مقصود، برترین مقصود، غایت الغایات حق تعالیٰ ہیں، ان کی یافتہ ہے، ان
 کی عبادت و بندگی ہے، ان کا عشق و محبت ہی، یا یوں کہو کہ ہماری ساری عبادت ہمارا جینا اور ہمارا
 مرنا سب خالص حق تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

قُلْ إِن صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ كَمَا بَالِغِينَ مِيرَى نَارِ أَوْ مِيرَى سَارِي عِبَادَتِي أَوْ مِيرَى

وَمَا تَنِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لِي وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ

جینا اور میرا مرنا سب خالص اللہ ہی کا ہے، جو مالک ہے ساری
 جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے

(پ ۷، ترجمہ مولانا الطوفان علی تھانی) اور میں سب ماننے والوں سے پہلے ہوں۔

حق تعالیٰ ہمارے مقصود میں، اسی لیے ہمارے محبوب و مطلوب بھی۔
 وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ اور جو مومن ہیں ان کے ساتھ نہایت قوی محبت

۱۳۶۲ رپ ۷

وہ ہماری جان و مال، فرزندوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

خوابم کہ ہمیشہ درہوائے تو زیم خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
 مقصود میں خستہ زکونین توی از بہر تو میرم در برائے تو زیم
 جب زندگی کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، تو اب دیکھو کہ وہ ہماری اس زمینی زندگی کو کس طرح
 بسر کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ پہلے اجمال، پھر تفصیل۔

اجمالاً یوں سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے مقصود ہیں اور محبوب ہیں تو ہمارا کام ایسا ہونا
 چاہیے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت میں شامل ہو جائے، یعنی ان ہی کے امتثال امر میں ہو،
 ان ہی کی رضا مندی و خوشنوی کے خاطر ہو، نفس و ہوا کی پیروی میں نہ ہو، یعنی لذت اندوزی
 کے لیے نہ ہو، عیش پرستی کے لیے نہ ہو، جاہ طلبی کے لیے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت
 اللہ کی ہو، غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے فعل کا تعین امر حق سے ہو، نفس و شیطان کے حکم سے نہ
 ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کی زندگی ہے، اور یہی کامیاب زندگی ہے، امتثال
 کے تہدید فی الفاظ کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے، یہ اپنے الفاظ میں تقویٰ کی زندگی اور کامیاب
 زندگی کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

دلے ملے دلے میں دیر کین	تخ لا در کف نہ تو داری و نہ من
دل ز غیر اللہ بہ پردانے جوان	ایں جہان کہنہ در بازے جوان
تا کجلبے غیرت دین زیستن	اے مسلمان مردن بست این زیستن
مرد حق باز آفریند خویش را	جز بہ نور حق نہ بیند خویش را
بر عیار مصطفیٰ خود را زند	تا جہلے دیگرے پیدا کند

اب ذرا تفصیل میں جا کر تقویٰ کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ لو قرآن میں متقیوں کی تعریف
اجالائیوں کی گئی ہے۔

وَالَّذِي جَاءَ بِالصَّدَقَاتِ وَصَدَّقَ
بِهِ أَوْلِيَاكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (پارہ ۱) وہی لوگ پرہیزگار یا متقی ہیں۔

جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن و متقی، تقویٰ نبی کو سچ ماننا اور اس کی
تصدیق کرنی ہے، حق تعالیٰ انبیاء ہی کے ذریعہ علم صحیح عطا فرماتے ہیں، انبیاء اللہ ہی کے علم کو
پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی نہ زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی، جو لوگ اس
پر ایمان لاتے ہیں، اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، وہی متقی کہلاتے ہیں۔

تقویٰ کی کچھ تفصیلات کو اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ
لِلْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ

رُكِعَ أَوْ رُقِيَ أَوْ رُقِيَ أَوْ رُقِيَ
أَوْ رُقِيَ أَوْ رُقِيَ أَوْ رُقِيَ

أَمِنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ

وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّنَ
وَآتَى الْمَالَ عَلَى

حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ

وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ
السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ

وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ
الصَّلَاةَ، آتَى

الزَّكَاةَ، الْمُؤْتُونَ
بِجَهْدِ حِمْلِهِمْ إِذَا

عَاهَدُوا، وَالصَّابِرِينَ
فِي الْبَأْسَاءِ

وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ
الْبَأْسِ أُولَئِكَ

الَّذِينَ صَدَقُوا
أَوْلِيَاكَ هُمُ

لِلْمُتَّقِينَ (پارہ ۲)

ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی

اس آیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ تقویٰ کا انحصار چند عقائد، اعمال اور اخلاق پر ہے، عقائد میں اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتب منزلہ پر، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانا داخل ہے، یہ تقویٰ کے اساس میں، عمل کا صدور ایقان و ایمان سے ہوتا ہے، متقی کے ایقانات جن کا نتیجہ اعمال صالح ہیں، یہ ہونے چاہئیں جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے بعد ان اعمال کی بھی کسی قدر تفصیل پیش کر دی گئی ہے۔ ان کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ انفاق، اقامتِ صلوٰۃ و ایاتے زکوٰۃ، انفاق رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں سوال کرنے والوں کے لیے ہو، اور قیدیوں کے چھڑانے میں کیا جائے، انفاق کی شرط مقدم حق تعالیٰ کی محبت ہے، یعنی جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ان ہی کی محبت میں خرچ کیا جا رہا ہے، ان ہی کی خوشنودی و رضا کی خاطر، اس لیے نہیں کہ نام ہو، شہرت ہو، لوگوں کی نگاہوں میں بہتری حاصل ہو، اخلاق میں ایفکے عمد اور صبر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے، صبر تنگدستی میں، بیماری میں اور کفار کے ساتھ جنگ میں

تقویٰ کے متعلق دوسری تمام قرآنی تصریحات کو پیش نظر رکھ کر حضرت امام غزالیؒ اس کی جامع و مانع تعریف یوں کرتے ہیں کہ تقویٰ بچپن سے ہر اس شے سے جس سے دین میں ضررہ خوف ہو، محاورہ عرب سے بھی اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ جو بیمار پرہیز کرتا ہے اس کو عرب "متقی" کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ ہر مضر چیز سے خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی بچتا ہے اسی طرح دین کا تقویٰ نواہی سے اجتناب ہے حضرت غزالیؒ کی اس تعریف میں امتثالِ مامور یا عبادت پر زور نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ صرف اجتنابِ مخطور یا گناہوں سے پرہیزی کی تاکید کی جا رہی ہے۔ منہاج العابدین میں وہ کسی جگہ فرماتے ہیں، کہ عبادت کے دو بڑے حصے ہیں، ایک عبادت کرنا، دوسرا پرہیز کرنا، اور یہ آدھا حصہ یعنی گناہوں اور سہات سے پرہیز انسان کے لیے پہلے آدھ حصہ یعنی عبادت سے زیادہ بہتر ہے، بتدی عبادت کے حصہ پر زیادہ زور

لے دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۵، (مطبوعہ نولکشور)

دیتا ہے، اور کامل اپنی بصیرت پر بہرہ کا حصہ اختیار کرتے ہیں، اور ان کو ہر وقت یہ دھیان رہتا ہے کہ دل کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے بچائیں، لیکن اگر دونوں حصے حاصل ہو جائیں یعنی عبادت و پرہیز تو کمال حاصل ہوتا ہے، اور سلامتی اور غنیمت میسر ہوتی ہے۔

عبادت کے دونوں حصوں کا خیال رکھ کر تقویٰ کی جامع و مانع تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے، تقویٰ کفر و شرک و نفاق و بدعت سے احتراز ہے، انشائی مامور، اجتنابِ مخطور اور رضا بقدر ہے، مستحق کا قلب ایمان و توحید و صدق سے آراستہ ہوتا ہے، سنت پر قائم ہوتا ہے، اور امر کا اتباع کرتا ہے، نواہی سے بچتا ہے، راسی برضا کے حق رہتا ہے، اسی چیز کو حضرت عوثؓ اعظمؓ شیخ عبد القادر جیلانیؒ اس طرح ادا فرماتے ہیں: لَا يَدْ لِكُلِّ مُؤْمِنٍ فِي سَائِرِ اَحْوَالِهِ مِنْ ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ: - امرٌ يَمْتَثِلُهُ وَنَهَى يَجْتَنِبُهُ وَقَدِرُ رَضَى بِهِ - یعنی ہر مومن کے لیے تمام احوال میں تین چیزیں ضروری ہیں، امر الہی بجالائے، نہی سے اجتناب کرے، اور رقعہ پر پورا رضی ہے۔ اتنی بات یہاں سمجھ لینی ضروری ہے کہ امر الہی دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تشریحی، یہاں وظیفہ عبودیت یہ ہے کہ اس امر کو بجالائے، اور امر منفی کی صورت میں ممنوعات سے بچے، دوسرا تکوینی، یہاں بندگی کا وظیفہ یہ ہے کہ اس کو تسلیم کرے، رضا بالقضائے کا اشارہ اسی طرف ہے۔ بالفاظ دیگر جو حق تعالیٰ کہیں وہ کرے اور جس طرح وہ رکھیں اس طرح رہے اول عبادت ہے، اور ثانی عبودیت، ایسی ہی زندگی تقویٰ

لے دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین مشا و ملا

۱۵ احتراز کا ذریعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، ذات الٹھی کو الہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان ان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار سے شرک کا خروج ہو جاتا ہے اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذات پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسالت کے اقرار سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے راز تدا ہے۔ بدعت دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا یا جو دین کی بات نہیں، اس کو دین سمجھنا ہے۔ مجھلا شرک کے جانے سے توحید، کفر کے جانے سے ایمان و نفاق کے جانے سے صدق، بدعت کے چھوڑنے سے سنت حاصل ہوتی ہے دیکھو باب اول عبادت و استغانت ۱۵ فتوح الغیب مقالہ اول۔

کی زندگی ہے، اور ہر معنی میں کامیاب زندگی!

اب دیکھو، زندگی میں کامیابی و شریخ روئی کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے، جو متقی کی سیرت کا جزو ہیں، وہ حق تعالیٰ پر شدت سے ایمان رکھتا ہے، ان سے شدت سے محبت کرتا ہے، ان کو وہ خیر مطلق اور قدوس مانتا ہے، زندگی اور کائنات کا مبدؤ وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے اور لازماً زندگی کو بھی خیر سمجھتا ہے، جب اس کے اعتقاد اور اذعان کی رو سے زندگی اچھی اور زندگی کے تجربات اچھے ہیں تو پھر وہ ان سے زندہ دلی اور جوش کے ساتھ تعاون عمل کرتا ہے، قنوطیت ویاس کا اثر اس کے قلب پر مطلق نہیں ہوتا، اس کی زندگی اور خارجی حالات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اس کو شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

عارفِ رومی نے کہا تھا، انما التدریج بتدیل المزاج آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطہ نظر ہے۔ مومن کا کائنات کے متعلق نقطہ نظر تم نے اوپر دیکھا کہ کیا ہے، اس کے نزدیک کائنات ایک قدوس و قادر و علیم مطلق ذات کی تجلیات کا منظر ہے، اسی یقین کی وجہ سے وہ زندگی میں کامیاب ہونے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے مزاج کی اسی خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے وہ جہان کے ناموافق عناصر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے، چار سوٹے کائنات اس کو بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے اس گمان کو صحیح کر دکھاتا ہے۔

تسری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا عجب نہیں کہ یہ چار سو بدل جائے

خالق کائنات و رب کائنات سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے کائنات بھی اس کے ارادے کے مطابق بن جاتی ہے اور انا عند ظن عبدی کی بشارت صحیح ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے، تو حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں۔ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ كَقَوْلِ سَيِّدِنا مُحَمَّدٍ، صادق مصدوق نے بھی تو اس کی خبر دی تھی۔ ان يَلَهُ رِجَالًا

لے، تیرا اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مزاج ہی بدل جائے۔

میں۔ جی کے چہرے کا مقولہ ہے جو انگلستان کا ایک منہو را دیب گزرا ہے۔

برضا کھم و یغضب بغضبہم کما اتھم برضوا برضا یم و یغضبوا بغضبہ، بعض رجال اشیر
 ایسے بھی ہیں جن کی رضا سے حق تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں، اور جن کے غصہ سے وہ بھی غصہ فرماتے
 ہیں جس طرح کہ خود یہ مردان حق اپنے مولیٰ کی رضا سے راضی اور اس کی ناراضی سے خود بھی ناخوش
 ہوتے ہیں، متقی کی اس شان کو دیکھ کر کسی عارف کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

فادع بنشین و عم مخور و شاد بزی این معنی لا الہ الا اللہ است!

مومن متقی کے خمیر میں وہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک حقیقی معنی

میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے، ان ہی کا خیال رکھ کر امام غزالی فرماتے ہیں کہ جس نے تقویٰ

اختیار کیا اس کے سارے ترددات رفع ہو گئے، اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے بات

اصل بھتی سو حاصل ہو گئی، اپنی تائید میں وہ قنادہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ تورات میں لکھا

ہے کہ "لے فرزند آدم تقویٰ اختیار کرو و جدھر چاہے سو رہے" مومن متقی مجاہد ہوتا ہے، سو نہیں

رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ناکامیابی کا اندیشہ نہیں، بالفاظ عوٹ عظیم ساکن بجوارح،

مطلن الجمان، مشروح الصدر، منور الوجه، عامر البطن، غنی عن الاشیاء بخالقہا ہوتا ہے۔ لوں اشیاء

کی ملکیت کی وجہ سے خود کو غنی سمجھتے ہیں، وہ غنی بلٹے ہوتے ہیں، مجاہد متقی اشیاء سے بے نیاز ہوتا ہے

وہ خود خالق اشیاء کو رکھتا ہے، اس لیے وہ غنی عن اشیاء ہوتا ہے، اس کے ذل و افتقار کی نسبت

حق تعالیٰ سے ہے، وہ حق تعالیٰ کا فقیر ہے، اشیاء سے غنی ہے، اس کے ہاتھ میں لا الہ الا اللہ

کی شمشیر ہے، اسی لیے وہ فرمانروائے موجودات ہے، اسی فقیری ہی کی وجہ سے اس کو امانت

ملی، اور اس امانت کی وجہ سے خلافت عطا ہوئی اب وہ خلیفۃ اللہ ہے، اسی لیے

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفرین کار کشاد کار ساز (اقبال)

لے ساکن بجوارح (بلا حرکت اعضاء) اور قلب مطمن اور فراخ و کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آہاد و تعلق خالق

کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ (فتوح الغیب مقالہ ۷)

تھ ہر کردار درست اور شمشیر راست ہے، جملہ موجودات را فرماں رواست (اقبال)

تم دنیوی نقطہ نظر سے کامیاب زندگی کس قسم کی زندگی کو قرار دینے ہو؟ وہی نہ جو آسمان
وزمین کے برکات سے الامال ہو؟ دیکھو اس کا حصول ایمان و تقویٰ پر منحصر ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَآتَيْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ (پ ۲۴)

کھول دیتے۔

ان برکات کے ساتھ پھر نہ رنج و تعب ہوگا نہ حزن و خوف۔

فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (پ ۱۱۴)

ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہی، اور نہ حزن۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا جس میں دشمنوں سے محفوظیت حاصل ہے؛ بشرط تقویٰ اس
کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔

إِن تَصَابِرُوا وَاسْتَقُوا لَا يَفْضُرْكُمْ
كَيْدُهُمْ شَيْئًا (پ ۳۴)

یعنی تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں
کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکیگی۔

حق تعالیٰ کی معیت اور اعانت کی وجہ سے متقی غالب و منصور ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ
هُمْ أَحْسَنُونَ (پ ۲۲۴)

ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا جس میں سختیوں سے نجات ہو، رزقِ حلال ہو، دیکھو اسی

کا تو وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔ مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا
يَحْتَسِبُ متقی کی نجات کی شکل حق تعالیٰ نکال دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے رزق

دیتے ہیں جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا (پ ۱۴۷) اس کے ہر کام کو آسان کر دیتے ہیں

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (پ ۱۴۷)

اثری نقطہ نظر سے بھی متقیوں ہی کی زندگی کامیاب ہوتی ہے، کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے

محبوب ہوتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ ان ہی کی عبادت قبول ہوتی ہے۔
 اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ حق تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔
 ان ہی کو حق تعالیٰ کے نزدیک بزرگی حاصل ہے :-

اِنَّ الْكُوْبَةَ عِنْدَ اللّٰهِ اَكْبَرُ
 اللہ کے نزدیک سب میں بڑا شریف وہ ہے جو
 (پہا ۱۳۴) سب سے زیادہ پرہیزگار یا متقی ہو۔

ان ہی کے اعمال قبول ہوتے ہیں، اور گناہ معاف ہوتے ہیں :-
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا
 قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ
 كَسُوْا اللّٰهَ تَعَالٰی تَمَّائے اعمال کو قبول کرے گا اور
 يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (پہا ۲۴) تمہارے گناہ معاف کرے گا۔
 دوزخ کی آگ سے ان ہی کو نجات ملتی ہے۔

وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِينَ اتَّقَوْا بِمَقَارِفِهِمْ
 لَا تَمَسُّهُمْ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
 اور جو لوگ متقی ہیں حق تعالیٰ ان کو کامیابی کے
 ساتھ نجات دینگے، ان کو نہ تکلیف پہنچے گی اور نہ
 وہ غمگین ہونگے۔ (پہا ۳۶)

ان ہی کے لیے بالا آخرت ہے اور سامان عیش و عشرت :-

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ فِي جَنَّةٍ وَّ نَعِيْمٍ
 بہر حال مومن متقی کے لیے دونوں جہان کی خوشخبری ہے، دنیا کی خوشخبری، آرام و آسائش
 اور برکتیں، غم و خوف و حزن سے نجات، دشمنوں سے حفاظت اور حق تعالیٰ کی محبت و نصرت
 اور آخرت کی بشارت معاملہ قبر، حساب و کتاب کا آسان ہونا، یعنی جس حساب و قیامت
 سے رستگاری اور بخشش خداوند غفار و ستار پھر شرح دریکان و جنات نعیم یہ
 اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَآخُوْفٌ عَلَيْهِمْ يَادْرُكُوْكَ اللّٰهُ كَيْفَ يَدْرُكُوْنَ كُوْنِيْ اَلَّذِيْ

لہ راحت اور غذا میں ہیں اور آرام کی جنت (سورہ واقفہ)

وَلَا هُمْ يُخْزَنُونَ، الَّذِينَ آمَنُوا اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ وہ ہیں جو ایمان لائے
 وَكَانُوا يُتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے دنیوی
 الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوشخبری ہے
 تَبْدِيلٍ لِّكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الْفَرْقُ
 الْعَظِيمُ (پ ۱۲۶)

دیکھو یہی راز ہے، جس کو پالینے کے بعد تمہاری سمجھ میں آ جائیگا کہ کیوں حق تعالیٰ جو ہمارے مولیٰ
 ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ، سب اگلے پھیلوں کو ایک ہی وصیت فرماتے ہیں، اور وہ یہی ہے
 کہ ہم تقویٰ کی زندگی اختیار کریں اور بس، بتاؤ تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ انتم اعلم اولہ اللہ؟
 وصیت ان الفاظ میں ہوئی ہے وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنْ
 اتَّقُوا اللَّهَ ۗ (پ ۱۲۶) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی
 اور تم کو بھی کہ تقویٰ اختیار کرو۔

مومن کی خصلت تقویٰ ہے اور یہ خصلت دنیا و آخرت دونوں کی جامع ہے اور سب کاموں
 کے لیے کافی! مومن جانتا ہے کہ ۶

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں!

اسی لیے وہ عشق و ایمان پر اعمال کی بنیاد رکھتا ہے الَّذِينَ آمَنُوا اشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ حَقُّ تَعَالَىٰ
 کی تقویٰ سے متعلق یہ وصیت ہمیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچی ہے ان
 کی بات کا انکار کفر، ان کی بات میں شبہ نفاق، ان کی بات میں اپنی بات کا ملنا بابت
 ہے اور ان کی بات کا جوں کا توں مان لینا ایمان ہے، اس لیے گو

تعلیم پر فلسفہ مغربی ہے یہ

نادان ہیں جن کو ہستی غائب کی ہر تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا؟

ہے شیخ بھی مشال برہمن صنم تراش
 محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
 اس دور میں ہر شیشہ عقائد کا پاش پاش
 مذہب ہر جس کا نام وہ ہر اک جنونِ خام
 ہے جن سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
 کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور

مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

باہر کمال اندکے آشفتمندی خوش است

(اقبال)

ہر چند عقل کل شد مٹے جنوں مباحث

آئیے اسی جنون یا عشق کی اپنے مولا سے التجا کریں :-

عطا اسلاف کا جذبہ دوں کر شریکِ زمرہ لایحزَنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں مے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

(اقبال)

قرآن اور علاجِ خوف

اس مختصر مقالہ میں نے ایک خوفناک جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہے، جو اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔ خوف سے میری مراد اسوۃ اللہ کا خوف ہے۔ میں خشیت اللہ کو کوئی قابلِ علاج چیز نہیں سمجھتا، معاذ اللہ، یہ تو یقین مقصود ہے۔ *يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ* اصول کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، اور تفصیلات کو ترک کر دیا ہے۔

دور روزہ عمر پر خوف و خطر است از غصہ غذائے خلق خون جگر است
آسودہ دلی ز بعد مردن ہم نیست زیرا کہ خطرہ دلاں طرف بیار است

انسان کی دور روزہ زندگی خوف و خطر سے بھری نظر آتی ہے، اس کے قلب پر اس خوفناک جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے، جب وہ بستر سے اٹھتا ہے تو لرزاں و ترساں اٹھتا ہے، اور تمام دن کے غم و غصہ کے بعد جب وہ پھر بستر کی طرف لوٹتا ہے، تو بھی خائف و ہراساں ہوتا ہے، وہ ڈرتا کس چیز سے ہے؟ کسی کو تو بیماری کا خوف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیمار ہو جائے اور دنیوی کامیابی کی ساری توقعات مٹی میں مل جائیں، جب کسی عزیز یا دوست کی بیماری کی خبر سن لیتا ہے تو بچپن و پریشان ہو جاتا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں مر نہ جائے؛ کسی کو خوف ہے کہ وہ ساری دولت کھو کر فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے، ضعف و ذلت کا شکار نہ ہو جائے کسی کو اپنی ملازمت کی طرف سے خطرہ ہے، وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرتا ہے کہ کہیں بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صف میں شریک ہونا نہ پڑے، ٹکڑوں کو

لے یہ مقالہ موقر علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا، اور پہلی مرتبہ معارف نوبہرہ میں شائع ہوا۔

محکج نہ ہو جائے، رزق کا موازہ بند نہ ہو جائے، کوئی اپنی ذمہ داریوں سے گھبرار رہا ہے، یہ ناقابل برداشت نظر آ رہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور وہ اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے، کوئی ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرار رہا ہے، وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے، اور پسینوں میں ڈوب رہا ہے، کوئی خوف زدہ ہے، لیکن نہیں جانتا کہ کس چیز سے خوف زدہ ہے، اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، خطرہ کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہریں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں اور وہ بزدلی کی موت مر رہا ہے، غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص اس کا شکار ہے، کہن ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عماد الدین فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے، وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ ہے خوف کا۔

غم راز من و مرا گر یز از غم نیست یارانِ قدیم را شکست از غم نیست
غم خوی بمن کرد من خویے بغم بچوں من و غم دو یار در عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہے؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مردانگی قوت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور اس پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیتِ خاطر اور بردِ قلبی کے ساتھ بسر کیے جاسکتے ہیں؟ علمائے نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ حکماء نے کائنات کی گندہ حقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے درد بے رحم قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لیے ایک صلیب کے مانند ہے، جس پر بالآخر اس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور بہت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ، لرزاں ترساں؟ قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

لَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا مِنِّي إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (پ ۹۶) کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی مخلوق

دربوب شے حقیقت میں نافع و ضار ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر خوف کیوں؟ کیا یہ وہم کا نتیجہ

نہیں، باطل علم کی پیداوار نہیں؟ کیا اس سے نجات علم کی تصحیح سے ہو سکتی ہے، اختصار کے ساتھ بعض اہنی اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے خوف سے نجات اور زنجیروں سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنیں باندھ رکھی ہیں، دو طریقوں سے ہو سکتی ہے، ایک طریقہ ذہنی ہے اور دوسرا خارجی، پہلا طریقہ علم کی تصحیح پر مشتمل ہے اور دوسرا علم صحیح کے استعمال پر۔

(۱) علم کی تصحیح:۔ خوف سے دستگیری حاصل کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے مابعد الطبیعیاتی مسلمات کا جائزہ لینا چاہیے، مذہب کی زبان میں یہ عقائد کہلاتے ہیں ان کو عقل سے ثابت کرنے کی فلسفہ میں کوشش کی جاتی ہے، اور مذہب میں ان پر محض ایمان لایا جاتا ہے، اور وراہ طور عقل سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ خلاف تجربہ اور خلاف وجدان نہیں ہوتے یہ مذہبی زندگی کے وہی جذباتی اور حسی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جھانکے ہوئے ہوتے ہیں، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے، عقل ان کی تردید نہیں کر سکتی۔

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعاً رہائی مل جاتی ہے، حق تعالیٰ کا رحیم اور حکیم ہونا ہے، فلسفیانہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ کائنات تمہاری دشمن نہیں دوست ہے، تم روحانی کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے، یہ قوانین کو رازہ نہیں، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے، اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ تعاون پیدا کرو گے تو تم ان کو اپنا رفیق کار پاؤ گے اور نتیجہ طمانیت اور تسکین قلبی ہوگا، اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کرو گے، تو نقصان تمہارا ہی ہوگا، خوف و غم میں مبتلا ہو گے، حزن و یاس سے نجات نہیں ملیگی، اور اس کا باعث خود تمہارا جہل ہوگا، اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین و ایمان کی شاہانہ قوت سے قطعی طور پر بان لو کہ دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مبدئ خیر ہے، یہ مبدئ حق تعالیٰ ہیں جو حکیم بھی ہیں اور رحیم بھی! حق تعالیٰ خالق کائنات ہیں، جان کر

کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں، حق ہے، بجا ہے، سراسر حکمت سے مملو ہے، باطل کا
دہاں کوئی شائبہ نہیں۔ مَا صَنَعَ اللَّهُ فَهُوَ خَيْرٌ - ۶

زنیکو ہرچہ صادر گشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائیگا تو جہتِ خیر تم پر سربرہن ہو جائیگی، خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے
لگیگا، کمالات پر تمہاری نظر جائیگی، دل میں اور فطر میں، بطن میں اور بصیرت میں حق جلوہ افروز
ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائیگی، وہ عیب جو اور عیب میں نظر باقی نہ
رہیگی، وہ ذہنیت باقی نہیں رہیگی، جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے، اور اس پر اعتراض کرتی
ہے، مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی ان پر شرمچونے
کا حکم لگاتی ہے، اور وہی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم میں
كَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ان کا قول ہے، وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار
ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں۔ وَاللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا (پ ۲۶) جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں
اس پر رحیم ہیں تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ کو اپنا ولی جان کر وہ کس
چیز سے ڈر سکتا ہے؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ
بشانِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، دیکھ لیتے ہیں،
جب یہ ادراک مومن کے قلب میں قوی ہو جاتا ہے، تو اب وہ بیک جست خوف و حزن
سے آزاد ہو جاتا ہے، اور لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے رحیم و حکیم ہونے پر غور کرو، مضطرب قلب کو، پریشان دماغ
کو، معطل حواس کو، کچھ دیر کے لیے اس نقطہ پر مرکوز کرو، یہی وہ نقطہ ہے جو الوار کا منبع ہے، قوتوں کا مرکز
ہے، تو انائیوں کا مبدیہ ہے، اسی پر نظر جما کر تم خوف سے نجات حاصل کرو گے، تمہارا ضعف دور ہوگا
حزن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طمانیت و تسکین قلبی نصیب ہوگی۔

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاں دائیں تو ظاہر ہے کہ ۶

جہاندار دانہ جہاں داشتن!

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہر چہ آن خسرو کند شیریں بود!

ہر واقعہ کی تخلیق اس ہمہ خیر قوت سے ہو رہی ہے، جو حکیم مطلق بھی ہے، اور رحم و کرم مطلق بھی! اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لیے مضر نہیں ہو سکتا، وہ بحیثیت مجموعی میرے لیے مفید ہے، خیر برتر کے حصول کا ذریعہ ہے، یہ میرا جہل ہے کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، درپے آزار میں، جب تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں، اور میرے حال کے علیم، تو صحبتِ تامہ مجھے نصیب ہوتی ہے اور خوف بالکل رفع ہو جاتا ہے!

دوسرا اصول جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں ہم ہوں، وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ (پا ۱۶) جب مجھے اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں، اقرب ہیں، میری حفاظت فرما رہے ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر و گزند سے محفوظ ہوں، ان کے حفظ و امان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے بالکل دور ہو جاتا ہے اور سرور و اطمینان بلکہ ایک ذوقِ مستی پیدا ہو جاتی ہے:

در بجز تو بودہ اندوہ و آزارم از وصل تو رفت ہستی و پندارم

شادی آمد و نصیب جانم شد انکوں جان و تن خویش را ہر آزارم

جب بھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعاتِ خسروناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھانے لگیں تو میں اس امر کا احساس کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علوئے تکمیل حاصل ہے، اَنْتُمْ الْاَعْلَوْنَ

وَاللّٰهُ مَعَكُمْ كَامَصْدَاقٍ هُوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہنچ سکتا ہے، ان کی معیت کی وجہ سے میں ہر شے سے بلند ہوں ان کو رکھ کر مجھے کسی شے کی نہ خواہش ہے، اور نہ اس کے نہ ملنے کا غم جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو، تو پھر شکستِ خواہش کا بھی احتمال نہیں، اور اس کے نتیجہ غمِ خوف سے بھی آزاد ہوں!

لیکن غم و مصیبت و خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت و اطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت و شہود سے غافل نہ رہے ہوں، اور ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہو، اور کسی عارف کے یہ الفاظ ہلکے پیش نظر رہے ہوں۔

تشنہ او میر گر تو زندہ خاک آن در باش گر تو بندہ

ذره درد خدا در دل ترا بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، ان کی معبودیت و ربوبیت کا اقرار ہو، ذلت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف اور پریشانی کے وقت ہیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، مونس ہیں غمخوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اسی طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت و طمانیت پیدا ہوتی ہے، اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور خزن سے خون سے رہائی مل جاتی ہے!

اگر تم خوف سے بالکل رہائی کے خواہاں ہو، اس کی تیغ و بنیاد کو صحن دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو، جمعیتِ تائمہ کے حصول کے خواہشمند ہو تو خود شناس ہو، عرفانِ نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ اس عرفان کا آلہ محض عقل نظری نہیں، اس کے لیے اس عہد کی ضرورت ہے، جو بقول اقبال "ادب خوردہ دل" ہے، عقل نظری (قیاساتِ عقل پرانی) تمہیں خود شناسی میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی، یہ زیادہ تر اولیٰ باطل کا نقشہ تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کرتی اور

پھر اس کو بجا آتی رہتی ہے، یہی پاس کا محبوب مشغلہ ہے، یہ تمہیں لذتِ حضور سے محروم رکھتی ہے، کیونکہ خود اس کی تقدیر میں حضور نہیں۔

انجامِ خود ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
تمہیں اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے جو پیرروم کی ہدایت کے مطابق تم سے کہہ رہی ہیں
عقلے ہم رساں کہ ادب خوردہ دل است
یعقل تمہیں اس وقت حاصل ہوگی جب شیخ بوعلی سینا کی تحقیقات سے صرف نظر کر کے سخن
ہمدی سے دل بستگی پیدا کرو۔

دل در سخنِ محمدی بند اے پور علی ز بوعلی چند (عظیم خاتانی در تحفۃ العارفين)
تمہیں اس عقل کے ذریعہ جو نورِ وحی کی ہدایت و رہبری میں قدم اٹھا رہی، اپنی ذات کی
معرفت حاصل کرنی چاہیے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی "عبدیت" کا علم ہو جائیگا
کہ تم ذات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو خارجاً مخلوق ہو، غیر ذاتِ حق ہو، حق تعالیٰ تمہارے
ظاہر و باطن ہیں، اول و آخر ہیں، تم کو محیط ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تم سے قریب و اقرب ہیں
تم حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے
ہو، ان ہی کی قدرت و ارادے سے قوت و ارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفات و حمدیہ
تمہارے پاس امانت ہیں، یہ تمہارے لیے اصالتہً نہیں امانتہً ہیں، تم فقیر و مہوار امین، امانت کا
استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو تو خلیفۃ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال
حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو ولی اللہ کہلاتے ہو۔ یہی جا اعتبارات ہیں، عبد اللہ کے فقر، امانت،
خلافت، ولایت، عبد اللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہوت و انیت ہے، صفات و افعال ہیں
ملک و حکومت میں، عبد اللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے، ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار
ہو سکتا ہے، وہ تو سرورِ محض ہے، اس لیے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابلِ بیان سرور

لے تو طبیعت کے لیے دیکھو مصنف کی کتاب "قرآن اور تصوف"

محسوس کرتا ہے، طمانینتِ محض و ذوقِ خالص کا مخزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی عارف
تام المعرفت نے ۷

چوں بدانتی کہ ظل کیستی فارغی گر مردی و گرز یستی
قنطرہ نوری سراپا نور باش بگذرا ز غم دانا مسرور باش

انسان اپنی اس حقیقی جدت کو فراموش کر کے خوف و حزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوف و
حزن اس کے قلب پر محیط اس لیے ہیں کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں اس
کے ہر درد و غم، ہر خوف و ہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے جاہل اس
سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی!

یک سد پر نان ترا فرق سر تو ہی جوئی لبِ ناں در بدر
تا بزائونے میانِ قعر آب در عطش و زجوع گشت ہستی خراب

(۲) علم صحیح کا استعمال :- جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ
جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و
باطن میں، جب تم کو یقین ہو گیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، مولیٰ و نصیر ہیں، اس پر رحم
ہیں، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرأت کے ساتھ کہو کہ کائنات
کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہیں کر سکتی، اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کر کے کہو۔

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَ کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں؟ کیا تجھ کو یہ
يَخْوِفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ (آیت ۱۶) ان سے ڈرتے ہیں جو خدا کے ماسوا ہیں؟ (ڈرمت)

ہمیں اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیے، دیکھو بچہ اندھیری رات میں

جاگ پڑتا ہے اور ڈر کر رونے لگتا ہے، تم اس سے کہتے ہو، ڈر مت، یہاں کوئی چیز ایسی نہیں

جس سے تم کو ڈر ہو، خوف کی چیزیں صرف تمہارے خیال میں ہیں، کمرے میں نہیں، اس

طرح خوف کی نفی کرنے کے بعد تمہیں ان چیزوں کا اثبات کرنا چاہیے جو صحیح ہیں۔ مثلاً تم کہو گے

میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے بازو ہی میں تو ہوں، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے، اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، اور اس کو تمہاری قوت پر یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بے فکری کی نیند سو رہتا ہے!

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت الشعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہیے، جرأت و ہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہیے کہ ساری دنیا میں خدا کے سوا تمہیں کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی! تم جانتے ہو کہ شیخی نہیں، واقعہ ہے حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ رحیم ہیں، جس کے ساتھ وہ ہیں، جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں، حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ جس پر وہ ستر پاؤں سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، ایسا مومن کا ثبات میں سوائے حق تعالیٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیاء مخلوق ہیں، مروب ہیں، محکوم ہیں، مملوک ہیں جب تک خالق و حاکم مالک و رب نہ چاہے، یہ ہیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہیں؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے الْحُكْمُ لِلَّهِ مُتَّصِفِ فِي الْأُمُورِ حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کے قبضہ قدرت میں تمام جانداروں کی پیشانی کے بال ہیں مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا، ڈرنا، ہمیں ان ہی کے جلال سے چلنا ہے، نافع وہ ہیں اور ضرار وہ، معز وہ ہیں، اور نذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہے اور نہ ضرر کی، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَلَوْ جُهِدَ الْعِبَادُ أَنْ يَنْفَعُوا بِشَيْءٍ لَمْ يَقْضِهِ اللَّهُ لَكَ لَمْ يَقْدِرُوا عَلَيْهِ وَأَوْجَعَدَ الْعِبَادُ أَنْ يَضُرُّكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَقْضِهِ اللَّهُ عَلَيْكَ لَمْ يَقْدِرُوا عَلَيْكَ

اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائیں، جو اللہ نے تیرے لیے

۱۔ اس حدیث کا ایک حصہ ہے، جو حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے، اور جس کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فتوح الغیب مقالہ ۴۲ میں پیش فرماتے ہیں، اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہئے کہ اس حدیث کی اپنے دل سے تکرار کرتا رہے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پلے۔

مقدر نہیں کی، تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں، جو اللہ نے میرے لیے مقدر نہیں کی، تو وہ اللہ پر قدرت نہ پائیں گے۔ اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ تجھے قطعاً کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیے! اور زندگی کا عجیب قانون ہے کہ جوں ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتی، حضرت دانیالؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں شیروں کے غار میں ڈال دیا گیا لیکن شیروں نے انہیں چھو تک نہیں، اس کی نفسیاتی توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت دانیالؑ کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف اللہ کے سینہ میں مطلق نہ تھا، اور اسی وجہ سے شیر انہیں چھونہ سکے۔ یہ تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ کتا جو خوف زدہ شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہیں آتا جو بالکل بے خوف ہوتا ہے، یہ جو سیاسی جنگوں میں جا بیٹھتے ہیں جہاں ہر قسم کے موذی اور درندہ جانور بھی موجود ہوتے ہیں، کیسے محفوظ رہتے ہیں؟ ان کی بے خوفی ان کے لیے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو محافظ سمجھتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے۔ کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمان راسخ کا۔

نفی کے بعد اثبات، یعنی نفس کو یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی وجہ نہیں، اب ہمیں حق تعالیٰ کی معیت، اجالت، قرب و اقربیت کا ادراک کرنا چاہیے، جس طرح کہ چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور دعوت کا یقین دلانا ضروری ہے۔ جب وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات میں ہے، وہ حق تعالیٰ کے نور میں منکشف ہے، اس کے داہنے بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلوب میں محسوس ہے، محفوظ ہے، تو پھر خوف کا سایہ اس کے قلب سے اٹھ جاتا ہے، (ظلمت نور کی موجودگی میں کیسے ٹھہر سکتی ہے؟) سرور و طمانینت حقیقی کا نفوذ اس کی رگ و پے میں ہونے لگتا ہے، وہ قطرہ نور بن جاتا ہے سر پایا نور ہو جاتا ہے، اور صریر و المئی سے ہلکار ہو جاتا ہے۔

اس مقصود کے حصول کے لیے تمہیں بعض اذلی وابدی صداقتوں کا دہرنا پڑی ہو گا، جب خوف و ہراس کی لہریں تمہارے قلب میں قیامت خیزی کر رہی ہوں، اور وہ بیٹھا جا رہا ہو، اور تمہاری نظر میں دنیا تاریک ہو رہی ہو تو تمہیں بیٹھ جانا چاہیے، اور آہستہ سے لیکن استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ معیت حق کا ادراک کرتے ہوئے، ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہیے۔

حَسْبِيَ اللَّهُ نِعْمَ الْوَكِيلُ نِعْمَ لِلَّوَالِي وَ نِعْمَ النَّصِيرُ
مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کار ساز ہے،
کیا خوب مولیٰ ہے، اور کیا خوب مددگار ہے۔

ان کی تکرار سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے اور اسی یقین کی وجہ سے ہمیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلعم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلبِ الہی پر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے :-

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ

درد بھرے دل سے العیاذ کی یہ پکار نکلی کہ حتی القیوم کی رحمت لے قلب کو سنبھالا دیا، اور اس کی حفاظت کے سامان فریضہ کر دیے!

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کرنے والے خیال کو قبول کیلئے کی وجہ سے، اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر نہ کرنا ممکن ہے جس سطح پر خوف کی موجیں اٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے، اور بالا تر سطح پر قدم جمائے دیکھو سمندر کا طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے، جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم کسی بلند پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلا خیز موجوں کے شر و شور سے ہمیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے نیچے سے باہر ہیں! بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ جاتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور

اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ! یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سارے دردوں کی دوا حق تعالیٰ ہیں، خوف و حزن کا علاج حق تعالیٰ کی محبت ہے، غیر اللہ سے بیزاری ہے، درد و الم خوف و ہراس کے وقت اپنے رخ کو حق تعالیٰ کی طرف اغلاص کے ساتھ پھیر دو، اور عجب کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ، اور پھر تمہارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا۔

در حضرت ما دوستی یکدلہ کن
 ہر چیز کہ غیر ماست آنرا یلہ کن
 یک صبح با اغلاص بیا بردرین
 گر کار تو بر نیاید آنکہ گلہ کن!

(ابوسعید مہندی)

بے خوف زندگی

جگے ریح پاک علییں بود کرم باشد کس وطن سرگسں بود! (رومی)
 آئیے آپ کو بے خوف زندگی بسر کرنے کے وہ گرتلا میں جنہیں صوفیہ کرام نے اپنے ذوق و وجدان
 سے دریافت کئے ہیں، اگر آپ انہیں سمجھ لیں اور ان پر عمل کریں تو آپ اپنی زندگی کو لاخوف و علیہم
 وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مصداق بنا سکتے ہیں اور خوف و حزن سے نجات حاصل کر کے بے خوف و
 مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

زیں شہدیک انگشت سام نم لبت از لذت اگر محو نگردی تف کن
 یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صوفیہ کرام کی زندگی حق تعالیٰ ہی کے قرب میں بسر ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ
 ہی کے لیے جیتے ہیں، اور انہی کے لیے مرتے ہیں، جیسا کہ عارف رومی نے کہا ہے:-

بہر نیرداں می زید نے بہر گنج بہر نیرداں می مرد نر خوف و رنج
 انگہاں خندد کہ او میند رصفا ہچو حلوائے شکر اور اقضا

ظاہر ہے کہ بے خوف زندگی کے حصول کا ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے، اور وہ
 یہ کہ قرب حق میں زندگی بسر کی جائے، اور اس امر کا یقین پیدا کیا جائے کہ ہماری زندگی میں حق
 تعالیٰ ہی کی مراد اہاں ہی کی نشا، کی تکمیل ہو رہی ہے، اور یہ فضا، یا مراد خیر برتریں ہے۔
 عمر خوش در قرب جاں پرودن است عمر زاغ از بہر سرگسں خوردن است (رومی)
 اس مضمون میں ہم اسی اجمال کی تفصیل بیان کرینگے۔

صوفیہ کا یہ یقین قرآنی تصور پر مبنی ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں، اقرب ہیں، ہم پر محیط
 ہیں، ہمارے ساتھ ہیں، وہ ہم سب سے غائب نہیں، بعید نہیں، اِنَّ رَبِّي قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ میرا رب

مجھ سے قریب ہے۔ میری دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے **إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ** بیشک وہ مجھ سے قریب ہے، اور میری سنت ہے۔ جب کسی نے اپنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارا رب نزدیک ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے جو ہم اس کو پکاریں تو جواب میں یہ آیت نازل ہوئی **وَلَا تَسْأَلُكَ عِبَادِي عَنِّي فَاِنِّي قَرِيبٌ** جب میرے بند مجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو قریب۔ ان سے کہہ میں قریب ہی تو ہوں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، تو آپ نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ارْجِعُوا عَلَيَّ فَسَمِعُوا یعنی لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو یعنی آہستہ کہو
انكم لا تدعون اصمًا ولا غائبًا انكم تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو
تدعون سميعًا بصيرًا وهو معكم تم پکار رہے ہو مستننے اور دیکھنے والے کو جو تمہارے
والله ان تدعوننا اقرب الى احدكم ساتھ ہے اور تم جس کو پکار رہے ہو وہ تمہارے
من عنق راحله۔ اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یہ حدیث وما کنا غائبین کی تفسیر ہے، اور فانی قریب کی تشریح، صحیح ہے۔ خواب جہل از سرم قرب مراد و فگند در نزدیکی تراز دست کے پہنچانید اس معرفت کے حصول کے بعد جو درادھور عقل و نظر ہے، جس کی سند نفسِ قطعی و کشفِ صحیح ہے، اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ قرب حق بغیر اختلاط و حلول و اتحاد ہیں حاصل ہے، صوفیہ کرام نے قرب حق کے دو پہلوؤں پر فکر کرنے ان کا تحقق حاصل کرنے اور ان پر قلب کی قوتوں کو مرکوز کرنے کی ہدایت کی ہے، جس کی وجہ سے روح کو چین اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور خوف و حزن سے قطعی طور پر نجات مل جاتی ہے، اور وہ دو پہلو رحمت و حکمت کے ہیں۔

۱۱، قرب حق رحمت ہے، رحمت حق ہیں کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی، نقصان پہنچانا ہرگز

۱۲، کتابت امام ربانی مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۲۵۔ شیخ علی المہامی در تفسیر القرآن المسمی تبصیر الرحمن ج ۱ ص ۲۱۹

نہیں چاہتی، اور نہ غیر کو نقصان پہنچانے دیتی ہے، حق تعالیٰ تو عظیم و رحیم ہیں، غفور و کریم ہیں ان اللہ
بِكُرِّ لِرُؤْفَتِهِ رَحِيمٌ وہ تو ہمیں سلامتی امن و رحمت ہی کی جہت بلاتے ہیں، اللہ یدعو الی دار السلام
ان کا فضل و کرم عظیم ہے، واللہ ذو الفضل العظیم وہ ہلکے سچے دوست ہیں باللہ ولی الذین
أمنوا! اگر ہم اس بنیادی واقعہ کو یاد رکھیں، فراموش نہ کریں، بھلا نہ دیں، ان کے سایہ رحمت میں
زندگی بسر کریں اور ان کی یاد میں رہیں تو کوئی چیز ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ رحمت حق کا مقابلہ
کوئی چیز نہیں کر سکتی، حق کے مقابلہ میں کوئی قوت آ سکتی ہے:

لیکن ہماری زندگی ذہول و غفلت میں گزرتی ہے، معصیت و نافرمانی میں بسر ہوتی ہے، حق تعالیٰ
یار مہربان کی طرح ہمارے جویا بھتے ہیں، اور ہم گدھوں کی طرح ان سے بھاگتے ہیں، اور ہلاؤں اور
آفتوں کا شکار ہوتے ہیں۔

تو مرا جویا چو یار مہربان من گریزاں از تو مانند خزان (روحی)

جب خوف و خزن آفات و طیات کا سامنا ہو اور ہم قرب حق کا ارادہ قائم کر سکیں، قلب کو
اس واقعہ کا یقین دلا سکیں، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، اپنی رحمت کاملہ کے ساتھ ہلکے قریب
ہیں، مونس و رفیق ہیں، یار مہربان ہیں، ہماری قوت بازو اور ہماری پناہ گاہ ہیں، سہارا ہیں، وہی حق
تعالیٰ جن کے حضور میں رات کی سیاہی اور دن کی روشنی آفتاب کی شعاع اور چاند کا نور درخت کے
جاندار اور پانی کے حیوان سجدہ ریز ہیں، جو محسن و مکرم و منعم ہیں جو حرز صفا و کفر فقر اور ہیں تو بہلا بتلا و گدھ
اس ادراک کے بعد قلب میں خوف باقی بھی رہ سکتا ہے، عا شا و کلار! قرآن کریم نے بیابانگ دل ہلا
کیا ہے کہ اس ادراک یا ذکر کے بعد قلب کا اطمینان قطعی و یقینی ہے۔

الذین آمنوا و تطہرت قلوبہم جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے

دل کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے

ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

نکۃ توجہ یہی ہی کا تو نام ہے، حق تعالیٰ کی طرف، ان کی رحمت و محبت کی طرف قلب نے توجہ کی

اس امر کا ادراک کیا، کہ یہ رحمت ہم پر ہر جانب سے محیط ہے کہ خوف دور ہو اور طمانیت نصیب ہوئی اور زندگی کے میدان میں قدم اعتماد و اطمینان کے ساتھ بڑھنے لگے، کیونکہ اب ہمیں یقین ہو گیا، اور ہم نے محسوس کر لیا کہ رحمت حق ہمکے سامنے ہے، کان بالموثنین رحیما!

لیکن خوف و خطر کے وقت رحمت کا ادراک اور اس کا تحضر و تحقق کوئی ایسی چیز نہیں جو سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکے، اگر ہم نے راحت و آسودگی کے وقت فراغت و طمانیت کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم نہ رکھا ہو تو خوف و مصیبت کے وقت ہم اس معیت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے حوالہ کر دیا گیا، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ ہر حالت میں خواہ وہ نعمت و راحت کی ہو یا بلا و مصیبت کی حق تعالیٰ کی جانب لگتے رکھیں، ان کی یاد میں زندگی بسر کریں، ان کی معیت کا ادراک کرتے رہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس کو اس بنا پر نصیحت فرمائی تھی کہ

أَذْكُرُ اللَّهَ فِي الرَّخَاءِ يَذْكُرُكَ إِشْرُكِي يَادُحِينَ كِي حَالَتِي مِي كَرُوهُ بَحْثُ كُو سَخْنِي كِي حَالَتِي فِي الشَّدَاةِ - مِي يَادُ كَرِيحَا - بَعْنِي تِيرِي مَصِيْبَتِي دَوْرُ كَرِيحَا -

جب انسان آسائش اور چین کی حالت میں حق تعالیٰ کی یاد نہیں بھولتا، تو حق تعالیٰ بھی اس کو خوف و مصیبت کی حالت میں نہیں بھولتے، اس لیے تاکید کے ساتھ حکم ہوا ہے۔

فَلْيَكْثِرِ الدُّعَاءُ عِنْدَ الرَّخَاءِ حِينَ أُرْسِلُشَ كِي وَتِ زِيَادَةُ دَعَا كَرْتِي رَحْمَةً - جَانْتِي مَوَكْرِي حِينَ كِي حَالَتِي مِي دَعَا كَا كِيَا مَطْلَبِي حِي، صَرَفِي يَادُ رَاكِي كِي مَرَحْمَتِي دَرَا صِلِي حَقِّي تَعَالِي كِي نَظَرِي سِي عَطَا كِي جَانْتِي حِي - وَمَا يَكْفُرِي مِي نَعْمَتِي كِي مِي إِدْبَارِي حَقِيْقَتِي مِي مَنَمِي، قَامِي، فَاعِلِي مَسْبَبِي مَوْجِدِي حَقِّي تَعَالِي حِي مِي مَنِي حِي كِي مَرَضِي كِي مَطَابِقِي نَعْمَتُو كِي كَا اسْتِمَالِي صَرُورِي حِي، اس كُو دُورِي كِي

الفاظ میں شکر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور مؤمن کی شان میں فرمایا گیا ہے:

لِلْمُؤْمِنِ شُكْرٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ مَوْسَمِي حِينَ كِي حَالَتِي مِي حَقِّي تَعَالِي كَا شُكْرُو كَرْتِي حِي -

اگر ہم آسائش و نعمت کی حالت میں حق تعالیٰ کو یاد نہ رکھیں، نعمتوں کو ان ہی کی جانب سے

نہ بھیں، اور اس طرح اپنا رخ ان ہی کی جانب نہ رکھیں، تو مصیبت و خوف کے وقت ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، جو ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے، چہنچہن آسائش کے وقت حق تعالیٰ کی یاد ہمیں اس قابل بناتی ہے، کہ خوف و مصیبت کے وقت ہم ان کی معیت کا ادراک کر سکیں ان کی رحمتِ کاملہ کو اپنا مونس و رفیق پاسکیں، اس لیے حضور انور نے ابن عباس سے فرمایا تھا، کہ اے لڑکے :-

احفظ الله يحفظك الله، احفظ خدا کی نگہداشت کرو، خدا تمہاری نگہداشت کرے گا۔

الله تجده امامك - خدا کو حاضر جانو تو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔

اگر ہم حق تعالیٰ پر نگاہ رکھیں، یعنی ان کی معیت کے ادراک میں رہیں، تو حق تعالیٰ ہمیں اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں (اپنی رحمت و نصرت سے) اگر ہم حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم رکھیں، تو ہم انہیں اپنے سامنے ہی پاتے ہیں :-

خوف کے وقت حقیقی دعا تو یہ ہے کہ ہم کہیں حق تعالیٰ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، میں آپ کی نظروں میں ہوں، پھر کوشش اس امر کے ادراک کی کی جائے کہ ہم حق تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے نہیں، اور ان کی رحمتِ کاملہ بادل کی طرح ہم پر سایہ فگن ہے، یا نور کی طرح ہر جانب سے ہم پر محیط :-

خوف اور بلا کے ورد کے وقت قرآن شہد ہے، کہ پیغمبر اسلام (فداہ روحی) کو حکم ہوا کہ

فَاضِدُّ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا اپنے رب کے حکم پر مبرکرو کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو

بعض عارفین کی جیب میں یہ آیت لکھی رہتی تھی، خوف و مصیبت کے وقت اس پر نظر

ڈالتے، حضور و معیت حق کا ادراک کرتے، اور محض اس ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت

کو جانتے ہیں، اس تجربہ میں شریک ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھومتے زفص کرتے، خود حضور انور پر اس آیت

سے وجد طاری ہوا تھا، اور ام المؤمنین عائشہؓ صدیقہ آپ کے پاؤں پر لگی تھیں، عجمی نے شاید اسی

مفہوم کو یوں ادا کیا ہے،

بادردبازچوں دوکے تو منم درکس منکر کہ آفتکے تو منم
گر بر سر کوئے عشق اکتے شوی شکرانہ بدہ کہ خونہلکے تو منم

(۲) ثانیاً قریب حق یا حضور حق حکمت و نظم کا نام ہے، حضور حق عالم لاہوت ہے، عالم لاہوت میں کامل الہی نظم پایا جاتا ہے، بے نظمی یا اختلال نہیں، عالم لاہوت میں ظہر نہیں فساد نہیں بلکہ کامل نظم و ترتیب ہے۔

نظم کائنات پر غور کریں یہاں پر قانون اپنا عمل کر رہا ہے، اس کی شکست یا ناکامی ناممکن ہے مثلاً کوئی برقیہ (Electron) تک اپنے کام میں تصور نہیں کرتا، دوسرے برقیے نہیں نکراتا ان کے درمیان تصادم ممکن نہیں، یا قرآنی الفاظ میں یوں کہو کہ صنح الہی میں کوئی دخل نظر نہیں آتا بار بار نگاہ ڈالنے پر بھی نگاہ دراندہ ہو کر لوٹی ہے، اور کوئی عیب یا دخل نظر نہیں پڑتا۔

ماتری فی خلق الرحمن من تفویثہ تو ضلک صفت میں کوئی دخل نہ دیکھو، تو پھر نگاہ
فارجع البصر هل ترى من خطور ثور ڈال کر دیکھ لے، کہیں بھوکو کوئی دخل نظر آتا ہے
ارجع البصر کونین یقلب الیک پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ، نگاہ ڈالیں اور درنا
البصر خایہ ما وھو حییرد پیا ۱۶ ہو کر تیری طرف لوٹ آئیگی۔

عالم لاہوت میں اس سے کہیں زیادہ کامل نظم و توافق کی حکمرانی ہے، یا یوں کہو کہ نظم الہی میں کامل توافق یا ہم آہنگی پائی جاتی ہے، نغمہ موسیقی جن تاروں سے پیدا ہوتا ہے، ان میں سے ہر تار اپنی مقرہ شرح ہی سے قمرش ہوتا ہے، اس رفتار میں کی یا زیادتی نہیں ہوتی، نظم الہی کا بھی یہی حال ہے، یہاں بھی ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوئی ہے، اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہے، اپنا مقروضہ کام انجام دیتی ہے، اس کو کامل طور پر انجام دیتی، اور اپنے صحیح وقت پر انجام دیتی ہے۔

حضور حق یا قریب حق کے مفہوم میں نظم الہی بھی شامل ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہائے قریب ہیں، اقرب ہیں، ساتھ میں نظم الہی، حکمت حق بھی اس کے ساتھ موجود ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں تو اس کا ظہور بھی نطقاً ہو کر رہیگا۔

جب ہم اپنی دعائیں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، تو ہمیں اس امر کا تحقق ہوتا ہے کہ معیتِ حق نہ صرف رحمت ہے، بلکہ حکمت بھی ہے، نظم بھی ہے، لہذا ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوگی، اور اپنے ٹھیک وقت اور ٹھیک مقام پر ہوگی، اور اگر ہم اس یقینِ صادق کو قلب سے ہٹنے نہ دیں، تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔

عارفِ رومی نے اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا ہے:

رو دیدہ بپوش تا دولت دیدہ شود لڑاں دیدہ جہانِ دگر ت دیدہ شود

گرتوز پسند خویش بیرون آئی کارت ہمہ سر بسر پسندیدہ شود

اگر دیدہ دل سے حکمتِ الہی نظر آنے لگے، اگر دل نظمِ الہی کا مشاہدہ کرنے لگے، اس یافت و شہود میں وہ جا بھی ہے، تو پھر عارف کا ہر کام پسندیدہ ہی ہوگا، اپنے وقت پر ہوگا، اپنے مقام پر ہوگا، اور ہر وقت وہ یہی کہیگا کہ ”اخیر فیما وقع“ جو ہوا وہ ٹھیک ہوا،

ہر چیز کہ ہست آسپناں می باید و آن چیز کہ آسپناں نمی باید نیست!

صرف یہ کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں، اللہ معنا۔ بلکہ ہر زندگی میں منشاءِ الہی ہی کی تکمیل ہو رہی ہے، ہمارے دل، ہمارے اعضاء اور ہم خود سرتاپا حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں، اس منشاءِ الہی کی بنیاد نامتناہی حکمت و رحمت پر قائم ہے، یہ سرتاپا حکمت ہے، رحمت ہے، یہ ہیں خیر برتر ہی کی طرف لجا رہی ہے، اس کو ارادۃ اللہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مرضی ہوئی بھی کہا گیا ہے، حق تعالیٰ کے ارادے سے توافق ان کی رضا سے راضی ہوتا، رضا ازو، رضا بدو، رضادو، اعراف عن الاعتراف، حفظِ حال، قیام فی ما اتاہ اللہ، اس کی تعلیم تو ہمارے رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دی ہے، حق تعالیٰ کے ارادے، منشاء، مرضی سے زیادہ بہتر، زیادہ تقسیر زیادہ حسین و جمیل، زیادہ شاندار کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نیک انجام و شاد کام ہے، وہ شخص جس نے اپنے ارادے سے حق تعالیٰ کے ارادے کے خلاف کام نہ لینے کا ارادہ کر لیا اور باقائے بند کہا۔

اَرِيدُ اَنْ لَا اَرِيدُ میں نے ارادہ نہ کرنے کا ارادہ کیا۔

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے معروضہ کیا ہو۔

اللھم ان قلوبنا ونواصینا و
 جوارحنا بیدک لودمکننا منها
 شیئا فاذا فعلت ذلک، فکن
 انت ولینا واهدنا الی سوا
 السبیل

حق تعالیٰ! ہمارے دل ہم خود سزا پا اور ہمارے
 اعضاء، آپ ہی کے قبضہ میں ہیں! آپ نے ہیں ان
 میں سے کسی چیز پر بھی اختیار (کامل) نہیں دیا ہے،
 پس جب آپ نے یہ کیا تو آپ ہی ہمارے مددگار رہے
 اور ہیں سیدھی راہ دکھاتے رہے۔

جس کی شب روزیہ دعا ہو کہ

اللھم انی ضعیف فقوئی رضاک
 ضعفی وخذ الی الخیر بنا صیتی
 قاجعل الاسلام منتہا رضائی

حق تعالیٰ میں کمزور ہوں پس اپنی مرضیات میں میرا ضعف
 اپنی قوت سے بدل دیجیے، اور کشاں کشاں مجھے خیر کی
 طرف لے جائیے، اور اسلام کو دینی ہر امر میں آپ کے
 سامنے تسلیم ختم کرنے کی خوئی میری پسندگنا بنا دیجیے

جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو دیدیتے ہیں، نرم اور ملائم اور لچکیلے ہو جاتے ہیں،
 ان کے ارادے کے آگے تسلیم ختم کر دیتے ہیں، ان کی رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہو جاتے
 ہیں تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہوتے ہیں، زبان وحی نے اس
 کی توشیح کی ہر ایاۃ واللہ رجا لایرضی برضاہم و یغضب بغضبہم کل انہم یرضوا برضاہم و یغضوا بغضبہم

ہر چہ خواہی کن کند گر ہر چہ خواہی آن کنی
 اپنے گوئی یثنوہ گر ہر چہ گفت او یثنوی

جب مقام رضا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر ہیں پورا نہیں رہتی کہ زندگی میں ہم پر کیا گزر رہی ہے،
 یا گزرنے والی ہے، کیونکہ ہم جتنے لگتے ہیں کہ انجام ہر چیز کا خیر ہے، خیر اب بھی اور ہمیشہ کے لیے
 بھی، یہی لیے شیخ جیل نے جان کر کہا تھا کہ

لہ تردی عن الی ہریرہ و کثر العمل عن جابر۔

لہ فتوح الغیب

الرضا بالقضاء والراحة الكبرى و
 الجنة العالية المنفردة في الدنيا
 وعلة محبة الله بعبد المؤمن فمن
 احبه الله لم يعد به في " ۱۰۰ "
 والآخره له
 تقبلت الہی سے راضی رہنا دنیا میں بڑی راحت کا
 سبب ہے گویا جنت عالیہ ہے اور عابد مؤمن کے ساتھ
 حق تعالیٰ کی محبت کا باعث ہے اور جس سے حق تعالیٰ
 محبت کرتے ہیں اس کو دنیا میں تکلیف دیتے ہیں اور نہ
 آخرت میں۔

قرب حق میں زندگی بسر کرنے اور اس پر یقین صادق حاصل کرنے کا کہ ہماری زندگی میں مراد
 الہی کی تکمیل ہو رہی ہے، نتیجہ خوف پریشانی فکر اور بے شمار خرابیوں کا کال دہیہ ہے۔ ہم کو اس
 سے اس غارت کال کا نقطہ نظر حاصل ہو جاتا ہے جو زندگی اور اس کے ہجوم و غموم، افکار و
 پریشانیوں پر ہتے ہوئے نظر ڈالتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پس پردہ حکمت مطلقہ و رحمت
 مطلقہ کام کر رہی ہے اور اپنے شاندار منشاء و مراد کی تکمیل کر رہی ہے اور ہمیں خیر برترین کی طرف
 لے جا رہی ہے۔ سارے جہان کو بھی وہ اگر برف سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہے تو گھبراتا نہیں کیونکہ وہ جانتا
 ہے کہ خورشید کی ایک نظر سے یہ ہماری برف پگھل جائے گی۔

گر جہاں پر برف گرو دسرسر تاب خور بگدا زوش از یک نظر (روحی)
 اس لئے وہ اپنے ساتھیوں سے عجیب امید افزا لہجہ میں کہتا ہے۔

سوئے نومیدی مرو کامیداست سوئے تاریکی مرو خورشید است
 بے خوف زندگی بسر کرنے کا راز تم نے دیکھا بس۔ چہ ہے کہ

(۱) قرب حق میں زندگی بسر کرو کیونکہ

عمر خوش در قرب جاں پروردن است عمر زانغ از بہر سرگیں خوردن است

(۲) حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں نرم اور ملائم بن جاؤ، تاکہ ارادۃ اللہ جاری ہو جائے، رضائے حق

تمہارا مقام ہو، "قیام فی ما اقام اللہ" حق تعالیٰ نے جہاں تمہیں کھڑا کیا ہے وہیں کھڑے رہو، رضا

بالعطا، حفظ حال تمہارا شیوہ ہو، ہر حالت میں خوش رہو، تضادم بالقضاء سے بچو۔

جن تجربات سے گزر رہے ہو، ان پر خدا کا شکر کرتے رہو کہ ان کا تمہیں موقع دیا گیا، ان ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے، دنیا کو رُوحِ سازِ "وادی کہا گیا ہے، یہاں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفہ نغمے بیدار کئے جاتے ہیں۔ ان پر ہر حال میں شکر واجب ہے۔ کرب و بلا دونوں کی ایک سی قیمت ہے۔

بہ الفاظ دیگر جن چیزوں سے تمہیں خوف ہو، ان ہی سے پیار کرو، تو خوف سے تمہیں ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔

بس زبونِ دوسوسہ باشیِ دلا
گر طرب را باز دانی از طلا

دارے جان

”بازگشت دم بطیبی دکان مرہم دل دام و دارے جان“
 آفت و بلا، غم و حزن، اندوہ و درد کے دفع کرنے کا طریقہ جس کی تعلیم خاص طور پر صوفیائے
 کرام نے دی ہے، جو قرآن و دین قرآن سے ماخوذ ہے، یہ ہے کہ بلا کے نزول کے وقت نظر مبہلی یعنی مبتلا
 کرنے والے پر نگہ جائے، اور وہ حق تعالیٰ ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (سورہ تغابن ۲۰) اللہ کے حکم کے بغیر کوئی مصیبت نہیں پہنچتی۔
 قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا (سورہ توبہ ۶۰) کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے۔
 اور یہ ایمان و اذعان تو حاصل ہے کہ ”فعل جمیل حقیقی ہمہ از جمال است“ ”اللہ جمیلٌ وَحِبُّ الْجَمَالِ“،
 ہاں فرق صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ جمال جلال کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور دوسری جگہ
 جمال جمال ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس ایک عاشق کے الفاظ میں

”بجز اضمحلال و دودیت نعم و گم شدن دھیواں ماندن در التذاذ اہنا کارے نباشد“

یعنی حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مشاہدہ میں مضمحل ہو جانے اور اس کی لذت میں گم اور حیران ہو جانے کے
 سوا کوئی دوسرا کام نہیں!

دوسرے الفاظ میں نزول بلا کے وقت قلب کو بلا پر مرکوز کرنے کے بجائے اسکو ”جمع ملک و قوی“
 کے ساتھ مبہلی یعنی حق تعالیٰ پر مرکوز کرنا چاہیے اور اس کے جلال کو جمال ہی کی ایک شان اور ایک طور جان
 کر اس کی یاد، اس کے شکر سے اس قدر بھر دینا چاہیے کہ لذت دید کے سوا کسی اور چیز کا خیال ہی قلب
 میں نہ آسکے! کسی پختہ کار نے اس کیفیت کو یوں ادا کیا ہے:

وصل تو چوں دست داد ملک جہاں گو مباش لعل تو چوں حاصل است جو ہر جاں گو مباش

عاشقِ رؤے تو نیت طالبِ دنیا و دین آرزوئے جاں توئی، کون و کجاں گو مباحش
گردشِ گردوں اگر قطع شود گو بشو حاصلِ فطرت توئی، دوزماں گو مباحش
بے تو نیرزد جوے ہرچہ بود در جہاں مایہ جاں ما توئی، سود و زیاں گو مباحش

اس دید کا نتیجہ وہی ہے جو قرآنِ عظیم میں یوں بیان کیا گیا ہے :

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ (سورہ فتح - ۱)

وہی ہے جس نے قلوبِ مؤمنین میں اطمینان پیدا کیا تاکہ اور بڑھ جائے ان کا ایمان اپنے ایمان کے ساتھ۔

کیا یہ طریقہ آسان ہے؟ قابلِ عمل ہے؟ جب مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جو فِ مَدہ میں اعصاب کی جو گتھی ہے اُس پر تھوٹے کی ایک ضرب پڑی، سو اس میں اختلال پیدا ہو گیا۔ تلخی، بلا سے دل خون آلود ہو گیا۔ خوف و حزن کا تسلط قلب و دماغ پر ایسا ہو گیا، کہ کچھ بھی سوچنے نہ لگا۔ اس رنجِ رواں کے طوفان میں نفس و قلب و رُوح سب غرق ہو گئے۔

ہاں یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن کامل علاج صرف ایک ہے اور وہ **فَقِشْ وَأَلِي اللَّهُ** اور **تَبْتَئِلْ إِلَيْهِ قَبِيلًا** پر عمل کرنا! نزلِ بلا کے وقت قلب کی توجہ کا حق تعالیٰ کی طرف ہو جانا ہے۔ جو بلا میں مبتلا کرنے والے ہیں۔ اور خود مصیبت و بلا کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔ صوفیہ کے الفاظ میں "مستانہ و ارا یک حملہ کرنا ہے اور علم سے نکل کر معلوم تک جا پہنچنا ہے" یا عاشقِ وارفتہ کے الفاظ میں معاملہ کی صورت کا یہ ہو جانا ہے :

قبل و محراب من ابروئے دلدارست دبس! این دل شوریدہ را بایں چه و بآں چه کار (صافظ)
عمل کے لئے علم ضروری ہے، علم قائلِ عمل ہے۔ یہاں تمنا سے بے کس علم کی ضرورت ہے۔ نبی کے تمام صفات کے معرفت کی ضرورت ہے۔ نبی حق تعالیٰ ہیں۔ ہر بلا کا ظہور حق تعالیٰ ہی کے علم و حکم سے ہو رہا ہے اور حق تعالیٰ پہلے مولیٰ ہیں، رحیم و کریم ہیں، لطیف و رؤف ہیں، محسن و منعم ہیں حق تعالیٰ کی ان صفات کی وجہ سے اُن کی رحمت کی اُمید کا ہمارے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے اور حُسنِ ظن کا قائم

ہو ملازمی اور عین ظن شیخ جبلی رحمہ اللہ کے الفاظ میں "حوالہ کر دن مقاصد خویش بر سابقہ امر عنایت جناب الہی است" : نظر قلب است بسوئے حق بے تطبیح فوادو بے تمنیہ ادواح و نفوس : یعنی اپنے تمام مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایت سابقہ کے حوالے کرنا ہے اور قلب کی نگاہ کا ان پر جم جانا ہے۔ ایسی حالت میں قلب سے طمع اور روح و نفس سے تمام تمنائیں نکل جاتی ہیں اور ہم حرج اٹھتے ہیں۔

تو در دلی! بغم این و آن کہ پروازد؟ بجائے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پروازد؟

زناز نیست تر افرصت و مر از نیاز کموں بجال دلِ ناتواں کہ پروازد؟

صوفیہ کرام کی اصطلاح میں یہ "جذبہ خواص" ہے یعنی "توجہ قلب بسوئے حق مع القطار

عما سواہ" قلب کا حق کی طرف متوجہ ہو جانا اور غیر حق سے کٹ جانا، غیر حق سے خالی ہو جانا ہے۔

دل یادت ویدہ کہ مقیم ہونے تست (شمس تبریز)

یعنی "لَا مَرَادَ وَلَا الْإِرَادَةَ" کا مقام کہلاتا ہے۔ اس مقام کا انسان "جلال محبوب کو جمال

محبوب سے بہتر خیال کرتا ہے، درد و الم کو انعام سے زیادہ تصور کرتا ہے۔ جانتا ہے کہ جمال و انعام میں

محبوب کی مراد اپنی مراد کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہے اور جلال و ایلام میں خاص محبوب ہی کی مراد ہے اور اپنی

مراد کے برخلاف "تشتان بینہما" اس کے قلب کی کشش دائمی طور پر محبوب ہی کی طرف ہوتی ہے

دنیا و آخرت کی نعمتوں سے اس کا دل بلا ہو جاتا ہے، اس کو تمام احوال و مشاہدات سے یکسوئی دے نیازی

حاصل ہو جاتی ہے حق تعالیٰ ہی سے دائمی آرام و آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو قرب المقال

وصال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

گشتہ ام در جہاں و آخر کار

دلبرے برگزیدہ ام کہ مسپرس (حافظ)

دوسرے الفاظ میں اس حالت قلبی کو "فقر" سے تعبیر کیا جاتا ہے جس پر آن حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کیا ہے "الفقر فخری" فقر میں قبلہ توجہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی چیز

نہیں ہوتی۔ اسی فقر سے "غنا" پیدا ہوتی ہے جو حق سے کامل نیاز پیدا ہو جانے کی وجہ سے

خلق سے بے نیاز مہولنے کا نام ہے۔

آن کس کہ ترا شناخت جان را چه کند

دیوانہ کئی ہر دو جہانش بخشش ! دیوانہ تو ہر دو جہاں را چه کند

یہ حال تو منتہیوں کا ہے، ان کی نظرات بخت پر ہوتی ہے۔ ان کا قلب ماسوا اللہ سے

فارغ و خالی ہوتا ہے مقصد و مطلوب بجز واحد مطلق کے کچھ نہیں رہتا۔ تمام مقاصد ان کے

سینہ سے نکل جاتے ہیں اور ان کی ساری ہمت حق تعالیٰ کی رضا مندی کے حصول میں صرف ہوتی

ہے۔ زندگی کا مقصد ان کے نزدیک بس یہی ہے اور اسی طرف خلق کو وہہ بلاتے ہیں

سررشتہ دولت لے برادر یکن آرزویں عمر گرامی بہ خسارت مگذار

دائم ہمہ جا با ہمہ کس در ہمہ کار می دار نہفتہ چشم دل جانب یار

بند یوں کا حال اس کی بالکل ضد ہے! یہ اپنے خدا کو زندگی کے مصائب سے نجات

پانے کے لئے استعمال کرتے ہیں، گویا کہ وہ ان کی خواہشوں اور تمناؤں کے پورا کرنے کا ایک لہ

ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس سے دعا کرتے ہیں۔ ان کا مطلوب و محبوب ان کی اپنی

تمنائیں ہیں۔ ان کا سینہ ان کی اپنی خواہشوں اور آرزوؤں سے بھرا ہوتا ہے۔ ہر خواہش پر ان کا

دم بکلتا ہے، تلخیوں سے ان کا دل پر خون ہوتا ہے۔ دراصل یہی آرزو و آسان ان کے مبدو ہیں!

مصائب میں گرفتار ہونے کے بعد خوف و حزن کو لازم قلب ہو جاتے ہیں۔ ان سے جب یہ کہا جاتا ہے

کہ اپنے سینے سے مقاصد کی نفی کر دو اور قلب کی توجہ کو حق تعالیٰ پر مرکوز کرو۔ اپنے مصائب سے نظر

اٹھاؤ اور حق تعالیٰ پر اس کو قائم رکھو کہ یہی راحت جان کے حصول کا واحد طریقہ ہے۔

مکن رغبت بہ چیزے ورنہ حالت بے صفا گردد

برغبت آنچه خواہی عاقبت برمان بلا گردد

بات تو ان کی سمجھ میں آتی ہے لیکن اس پر عمل ان کے لئے ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ

ناممکن نہیں۔ اس کا آسان طریقہ ہم بتاتے ہیں اور وہ یہ ہے: مصائب کے نزول کے وقت

تجربیدی طور پر خدا کی طرف توجہ واقعی ابتدا میں شکل ہے۔ ایسے وقت قرآن کریم کی آیت پر توجہ مرکوز کی جاسکتی ہے۔ مثلاً اس آیت کو لیجئے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (اپنے سب کے حکم پر صبر کر کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)

اس آیت کے مفہوم کو سمجھ کر کہ حق تعالیٰ ہماری حالت سے واقف ہیں، ہم ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور جو خیر دست پر قربان ہو جاتا ہے وہ سب کے لئے کر پیر تک جان ہی جان ہو جاتا ہے۔ ہم اس آیت کی تکرار کرتے جائیں تو ہمارا دل شوریہ رفتہ رفتہ ساکن و مطمئن ہوتا جاتا ہے اور رُوح کو بتدریج روشنی و فہم عطا کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہمیں یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے، اب بھی اور ایک کروڑ سال بعد بھی!

مبتدی کے یہ بات گو سمجھ میں نہ آئے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہمارا کام نزولِ بلا کے وقت صرف اتنا ہے کہ قلب کو حق تعالیٰ سے مربوط کر لیں اور اس طریقہ سے سکینت و اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مصیبت خواہ کتنی ہی بڑی ہو، قلب کی سنبھال اصل چیز ہے اکل ہمیں سولی ہی دی جانے والی ہو ہمیں آج صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ قلب کی وسعتوں میں حق تعالیٰ کو گھیر لیں، اور ان کے سوا کسی اور کی جگہ نہ چھوڑیں۔

در دل بجز یکے نہ شاید کہ بود درخشان اگر ہزار باشد شاید!
اس کا طریقہ ابتدا میں یہی ہے کہ کسی موزوں آیت پر توجہ کو پوری قوت سے مرکوز کر دیں ابتدا میں ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارا قلب گویا ایک مینا یا تار ہے جس میں شور و غوغا، جھنجھ و پیکاز کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں اس سے بچ نکلتا ناممکن معلوم ہو گا۔ لیکن اگر ہم آیت کریمہ کی تکرار کرتے جائیں تو رفتہ رفتہ شور میں کمی ہوتی جائے گی۔ ہمیں ہمت و استقلال سے کام لینا ہو گا کیونکہ جو ہی خیال آیت پر جھننے لگے گا پھر مصیبت کا تصور ہمیں پریشان کرنے لگے گا اور ہمیں پھر شروع سے کوشش کرنی پڑے گی۔ ایسا معلوم ہو گا کہ گویا ہم ایک عمیق غار میں ہیں، جس کی تمام دیواریں چکنی اور پھسلنی ہیں، ہم اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پھسل کر نیچے گر رہے ہیں۔ گھڑی گھڑی پڑھ رہے ہیں اور

یا۔ بھیس کر گر رہے ہیں۔ بہر حال ہمت و استقامت کی آخر میں جیت ہوگی اور ہمیں معلوم ہوگا۔
کہ توجہ آیت پر جم رہی ہے۔ اور خدا کی طرف نظر اٹھ رہی ہے اور سکون و اطمینان کی ایک لہر باطن
قلب سے سر اٹھا رہی ہے۔

اس حالت یا مقام پر پہنچنے کے بعد ہماری تمنا صرف یہ ہوگی کہ حق تعالیٰ وہی کریں جس میں ہماری خیر ہو
ماکار خود بسیار گرامی گزاشتیم گرزندہ سازد ارکشدرائے درایے دوست

اور ہماری زبان سے بے اختیار نکلے گا اللہم خیر لی و اخلق لی ولا تکلف لی الی اختیار
رسول کریم نے یہی دعا سکھلائی ہے کہ اللہم لا تکلف لی نفسی طرفہ عین او اقل من
ذک۔ "توئی ہیں ایک لحظہ کے لئے یا اس سے بھی کم عرصہ کے لئے ہمارے اپنے نفس اور اس کی تمناؤں
کے حوالہ نہ کر۔" ہمیں اپنی تمناؤں کی تکمیل کی کوشش کے بجائے اور زندگی کے معاملات کو اپنی رکن
کے مطابق سونارنے کے بجائے رضائے حق کا طالب بن جانا چاہیے۔ احکام شریعت کی رعایت اور
اخلاص و توجہ سچی کا دوام ہی ہماری دولت ہے۔ ع

ایں دامت باش گو دگر هیچ میباش!

تو چوں گوئی دریں میداں بیندیش کچا خواہی رسید از کوشش خویش
برو تسلیم چوں گان شو زمانے مگر یابی ز حال خود نشانے

بہت سے لوگ ایسے ہی نظر آئے جو زندگی کی کسی تکلیف کو دور کرنے کے لئے برسوں درد
و رقت کے ساتھ دعائیں کرتے رہے۔ آخر میں تھک کر اور "سیر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے" کہہ کر
انہوں نے رضا باعطا اختیار کیا۔ فوراً ہی ان کے حالات میں ایک ایسا تغیر پیدا ہوا جو ان کی آرزوؤں
و تمناؤں سے بھی زیادہ بہتر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دعائیں مرضی حق کے مطابق نہ تھیں، اور
انہوں نے کسی قلب کی گہرائیوں سے نہیں کہا تھا۔

رضیت باللہ رباً
نیں اللہ کی ربوبیت سے مانسی ہوں

انہوں نے ربوبیت کے بوجھ کو اپنے ہی مکر و رکازوں پر اٹھالیا تھا اور اپنے کاموں کے خود رب

بن گئے۔ اور جب بالآخر انہوں نے محسوس کیا کہ اس سے تو کام نہیں چلتا اور

من بدست دوست دادم اختیار خویش را

کہہ کر انہوں نے توفیق یا تقضا پر اپنے نفس کو آمادہ کر لیا اور

بگوشہ ام مصلحت خویش بدو گر یکشید و در زندہ کنبر او داند

کہہ کر حضرت کریم سے تقاضا اچھوڑ کر حسن ظن سے کام لینا شروع کر دیا تو ان کی ساری الجھنیں سلجھ

گئیں اسی لئے تو کسی عارف نے کہا تھا کہ

سالک را دو حال باید یکے سوختن بے تکلف، دیگرے ساختن بے تصرف۔ کما قیل

کمال عاشقی پروانہ وارد

کہ چیز از سوختن پروانہ وارد

یعنی نہ کسی سے لڑنا ہے نہ جھگڑنا، میں صرف جانتا ہے، کہ - کائنات کے حوادث یہ میرے

واجب الوجود جل شانہ کے ارادہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے فعل سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ہمد

اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر ان حوادث کو اپنی مراد میں سمجھنا چاہیے، ارادے سے

نذرت حاصل کرنی چاہیے، اگر بندگی ہے تو یہ نسبت ضرور پیدا کرنی چاہیے۔ ورنہ بندگی سے پاؤں نکالتا اور

اپنے مولیٰ جل شانہ سے مقابل کرتا ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے:

مَنْ لَمْ يَرْضَ بِقَضَائِيْ وَلَمْ يَصْبِرْ عَلَيَّ

جو میری قضاء سے راضی نہیں اور میری آواز سے صبر

بَلَاءِيْ فَلْيَطْلُبْ رَبًّا سِوَايَ وَيَخْرُجْ

میں تختِ ستمانی سے

میرے آسمان کے نیچے سے نکل جائے۔

ہماری زندگی ایک روحانی کائنات میں بسر ہو رہی ہے، روحانی قوانین کے یہ زیر تصرف و حکمرانی ہے،

روحانی قوتیں اس کو چلا رہی ہیں! تمام حوادث حق تعالیٰ ہی کے فعل سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں، ہر تجربہ میں

حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر، نظر

ابن کے نقل پر جا کر قلب کو ساکن و مطمئن رکھیں اور لقتِ دید سے عکس و عکسیت سے دور رہیں۔ فہم عالم ہو جائے نفس
 سے جس عالمی کرنے، ہمارے اہلکے کو امانت میں تبدیل کرنے آئے ہیں، ان تخیلوں کا مقصد ہمارے قلب
 سے ساری تخیلوں کو ہٹ کر نامہ تلب ہے، اس کا ذریعہ عاشقِ مشیبا ہے، الا ظاہر میں قناتی کی زبان
 سے ہیں لہذا اگر تلب ہے:

میں ترا تمکین دہم کریاں کنم تاکت اور چشم بخت نہیاں کنم
 لہاں نموش نام کہ مکروہ نہی بلکہ تاگیری و ذوقِ پاشن
 زان حدیث تلخ می گویم ترا تا ز تخیبہا فروشیم ترا
 تو ز تخی پیاں ہمہ پڑتوں شوی پس ز تخیبہا ہمہ بیرون شوی

اس ساری گفتگو کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھ لے کہ ہم اپنے فرائضِ زندگی کی ادا میں جہدِ جہاد
 نہیں کرتے پائیے، تسلل کی زندگی بسر کرنی چاہیے، نہیں، یہاں تسلل حرام ہے، الدطلہ حرام نہیں
 مروانہ ہم اٹھا لیا ہے، زندگی کے تمام فرائض کو حرات و استقلال سے ادا کرنا چاہیے۔

شیر شو شیرانہ ذہم لے شیواں پائے نہ

مرد شو مروانہ پستہ تا سماں یا گوش بگر

یہی مجاہدانہ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ لیکے اسی دوران میں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں کچھ وقت پر
 کچھ مقام تک پہنچنا ہوا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کہ ایسے مل جیں کہ ہم کریں ہی کہ انکار
 تجب غیر طریقہ پر اچھا ہو رہا ہے، صاف طور پر نظر آنے لگتا ہے کہ سن قناتی کا دستِ کرم ہلکی رہی کہ لہا
 ہے، وہ حالت میں ترتیب و تقابلی پیدا کریں ہی، حال تک بھی مٹی تر رہتا جاتا ہے اس حالت میں ہم عقل
 مواش کے پرستاروں سے خطاب چھ کر کے ہیں:

طمانند زلف لیلی بند و کار از عقل جوتوں کن

کعاشق را زیاں ندارد مقالبتِ حقیقتی

قل هو کفر من اصابہ و علیہ و کتافستعکفون من موفی تضلیل تہوین (ک۔)

قرآن اور علاجِ حُزن

بے غلشہمازیستن نازیستن باید آتش در تہ پارسیستن
لیستن اس گونہ تقدیر خودی است از ہمیں تقدیر تعمیر خودی است (اقبال)

ابتلا و یا آزمائش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلا ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزوں کے ہلکے جانے یا فنا کر دیے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول میں مشکلات کے پیدا ہونے سے، غلش سے، درد و غم سے، سنج و الم سے، قلب کے تاریک ہونے سے یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہو خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے، اور ابتلا کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی خشکی ہوتی ہے، حیات کی ریادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص عام رستوں اور راحتوں کا نزول ہوتا ہے اور جو شخص ابتلا سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و ذہنی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور نادانانہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہیں چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہیں چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ

دوام ماز سوزِ نا تمام است چو باہی جز تپش بر ما حرام است
محو سائل کہ در آغوشِ ساحل تپید یک دم در گدِ دوام است (اقبال)

اپنے اس دعوے کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لیے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں، اور کائناتِ فطرتِ انسانی کے چند کلی و جزوی قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔

یک تقیہ داغ می باید کرد!

انسان، احتیاج کا دو سلا م ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقیید ہی سے احتیاج

پیدا ہوتی ہے یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ عاجز مند ہے، فقیر ہے، اور دردمند ہے جیسا
 فقر و احتیاج کا، اور فطری طور پر وہ اس درد کی دعا چاہتا ہے۔

عالم ہمہ در دست دعا میخوابد از خوانِ کرم برگ و لو میخوابد
 کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویش غذا شہ اشتہا میخوابد (سحابی استرآبادی)

اب اس عالم اسبابِ دُمل میں جس کی تشبیہ انبگارہ سے دی جاسکتی ہے، مجاہدہ اور عمل
 ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کیے جاسکتے ہیں، جو اپنی بنیاد و اساس کے طور
 پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل سے علاحدہ ہو کر نافع نہیں
 ہو سکتا، اس لیے ہم انہیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوے
 کی تائید کریں گے۔

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے کہ درد و غم، سوز و الم اس کی
 ماہیت میں داخل ہیں، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان
 ہے کہ کائنات کا مہد حق تعالیٰ ہیں جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہیں، وہی اس کائنات
 پر حکمراں ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت انہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہذا یہ کائنات منظر ہے خیر و
 حکمت کا، پھر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اور ہر زندگی میں انسان جو چلتا
 رہتا ہے، اس میں کوئی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا نمایاں پہلو ہے؟ ان ہی واقفانِ راز کا بیان
 ہے، کہ اہل ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے۔ اس کی توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش
 کی جاسکتی ہے۔

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے، جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا نیا نیا خلاق اور ان
 سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآن حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے:-

مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا
 كَسَبْتُمْ أَيْدِيَكُمْ وَيَقُولُوا عَنْ
 كَيْفِ بَدَأْتُمْ كَامُوا مِنْهُ لَوْ رَدُّوا عَنْهُ لَفَئِدُوا فِي أَرْضٍ مَعَكُم بِأَعْيُنِنَا وَسَوْفَ لَكُمْ مِنْهَا حِسَابٌ مُبِينٌ

تم کو جو کچھ مصیبت پہنچی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں
 کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو

کثیر۔ (۵۶۲۵۷) درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

أَوْلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ
بِمِثْلِهَا قُلْتُمْ أَلَيْ هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ
عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ۗ
اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس سے دو
چند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی، آپ فرمادیں
کہ یہ تکلیف تم کو تمہاری طرف سے پہنچی۔

صاحب کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ انشاء ہی باعث الکتف ترد
علیکم، یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹاٹے جاتے ہیں، قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کر کے حکماء
و صوفیاء اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ

إن جمیع الوجود یقابلكم بحسب ما برز منکم من الاعمال فانظروا کیف تکتونون

فإن الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامة (شیخ ابوالنجاہ)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسا ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے، اس لیے ذرا اپنے اعمال پر
نظر رکھنا، کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی
ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہوگا جس نے توقع کی ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا
ہو تو اس نے مجال کی تمنا کی۔ من طلب استقامة الظل مع عوج الشاخص فقد ساء

المحال۔ اس لیے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھٹے جا رہا ہے نتیجہ
ہے تمہارے ہی اعمال بدکا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ
تکلیف سے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے، تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت
کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے
کہ فوراً یاد نہ آئے، لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز
تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائیگا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ پکار

لہ انشاء اعمالکم احصیہا علیکم فمن وجد خیراً فبحمد اللہ من وجد غیراً فلا یلو من الا

سے کام لیا جائے اور دیانتِ فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے کہ اللہم علی لا علیہم سلامت تمہارے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن میری ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں ۶

زادہ طبع من اند آنا نکه خصمان من اند (خاقانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگیگا کہ اعدیٰ حداک تفساک التي بین جنبیک تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے ذہنوں پہلوؤں میں ہے! دردِ عالم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے، یہاں کہ نسبتاً فوق تفریحیہ جو مصیبت و آفت، درد و غم، گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے کہ انسان نزولِ بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بیکس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جنوع و فرع کرتا ہے، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، مقامِ شکوئیٰ میں داخل ہو جاتا ہے، اور مقامِ صبر سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہام باطل سے تحلیل کرے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف چلے، ظلمتوں سے نکل جائے، غم و الم کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائیں گی، اور راحت و مسرت کا انداز اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگیگا۔

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں ان کا وجود اس پر اسرارِ کائنات میں بے معنی نہیں، بشرِ محض نہیں، یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لیجانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و مہاسی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں

لہ قول شیخ اکبر۔ تیرے ہاتھوں نے کمایا، اور تیرے منہ نے پھونکا،

کہو کہ یہ خام کو نچتہ بنانے کے لیے ضروری ہیں، اقبل لے اسی مفہوم کو یوں لدا کیا ہے
 جہانِ ما کر جز انکارہ نیست ایسا انقلاب صبح و شام است
 ز سوانِ قضا ہوا رگرو ہنوز ایں پیکر گلِ ناتمام است
 سوانِ قضا پیکرِ خاکی کے قصص و تحدید کو، کجی و خامی کو غم و الم کے انکار سے دور کرتا
 جاتا ہے، اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لیتا ہے!

(۲) بعض دفعہ دردِ الم، سوز و غم، مہاسی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں مانتے کیے جاتے،
 مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکفیر و تہیص ہوتی ہے، شہوتوں اور لذتوں
 کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، لواہر الہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے،
 درد و غم، سوز و الم نفس سے غلطیوں کو دفع کرتے ہیں، مردہ قلب کو چلاتے جگاتے ہیں، حق تعالیٰ کی
 طرف اس کا رخ پھیرتے ہیں، جو نورِ مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رخ کر کے نورانی ہو جاتا ہے، اور
 گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا، ہر میل
 و خار ہو جاتا ہے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان
 سے جڑ جاتا ہے، ارتباط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ موثر تطہیر کے لیے کوئی اور شے نہیں ملو رہا
 آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر۔

اللہ بلکے دوست تطہیر شام است (۱۷)

اسی مقصود کو پیش نظر رکھ کر طائفہ روم درد و غم قبض سے رنجیدہ دہونے کی تاکید فرماتے ہیں،
 اس کو سالک کے لیے مفید قرار دیتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو درت بسطیں تازہ باش دہیں مہنگن بوسیں

چونکہ قبضے آیت لے ماہ رو حق صلح است آیس دل مشو

اس خیال سے صوفیائے کرام نے بلا و مصیبت کو حق کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے
 آلامِ محبوب بازا انعامِ محبوب، بلا ہی عطا ہے، اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است و

از عطا المبدن خطاست

کے زائر تو بیزار شود جان حسین زخم چوں از تورسد باہمہ آزار خوشم
 بلا غم حیب تکفیر و تمحیص کے لیے آتے ہیں تو اس کی صفات علامت یہی ہے کہ مبتلی جہنم و فزع
 نہیں کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور ہمسایوں کے سامنے اپنی مصیبت پیش
 کر کے شکوئی و شکایت نہیں کرتا، صبر کر کے بے حساب اجر کا امیدوار رہتا ہے۔

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لیے بھی نہیں آتی بلکہ ارتفاع درجہ
 اور بلوغ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے، جنہوں
 نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصفی ہیں، جن میں ربط بحق قائم ہے، دیکھا
 جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، چنانچہ 'الْبَلَاءُ لِلْوَالِدِ' لادوستوں کے لیے
 ہوتی ہے، مشہور خاص و عام بھی ہے، اس قانون کو رازدان حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں
 بیان فرمایا ہے۔ اذ احب اللہ عبداً ابتلاہ فان صبرا اجتباہ وان رضی اصطفاه یعنی
 جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے
 تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں، اور اگر راضی ہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لیے حضرت
 معروفؑ فرمایا کرتے تھے:-

لیس بصادق فی دعواہ من لہ جولنے مولا کی بار سے لذت نہیں لیتا وہ سچا غلام

یتلذذ بضر ب مولاہ۔ ہی نہیں!

اس مضموم کو کسی عاشق نے ان سریلے نظموں میں اد کیا ہے:-

جاں بلب آمد ز درد کردم از درد و اطلب گفت اگر تو عاشقی صبر کن در رضا طلب

یار سے کہ ہر سرت تیغ زند تو دم مزین سرفیاضے یار کن ہیج نہ خون بہا طلب

محب سے مراد یار شوتا شوتا شود او بجا کام تو!

قابل التفات نیست عاشق مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضات و قابلیت کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ منازلِ عالیہ تک رسائی کے لیے درد و غم لابدی و لازمی ہے تعقید جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، درد و الم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیت کیا ہے، نفس کی تحدیدات سے رہائی پر ذمہ اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہیں، صفاتِ حسد کا پیدا کرنا مشقتوں کا برداشت کرنا ہی، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسد پیدا ہو جاتے ہیں تو انسان ترفع محسوس کرنے لگتا اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد و غم کو وہ فطرۃً نکرہ سمجھتا ہے، لیکن تنایع سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے کہ

عَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَنَحْنُ نَجْعَلُ اللَّهُ بِمَعْرِفَتِهِ خَيْرًا كَثِيرًا
اس میں خیر کثیر رکھی ہو،

اولیاء پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لیے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ انہیں اپنا قرب عطا کرتے ہیں، فقر و نیستی میں انہیں مبتلا کرتے ہیں، درد و حزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کنوز من کنوز الحجۃ لا یصلی الاباء ولیاۃ۔
عشاق ملا کی اہمیت و قیمت سے واقف ہوتے ہیں مستانہ دار وہ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ:

دردیکہ زنت بیشتر می باید درد کہ زنت بیشتر می باید
تلخ است عجب لیکے خوشگوار است ہر چند ہی خورم دگر می باید
کبھی وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ

بفقر و نیستی یک دور دورہ خوش می باش

کہ یار خود ز کرم ہندر خواہ ما میگرد

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر ہر وقتے جانوں

کی وجہ سے ہی، تن اگر تکلیف میں ہو، لیکن جان جاناں کے مراوے کے مطابق ہو اور اس کے جمال سے
کیف لذوز، تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت! اسی لیے بلا میں یہ عوام کا لانعام کے خلاف:
(۱) کسی غیر کے آگے شاکہ نہیں ہوتے، اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے
کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ **إِنَّهُمْ لَنْ يَغْنَوْا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا**۔

تم کشاں محبت دم از فغاں بستند گره ز جبہ کشادند و بر نیاں بستند
(۲) اپنے باطن میں اہتمام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمت بالغہ میں انہیں کوئی
شک نہیں ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہیں۔

بادرد بسازہں دوائے توئم در کس منکر کہ آشنکے توئم
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی شکرانہ بدہ کہ خوں بہا توئم

(۳) انہیں یقین کامل ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لیے اختیار کی وہی ان
کے لیے دین و دنیا میں اچھی ہے۔ ۶

صلاح ماہم آفت کاں تراست صلاح

”حدیث الولی“ میں اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس
کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ
تو نگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہیں کر سکتی، اگر میں اس کو فقیر کر دوں تو یہ
فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا
کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اس کو غنی کر دوں تو غنا اس کے ایمان کو فاسد کر دے
اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی
اگر میں اس کو بیمار کر دوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے
کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اس کو تندرست
رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے، مجھے اپنے بندوں کے احوال سے

پوری آگاہی ہے، اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں۔
 حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسن تدبیر، قضا و اختیار
 سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں، اور ہر حال میں رضا بالعطارد اور حقیقاً حال "ضروری سمجھتے
 ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ۶

ہر چاند دوست میرسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہیں، اسی لیے گو وہ طبعی غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن عقلی سرفرد
 سے ان کے قلب خالی نہیں ہوتے! یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "صندوں کی جمیع کا یہ منہ"
 ان ہی کو آتا ہے! رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ۶ عالم ہمہ درداست و دوامی خواہد
 یہ مدد دیا تو گناہوں اور بد کرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لیے وارد ہوتا ہے، یا رفع
 درجات کے واسطے فائدہ کیا جاتا ہے، ہر حال

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ رَہا ۴۰۶ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔

کے کلی قانون کا کوئی استثناء نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ، غم و اندوہ
 میں گزرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بقیار کے ماتہ ہے، جس کی آہستہ
 ہی میں پہنچتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے۔

چہ پرسی از کجا ہم چہستم من؟ بخود عیبہ ام تا زہیستم من

دریں دریا چو موج بیسترام اگر بخود زہیستم من

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا وہ درد و غم، سوز و الم ہے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت
 کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوت حیات کی توفیر ہے، اسی مقصد کو پیش
 نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس
 کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ کر

عارفِ رومی نے فرمایا تھا۔

چوں بدانتی کہ نعلِ کبیتی
 فارغی گرمی و گر زبستی
 قطرہ نوری سراپا نور باش
 بگذر از غم دامنِ مسرور باش

فانهم و تدابرا



زندگی میں غم کیوں ہٹے

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بارہویں اجلاس منعقد

میں پڑھا گیا تھا۔

اگر غم زاچو آتش دود بوسے جہاں تار یک بوسے جاودانہ

دیں گیتی سراسر گرہ گردی خرد مندے نیابی شادمانہ (شہید بلخی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سر تا پا احتیاج ہے، لہذا انسان غم کا پتلا ہے۔ لَقَدْ

خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ۔ رفع احتیاج ہی کے لیے وہ شب و روز حیران و سرگرداں رہتا

ہے، تمام اسباب و علل کو کام میں لائے، درد کی دوا چاہتا ہے، احتیاج کا سلسلہ لاتنا ہی

ہوتا ہے۔ ایک احتیاج کی تسفی ہوتی ہے، تو دوس دوسری پیدا ہو جاتی ہیں ماد و غم والم برابر

جاری رہتا ہے، لہذا کلیتہ یہ قرار پاتا ہے :-

عالم ہمہ دردست و دوا میخواید از خوان کرم برگ نوا میخواید

کس بے حاجت نمی تواند دل درویش غذا شہ اشتہا میخواید رسائی استرابی

اس کلیتہ کا استشاد الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ جس کسی سے پوچھے ”میان دل و صپیت“

جواب ملے گا، ”دردن سینہ سوزے وقفے؟ اگر پوچھا جائے ”تن و صپیت“ کہیگا، ”غم ورنج“

و بلا را ہدفے“ کسی اور سوال کا انتظار کیے بغیر خود کہہ اٹھیگا، القصد بہ قصد جاں مابتنہ صغے

مرگ از طرفے و زندگی از طرفے۔

دل و صپیت؟ دردن سینہ سوزے وقفے تن و صپیت؟ غم ورنج و بلا را ہدفے

لے معارف میں جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

القصد بہ قصد جان مابستہ سے مرگ از طرفے و زندگی از طرفے (ومن ہدی)
 مرضِ غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کلمہ بھی مستلزم ہے، کہ ہر مرض
 کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہے، کچھ دیر کے لیے آپ میرے ساتھ
 چند نسخوں پر غور کیجیے، ایک زمانہ سے میں نے ان کا اپنی ذات کے لیے اور دوسروں کے
 لیے بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، میں پورا نہ نصیحت کے لیے نہیں کھڑا ہوں چند
 اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقل روشن کو متوجہ کر دوں گا، اگر یہ اصول آپ کی سمجھ میں
 آجائیں اور آپ ان کے استعمال پر راضی ہو جائیں تو شفا یابی یقین ورنہ تفسیح اوقات کی موافق
 کا خواستگار ہوں غم کا حتمی و یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہے، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات کے
 ہوتی ہے۔ اس علاج کے مختلف اجزاء ہیں، پہلا جزو:

(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین: اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں (اور اسی صورت
 میں میرا آپ سے ردے خطاب ہے) تو آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ خدا ہم خیر ہے، خیر مطلق ہے،
 خیر محض ہے، نیز وہ ہم تو اسے یا قادر مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے کہ ہر شے کا صدور خدا سے
 ہوتا ہے، زندگی کا صدور خدا ہے، اس لیے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے، اگر خدا
 اللہ خدا خیر محض نہ ہوتا تو اس سے شر کا صدور ممکن تھا یا اگر خیر مطلق ہونے کے باوجود قادر
 مطلق نہ ہوتا تو سمجھا جاسکتا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے میں مجبور ہے، لیکن خدا کو خیر مطلق و قادر
 مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے، نہ نقل کے، بتائے
 مقدمات کے صحیح مانتے کے بعد منطقی نتیجے سے گریز کیسے ممکن ہے؟ اور مقدمات کی توثیق
 مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے، لہذا

ہر چینی محض خیر و حکمت است گرترا ز درجہ رحمت و گرترا رحمت است

زانکہ نایدعیل باطل از حکیم فعل حق باطل نباشد اے سلیم

یہ دلیل تو میں نے اہل عقل کے لیے دی ہے، اہل عشق جن کی صفت "یومنون بالغیب" ہے

مبداء کائنات کو خیر محض ملتے ہیں، اس کے گرویدہ ہوتے ہیں (أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ) اور زندگی کے خیر ہونے کا انہیں راسخ یقین ہوتا ہے۔ علاج غم کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کریں کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے۔ زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتیجے میں اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی "اشدستی" و خود گزینی کی وجہ سے آپ بیک وقت جنت قنوطیت، یا اس، غم ماندہ کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے! اس معاملہ میں "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لیے ریخ و الم میں گرفتار رکھیں گی، اقبال کی تہدید بھول نہ جائیے!

سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار غلامی سے تر ہے بے یقینی
جب ہم یقین کر لیں کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہیں، اور ہمیں ان سے خوشی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور پھر خوشی کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافقی پیدا ہو جاتا ہے، اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہیں، شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے، مذہبی زندگی کے تجربات کا جو میں آپ پر فاش کر رہا ہوں!

یہ محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے، بلکہ مسلمہ نفسیاتی اصول پر اس کی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار میں تغیر پیدا کرتے ہیں، قنوط و یاس خوف و حزن پیدا کرتے ہیں، اور یہ وہ سلبی جذبات ہیں جو قوتِ عملی کو مغنوج بناتے ہیں، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہوں تو سیرت اور قسمت کے پیرو ہونے میں بالی کیا رہتا ہے، کیونکہ نفس کا یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقاصد عمل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اعمال عادات کا یقین کرتے ہیں، عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے اور سیرت ہی تو قسمت ہے، انسان کی زندگی میں وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے جب اس کو اس امر کی یافت

ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنلے اور بگاڑنے والا ہے اس کی ذات ہی میں اس کے آلام کے اسباب پنہاں ہیں اور وہیں راحت و شادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے! آقا کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھہرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بے وقوفی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اس کی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے اور خدا ظالم بن کر لائق عبادت کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو لائق عبادت و استعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے، اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑیگی، اور اسی کو تمام مصائب و آلام کا مبدی قرار دینا پڑیگا **مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ**۔

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد تم جرات کے ساتھ یقین کر لو کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی اور اس کے واقعات و تجربات اچھے، نقص، کجی، یا شر کم ہیں، تو تمہاری ہی ذات میں ہے، مصائب کے نزول کے وقت قضا، و قدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالفضل سے کام لو، اس احساس کو قلب میں نہ آنے دو کہ تم پر ظلم ہو رہا ہے، اور تم قابلِ رحم ہو، کیونکہ اس احساس کے ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگو گے، اور اپنے کو بے خطا و بے قصور قرار دو گے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے! اپنی ذات کو بے خطا و بے قصور سمجھنا جب کہ وہی تمام سور کا مبدی ہو، کس قدر عظیم الشان مخالطہ ہے، ایسی صورت میں کیا اصلاح نفس کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ کیا ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند نہیں ہو جاتا؟ جو شخص اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو، اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو۔ اپنی ہی تقدیر کی شکایت میں ہمیشہ مصروف رہتا ہو، اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے کہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جائے تاکہ اس کو بھی نجات ملے اور دنیا بھی خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔ اقبال ایسے ہی بد بخت سے مخاطب

ہو کر کہتا ہے :

جام تو فریادی بیدار تنگ	اے زبور چرخ ناہنجار تنگ
سینہ کو بہلے پیہم تاکجا	نالہ و فریاد و ماتم تاکجا
لذتِ تخلیق قانونِ حیات	در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
شعلہ در بر کنِ غلیلِ آوازہ شو	خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو
ہست در میدانِ سپر انداختن	با جہانِ نامساعد ساختن
می شود جنگِ آزما با آسمان	گرد سازد با مزاجِ او جہان
میدہ ترکیبِ نو ذرات را	بر کند بنیادِ موجودات را
روزگارِ نو کہ باشد سازگار	میکند از قوتِ خود آشکار
ہمچو مردانِ عالمِ سپونِ زندگی است	در جہانِ نتوانِ گر مردانہ زینت

یقین کی اساس قائم ہونے کے بعد عمل کی مشید عمارت اٹھائی جانی چاہیے، اب تک ہم نے اس امر پر زور دیا کہ یقین درست کرنا چاہیے، یقین کہ زندگی اچھی چیز ہے، اور زندگی کے واقعات و تجربات اچھے ہیں، ان کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا، اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جس کو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جاسکتا ہے۔

(۲) عمل، سببِ غمِ احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو، اور ساری احتیاجات کو رفع کر سکے، عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی صورت میں غم و اندوہ سے متاثر نہ ہونے کا بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؟ بات بڑی آسان ہوتی اگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہو جاتیں، اور وہ محض عینِ حیات کی زندگی بسر کر سکتا، عمل کے دوسرے نتائج ہو سکتے ہیں کامیابی یا ناکامیابی، عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دنیا اپنا سر جھکا تی ہے، مجاہدِ خطرہ ہی کی زندگی کو حقیقی معنی میں زندگی سمجھنا ہے، اگر خواہی حیات اندر خطر زنی۔ ناکامی سے یہ مایوس ہو

نالہ و فریاد، سینہ کو بی اور ماتم نہیں کرتا، کیوں؟ اس کے چند یقینات و عقائد ہیں ان ہی کی تحلیل سے علاجِ غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائیگی۔

جہادِ زندگی کو جہادِ اکبر سمجھتا ہے، دشمنوں سے جنگ اور میدانِ کارزار کا جلال و قتال اس کے نزدیک جہادِ اصغر ہے۔ اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوگا اور باطل کو شکست ہوگی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لیے جہاد کرتا ہے اس لیے اس کو یقین ہے کہ خدا سے نصرت و تائید کا پانا اس کا حق ہے۔ **كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ** اس وعدہ اور یقین کی وجہ سے "احساس کمتری" یک لخت اس سے مفقود ہو جاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابلِ مدافعت قوت کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام حول و قوت من اللہ ہے، الاحول و لا قوۃ الا باللہ! وہ صرف اللہ ہی کو قائل اور موثر حقیقی سمجھتا ہے، اور خود کو امین و خلیفہ، قوت و اثر و حرکت میں وہ اللہ ہی کے استعانت کرتا ہے، اور اسی کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتا ہے، ذل و افتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت و استعانت میں وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے، اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، یعنی از مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے، اور زبان کے سامنے سر نیاز جھکا کر کہتی با اللہ و کیلا اس کا ماٹ ہے، فاتخذ وہ و کیلا اس کا اصولِ عمل **قُلِ اللّٰهُ كَرَّمَ ذَرْهُمُ اس** کا طریقہ کار جسبی اللہ اس کا راحتِ جان کلمہ، ایک لفظ میں وہ موصد ہوتا ہے، اور لا الہ الا اللہ کا قائل و مصدق و عامل۔

اس یقین و عقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں، کامیابی یا ناکامیابی، کامیابی میں وہ شکر کرتا ہے، کیونکہ وہ اس مانے سے واقف ہے جو ایک مسلم تقیاتی اصول پر مبنی ہے کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قوتِ عمل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور تسخیر کائنات آسان ہو جاتی ہے۔ **لَئِنْ شَكَرْتُمْ** اگر زیندہ نگہ کا قطعی وعدہ اس کو سرور دیتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے

اور خلق کی طرف اس کی نسبت نہیں کرتا، گو خلق ہی کے ہاتھ سے نعمت ملتی ہے، لیکن محض بمنزل اسباب و آلات و ادواتِ نعمت ہوتے ہیں، قائم و مجری و موجد و فاعل و مسبب صرف اللہ ہی ہوتا ہے، اس لیے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمہیں تمہارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے تو تمہاری نظر اس خادم کی طرف نہیں جاتی جو یہ ہدیہ تمہارے یہاں لے کر آیا ہے، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گزار ہوتے ہو، جس لے تمہیں یہ بھیجے منعم حقیقی اللہ ہے العاطی اللہ۔ وَمَا يَكْفُرُ مِنْ تِعْمَةٍ فَمِنْ اللَّهِ اس ادراک سے نعمتِ زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہے، جس کو بصیرت محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس راز کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے :

النعمۃ وحشی فقید ما بالشکر نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کا بازو۔
تفسیر ہے باری تعالیٰ کے اس قول کی کہ لَنْ شَكَرْتُمْ اَنْزِلْنَا نَكْرًا۔

موجد جب اپنی جدوجہد میں ناکام ہوتا ہے تو یاس و حزن، خوف و الم کا شکار نہیں ہو جاتا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے واقف ہوتا ہے جو دفعِ غم کے لیے اکسیر ہے، اور جس کو بصیرت محمدیہ نے دریافت کیا ہے، وہ کیا ہے؟ یہی کہ بلاؤں پر صبر کرنے سے بلائیں نعمتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، ذرا انفیاتی نقطہ نظر سے اس قانون پر غور کرو، مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کوئی اور پہلو ذہن اختیار بھی کر سکتا ہے؟ حزن و یاس سے تو اسے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں، مصیبت کے مقابلے اور برداشت کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تردد و فکر بھی عمل کے قائل ہیں، تشنت اور پریشانی کو بڑھاتے ہیں، نگہ و شکوہ تو نامردی کی صریح علامت ہے، تکلیفیت استہزادہ استخفافِ غم کی دار و انیس، بلاؤں کے نزول کے وقت جب انسان حق تعالیٰ کی گزشتہ عطاؤں کو یاد کر کے صبر کر لیتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت کر لیتے ہیں، مستغنی کر دیتے ہیں، اب بارِ غم سبک ہو جاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ انہی بلاؤں میں عطاؤں کو پاتا ہے۔

خود بلا و ابتلا کی ماہیت کے متعلق مجاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، یہ ہمارے کسی نہ کسی نقص کو رفع کرتی ہے، اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے اور درجات میں ترقی دیتی ہے، یہ بظاہر شر ہے، لیکن دراصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعاتِ زندگی کے ذریعہ معلوم حقیقی ہیں ہر فرد سبق دے رہا ہے، اگر ہم میں عقل ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی میں ایک حکمت ہے اور ایک خاص عظمت، سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دنیا کی کوئی اور شے ہمیں نہ یہ درسِ حکمت دے سکتی ہے اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کر سکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے ایک اہم سبق سکھاتی ہے، اگر تم اس کی تحقیق کرو اور جو شخص کہ اس شے میں جو بظاہر ہضم معلوم ہوتی ہے، خیر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ واقعات کا محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کے لیے ایک صبارِ فنا مرکب ہے جو اس کو بہترین کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

بلا کی شدت اگر کہتیں بالکل ہی مغلوب کر لے، اور اس کے خیر اور فائدہ کے جزر سے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھے تو پھر ہمیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملیگا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی کریگا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومن صابر کے حق میں وارد ہوتی ہیں، اگر تم میں ایمان ہے اور ایمان کا ذوق بھی موجود ہے، تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہو جائیگا، صابرِ خدا کا محبوب ہوتا ہے **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ**۔ درد مند صابرِ خدا کی محبت کا ادراک کرتا ہے، کیونکہ **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ**، اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد و غم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چھین کو کم کر دیتا ہے، اور دماغ پر لحظہ **رَبِّكَ يَا غَيْثِنَا** کا حکم اور بشارت تو اس کو نقص میں لے آنے کے لیے کافی ہے! مشورہ ہے کہ کسی عاشق پر سربازِ ارمانوں نازیبا لے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی، جب سوائے تازیبا لگا، تو اس نے آہ کرنی شروع کی، پوچھا گیا کہ اس آخری تازیبا نے پرآہ و بکا کیسی؟ کہا جس کے

سب مار کھائی ہے، وہ ننانوے بازیانوں تک یہاں نماشاہیوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لیے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اس وقت میں نے درد محسوس کیا! ۷

بازد بسا زچوں دولے تو منم در کس سنگر آشنکے تو منم
گر ہر سر کوئے عشق باکشتہ شوی شکرانہ بدہ کہ خون بہا تو منم (جامی)
صبر پر استقامت پیدا ہو جائے تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر محسوس کرنے لگتا ہے، کہ بلا از دست عطا است و از عطا نالیدن خطا ست، البلاء کنز من کنوز الجنة لا یعطی الا باولیائہ کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب نہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے، اور نہ جزع و فرح کا،

ستم کشان محبت دم از قفاں بستند گرہ رجبہ کشادند بر زباں بستند
سچ ہے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تقویٰ ہے اس کے سوا کچھ نہیں ۷
تسلیم نمی شوی از اں غم گینی تسلیم شو ہر آنچه آید پشت
رضا با عطا اور حفظِ حال سے نہ صرف غم ہی دور ہو جاتا ہے اور فرح و سرور کے درونے کھل جاتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ بھی قطعی راضی ہو جاتے ہیں، اور جانتے ہو کہ ان کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے!

آنا کہ رضا حق بجاں میجویند در را و رضا کے ادب سر می پویند
ہر یک ہم آں کند کہ حق فرماید حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند
قال علیہ السلام ان الله رجلا یرضی برضاہم و یغضب بغضبہم کما انہم یرضوا برضاہم و یغضبوا بغضبہم

ہر چہ خواہی آن کند گر ہر چہ خواہد آن کنی
انچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

اے درد تو بھی کیا نعمت ہے، تیری برداشت نے مجھے کیسے کیا کر دیا!

دردہ قدح درد کہ آن می باید

دردیکہ زتست بیشتر می باید

تخت عجب لیک بر خوش خوار است

هر چند ہی خورم دگر می باید

قرآن اور علاجِ غضب

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۶۲ء میں پڑھا گیا۔

تا بتوانی خستہ گرداں کس را بر آتشِ خشمِ نوشِ مستان کس را
گراحتِ جاوداں طمعِ میداری می رنجِ ہمیشہ و مرغباں کس را (عطار)

انسان کی مادی مردوہائی ترقی میں جوشے سب سے زیادہ مانع و مزاحم نظر آتی ہے وہ جذبہ غضب ہے! اس آتشِ فشاں جذبہ کے اشتعال کے وقت انسان انسان نظر نہیں آتا، بلکہ وہ ایک ہیپ غار کا منظر پیش کرتا ہے جو دفانی آگ سے پڑے، جس میں سوائے خوفناک آوازوں اور جاں سوز چنگاریوں کے کچھ نہیں نکلتا، اسی لیے اہل غضب پناہ سب شیطان سے ملاتے ہیں کیونکہ اسی نے تو کہا تھا کہ **خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ**۔

ترا با چیں تندی و سگرشی نہ پندارم از خاک از آتشی!

ایک غضبناک شخص کو اعصابی تناؤ کی حالت میں دیکھ کر حضرت حسنؑ نے خوب فرمایا تھا کہ اے شخص! غضب میں اتنا اچھلتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اب کی اچھال میں تو دوزخ میں جا پڑیگا۔ اس قابلِ نفرت جذبہ کے تسلط کے وقت انسان کی صورت پاگل یا درندہ کی سی ہو جاتی ہے، دماغ اور اعصاب سیاہ دھانیاں سے بھر جاتے ہیں، نورِ عقل تاریک ہو جاتا ہے، خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے، دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس تاریکی میں اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی دوستی اور محبت کے پاک رشتے، قرابت اور رحم کے مقدس نارِ عزت و حرمت کے قیمتی روابط ایک ہی ضرب میں پاش پاش کر دیے جاتے ہیں،

تندرست و خاد دنیا میں کوئی دوست نہیں، پاگل اور مجنون کا کوئی دوست کیسے ہو سکتا ہے، اس کی قسمت میں سوزش و تپش لکھی ہوتی ہے، اسی سوز و غم کی وجہ سے وہ اطمینانِ قلب اور طمانیتِ خاطر سے محروم ہوتا ہے، اور جب قلب مطمئن نہ ہو تو بدن کیسے تندرست رہ سکتا ہے، اس جہانِ فانی میں شادمان زندگی کے نسخے کے یہی دو اجزاء تو ہیں، صبح و تندرست بدن اور مطمئن و آزاد ذہن تندرست و خوشحال دونوں سے محروم! اس کی سیاہ بختی و سیاہ رودنی میں کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے، اب سوز و تپش، غم و ہم، رنج و حزن کے سوا اس کے ہاں ذخیرہ کس چیز کا ہوتا ہے؟

سوز و تپش بقسمت ہر تندرست و خوشبود برق از زبانِ حال مراجعت جتہ گفت
 غرض غضب کا جذبہ ہر بڑائی کی کنجی ہے، (حضرت جعفر صادقؑ) پو تو فی کی جڑ ہے، مسرت و شادمانی کا قاتل ہے، ایمان سوز ہے، اور طمانیت کش، اسی لیے جب بنی نوع انسان کے عمن اعظم آنحضرت صلعم (فداہ ابی وامی) سے کسی نے درخواست کی کہ مجھے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے ذرا ساعل بتلاہ کیجیے، تو آپ نے فرمایا لا تغضب یعنی تو غصہ نہ کر، جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو یہی جواب دیا گیا، اور تیسرے مرتبہ کے سوال کا بھی یہی جواب ملا، کسی دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کسی گھونٹ کا پینا اس قدر محبوب نہیں جس قدر کہ پی جانا غصہ کا۔
 قرآن کریم نے الکَاظِمِیْنَ الْعَظِیْمِیْنَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ کی تعریف کی ہے، اور ان کے اتباع کی تحریص و تاکید۔

کیا اس خوشخوار جانناں جذبہ سے نجات ممکن ہے؟ علمائے نفسیات کا کیا خیال ہے؟
 قرآن کریم نے کیا طریقے تعلیم کیے ہیں؟ کیا علم کی تصحیح عمل میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ریاضت و مجاہدہ غصہ کو محو کر سکتا ہے؟ انہی چند اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے
 ہشدار کہ وہ خود بخود گم نہ کنسی؟

سقراط نے ایک ازلی صداقت کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا تھا کہ نیک علم ہے "یعنی علم صحیح ہی سے نیک عمل پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ علم زبان ہی کی حد تک محدود نہ رہا ہو، بلکہ قلب میں بھی اترا ہو، تعین کے درجہ تک پہنچا ہو، جو شخص علم کو زبان ہی کی حد تک محدود رکھتا ہے۔ اس کو زبان سنت میں "علم باللسان" اور جاہل بالقلب" کہا گیا ہے، اس کا شمار ان واعظوں میں ہوتا ہے جن کی شکایت حافظ نے اپنی اس مغلود الذکر شعر میں کی ہے:

واعظاں کہیں جلوہ بر محراب منبری کنند

چوں بخلوت میر ونداں کار دیگر می کنند

علم صحیح بہر حال ضروری ہے، اور پھر اس کے مطابق عمل ہو تو فلاح انسان کے ہاتھ چوتی ہے، جذبہ غضب کی تعدیل کے لیے بھی یہ دونوں ضروری ہیں، اس لیے ہم یہاں ان ہی دونوں کے متعلق دو باتیں عرض کرتے ہیں:-

(۱) علم صحیح :- یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسان کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے اور کسی چیز کو مبغوض و مکروہ، وہ محبوب چیز کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے، اور اس کے تحفظ کا خواہاں و متمنی ہوتا ہے، اور مکروہ شے سے بھاگتا ہے، اور اس کو دفع کرنا چاہتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے، وہ اسی پر مجبور ہوا ہے، جب اس کی مخالفت کی جاتی ہے تو اس کو غصہ آتا ہے، بذات خود غصہ بُری چیز نہیں، یہ مدافعت کا آلہ ہے، تحفظ حیات کے لیے ضروری ہے، استمرار نسل کے لیے ناگزیر ہے، تنازع البقا میں اس کا خاص مقام ہے، اس کے بغیر ارتقا میں نسل انسانی کا بقا ممکن نہ تھا جس طرح کائنات خارجی میں عنصر ناری ضروری ہے اس کے عدم سے اختلال رونما ہوتا ہے، اسی طرح فطرت انسانی میں جذبہ غضب بھی ضروری ہے، اس کے فقدان سے تباہی پیدا ہوتی ہے، موت لازم آتی ہے، اب غضب کے تین درجے ہوتے ہیں:-

(۱) تفریط: یعنی کمی، یہ بالاتفاق مذموم ہے، ایسے ہی آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے۔

امام شافعی نے کہا تھا کہ جس شخص کو غصہ دلائے سے بھی غصہ نہ آئے وہ "گدھا پر" حمیت و غصہ کا بالکل نہ ہونا بھی سخت بُرا ہے، اگر کسی شخص کی بیوی اس کے ساتھ خیانت کیے فحش کا ارتکاب کرے، اور وہ علم سے کام لے تو بتاؤ کیا یہ عقلاً، شرعاً و عرفاً سخت مذموم نہیں! غصہ کا صحیح موقع پر استعمال ضروری ہے، حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کی صفت اشدّ علی الکفار قرار دی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جَاهِدِ الْكُفْرَ وَذُنُوبَ الْمُؤْمِنِينَ وَأَغْلَظْ عَلَيْهِمْ، ظاہر ہے کہ شدت و غلظت غضب کے بعد رونما ہوتی ہے، لہذا قہر و لطف اندر محسوس خود نکوست جائے گل گل با شہ بکے خار خار

(۳) افراط: یعنی زیادتی، یہ بھی بالاتفاق مذموم ہے، اسی سے نجات کے طریقوں پر یہاں غور کیا جا رہا ہے، جب غضب عقل و دین کی سیاست و قہرمانی سے نکل جاتا ہے تو انسان درندہ بن جاتا ہے، تمام دنیوی و روحانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے، جنون کا تسلط اس کے دماغ پر ہو جاتا ہے، اہل غضب کی فرست میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے، جن کے متعلق یہ کسنا صحیح ہوتا ہے کہ ۶

سایہ جن میں یہ انسان رہا کرتے ہیں

(۳) اعتدال: یہ درجہ محمود ہے، یہاں انسان کا غصہ عقل کی قہرمانی میں ہوتا ہے، دین کا مطیع ہوتا ہے، اس کے اشارہ کا منتظر ہوتا ہے، جہاں حمیت شرعاً واجب ہوتی ہے وہاں وہ شدت سے کام لیتا ہے، اور جہاں اس کا پنی جانا ضروری ہوتا ہے وہاں وہ حد اعتدال سے نہیں بڑھتا، اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ایسے موقع پر ۶

ہرگز اسلام نیست او چو در دست

ظاہر ہے کہ ہم یہاں غضب کے استیصال کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اس کے اعتدال کی ہم غضب میں افراط و تفریط کو رفع کر کے وسط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، کہ خیر الامور اوسطا رہا۔

دیکھو غصہ کا کوئی معروض ضرور ہوتا ہے، یعنی اس کا تعلق کسی شے سے ہوتا ہے، اب اس معروض کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔

(۱) ایک وہ جو سب کے لیے ضروری اور لازمی ہے جیسے غذا، لباس، مکان، صحت، جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے تو شعلہ غضب ان کے تحفظ کے لیے بھڑک اٹھتا ہے، حفاظت ذات و بقائے نسل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر جاندار اپنے دشمن کا مقابلہ کرے اور ضروریات زندگی کے تحفظ میں شدت و قوت کا استعمال کرے اور نہ وہ صفحہ ہستی ہی سے حریف غلطی کی طرح مٹ جائیگا، اور یہ فطرت کا مقصود نہیں، مجاہدہ اور ریاضت سے اس قسم کے غصہ کو محو کرنا ممکن نہیں، اور نہ ہی اس کی کوشش ہی کرنی چاہیے، کیونکہ یہ خلاف فطرت ہے، اور غیر اختیاری، غیر اختیاری شے پر حکم اخلاقی لگایا نہیں جاسکتا، ہاں یہاں بھی حد اعتدال سے تجاوز، ظلم و ستم ناروا ہے اور تکلفِ حلم و برداشت کرتے کرتے تحمل کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے۔

(۲) غصہ کے معروض کی دوسری قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں، جو بعض کے لیے تو ضروری ہیں، اور بعض کے لیے غیر ضروری جیسے صنّاع کے لیے آلات و اوزار اور عالم کے لیے کتابیں، اگر ان محبوب اشیاء کو نقصان پہنچتا ہے، تو رنج ہوتا ہے، اور نقصان پہنچانے والے پر غصہ آتا ہے اس قسم کے غصہ کا بھی بیخ دین سے استیصال نہیں کیا جاسکتا لیکن مجاہدہ سے غصہ کی شدت باطن میں باقی نہیں رہتی اور صبر کی خو پیدا ہو سکتی ہے، اور سختی صبر کا احساں کم ہو سکتا ہے۔

(۳) غصہ کے معروضات کی تیسری قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں، جو کسی کے لیے بھی ضروری نہیں، جیسے مال و جاہ، خدم و حشم یہ عادت محبوب ہیں، لیکن قطعاً داخل ضرورت نہیں، یعنی ضروریات زندگی میں ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ تعیّناتِ محض میں شامل

۱۔ مقالہ سر احیاء العلوم باب غضب۔

ہوتے ہیں، جو غیظ و غضب ان کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے وہ ریاضت و مجاہدہ سے قطعاً قابل استیصال ہے، ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق اسی قسم سے پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم غصہ کی نفسیات پر غور کر کے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا انبعاث محبوب اشیاء کے فقدان یا ضیاع سے ہوتا ہے، تو ہمیں ایک صداقت کلیہ کا صحیح وجدانی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیظ و غضب کا اصل مبداء "حُب اشیاء" ہے، جس طرح تمام حزن و ملال کا مبداء بھی یہی حُب اشیاء ہے، نیز تمام حقد و جہالت کا بھی مبداء یہی ہے، رفع غضب کے لیے سچ پوچھو تو تبدیل مزاج کی ضرورت ہے، جیسا کہ عارف روم نے فرمایا تھا کہ انسا للتدبیر تبدیل للزاج اس تبدیلی کے لیے تنقیہ دماغ ضروری ہے، جس کا انحصار تزکیہ قلب پر ہے۔ اس کے لیے چند قرآنی اور نفسیاتی حقائق پر تجرید ذہنی کے ساتھ غور کرو، تم مال و دولت کو جو تمہارے قبضہ میں ہے، اپنی ملک سمجھتے ہو، کیونکہ تم اس پر متصرف ہو، اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو، اپنی مرضی سے ذخیرہ کرتے ہو، اپنے مالک ہونے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا، ناگہان تم بیمار ہو جاتے ہو، دولت تمہیں حالتِ صحت میں جان سے زیادہ عزیز تھی، لیکن جب درد کی شدت تمہیں بقرار کرتی ہے، تو مال تمہیں 'ماز' نظر آنے لگتا ہے، تم اضطرار کے ساتھ طبیب کو طلب کرتے ہو، علاج معالجہ پر بے دریغ خرچ کرتے ہو، اسی چیز سے مفارقت گوارا کرتے ہو جو تم کو بہت زیادہ پیاری تھی، اب تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ محبوب شے صحت ہے، یعنی درد و الم سے رہائی، اور سکون و آرام کا حصول، لیکن باوجود تمہاری تمام سعی و کوشش کے تمہیں صحت بدنی اور راحتِ قلبی حاصل نہیں ہوتی، تمہارے طبیب کا نسخہ اثر نہیں دکھلاتا، طبیب کے ابلہ ہونے کا تم کو یقین ہو جاتا ہے، اور تمہیں خون ہوتا ہے کہ یہ کہیں اصل کی پیش قدمی کی علامت نہ ہو، اس سے زیادہ قابل طبیب تمہارے علاج میں مصروف ہوتے ہیں، تیر ہدف نسخوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن تمہارا درد بڑھتا

جانے، اضطراب و اضطراب میں ترقی ہوتی ہے، تمہارا مال تمہاری جاہ و حشمت تمہارے
 خادم و نوکر اپنے تمام ذرائع کا تم استعمال کر رہے ہو، لیکن ان سے تمہیں کوئی فائدہ کوئی
 نفع حاصل نہیں ہو رہا ہے، تم اپنی تکلیف اپنے درد میں کسی قسم کی کمی نہیں پاتے، اب تمہیں
 یاد پڑتا ہے کہ تم نے کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سنا تھا کہ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا
 وَلَا مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا فَتُورًا، الفاظ تمہارے ذہن میں ہیں، معنی کا تمہیں کھلا فہم حاصل نہ
 تھا، وجدان میں ان کا تحقق نہ ہوا تھا، ان کے مصداق سے بے خبر تھے، اب شاید تمہیں پہلی
 دفعہ روشنی نظر آرہی ہے، جہل کی ظلمت دور ہو رہی ہے، اپنی ہی ذات میں معنی کا تحقق ہو رہا
 ہے اور خود کو نہ نفع پر قادر پارہے ہو، اور نہ ضرر کے دفع کی قوت ہی کا تمہیں احساس ہو رہا
 ہے، پھر تم مالک کس شے کے ہو؟ تمہاری مالکیت سے تمہیں کیا فائدہ؟ اپنی محبوب ترین
 جان سے تکلیف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، درد کی شدت میں رتی بھری نہیں کر سکتے، مال
 تمہیں اس لیے محبوب تھا کہ اس سے درد کا ازالہ ہوتا ہے، راحت حاصل ہوتی ہے،
 پھر یہ کیا ماجرا ہے، اس کا اثر کہاں گیا؟ جب مال کے اثرات تمہارے اختیار میں نہیں تو
 ایسے بے اثر مال کو لے کر کیا کرو گے؟ یہ تو محض ایک بارگراں ہے، اس سے تو کمر ٹوٹی ہی
 یہ پھر اتنا عزیز اتنا محبوب کیوں ہو؟ بیچ پوچھو تو یہ تمہاری ملک بھی نہیں، یہ حق تعالیٰ کی
 ملک ہے **لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (پ ۲۸ ۶۲۸ اور وہی اس کے حقیقی مالک
 ہیں۔ **لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا**) (پ ۶) یہ تمہارا مغالطہ تھا کہ تم
 اس کو اپنی ملک سمجھ رہے تھے، اور اپنے کو اس کا مالک جان رہے تھے، بیچ پوچھو تو تمہاری
 کوئی چیز ہی نہیں، تم اپنی ذات کے لحاظ سے فقیر محض ہو، اور حق تعالیٰ ہی غنی و حمید ہیں۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْمُجِيدُ (پ ۶، ۳) حق تعالیٰ نے اپنی
 عنایت اور رحمت سے تمہیں دولت دی، عزت دی، مال و دولت تمہارے پاس امانت
 ہیں، تم امین ہو اس سے زیادہ نہیں، مالک و حاکم حق تعالیٰ ہیں، تمہیں حق امانت کا احساس

ہونا چاہیے، استردادِ امانت کا جب وقت آئے تو تمہیں خوشی کے ساتھ اس کو مالکِ حقیقی کے سپرد کر دینا چاہیے، جانتے ہو استردادِ امانت کے مواقع کونسے ہیں؟ ان کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، لیکن اتنا یاد رکھو کہ جب تمہاری دولت پر آفت آتی ہے، وہ تمہارے ہاتھوں سے چھین لی جاتی ہے، اور تم اس کو بچا نہیں سکتے، اور تمہارے قلب کے تار ٹوٹے جاتے ہیں تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم اپنی ملک سے محروم ہو رہے ہو، تو تمہاری نارِ غضب بھرناک اٹھتی ہے، یہی وقت اس علمِ صحیح کے تھضر کا ہے، کہ تم محض امین ہو، مالک نہیں، مالکِ حقیقی استردادِ امانت چاہ رہا ہے، متاعِ غیر پر تمہارا اختیار نہیں، تمہارا فریضہ ہے کہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ امانت کو حوالہ کر دو، غیظ و غضب کا کوئی موقع نہیں، بلکہ خوشی کا مقام ہے، دیانت دار امانت کے استرداد کے وقت ضیق محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے قلب کو سرور و مسرت ہوتی ہے کہ اس نے اتنا عرصہ امانت کی حفاظت کی، شرائطِ مقررہ کے تحت اس پر متصرف رہا، اور بالآخر وقت مقررہ پر مالکِ حقیقی کے ہاتھ امانت سپرد کر رہا ہے۔

ہاں کیا تم جانتے ہو کہ تم پر ان بلیات کا نزول کیوں ہے؟ تمہارا مال تمہاری دولت آفتوں کا نشانہ کیوں بن رہی ہے اور تم غیظ و غضب کی آگ میں کیوں جوں رہے ہو؟ کیا اس کا بڑا سبب یہی "خیانت فی الامانت" تو نہیں، جہاں تم نے اپنے علم کی تصحیح کی، اپنے گواہین، جانا اور امانت کے تصرف میں خیانت کو ترک کیا، اور شرائطِ معینہ کا خیال رکھا کہ فوراً تمہارے قلب کی حفاظت کر دی جاتی ہے، اب وہ غصہ کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے، اپنے فقر و امانت کا علم ہو جانے کے بعد وہ اپنی حاکمیت کے دہم سے بھی نکل آتا ہے، حاکمِ حقیقی وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتے لگتا ہے، اِن الْحُكْمِ لَا يَلِيكَ اللهُ کا اس کو یقین پیدا ہو جاتا ہے، اپنے حکم کی خلاف ورزی پر اس کو آگ نہیں لگتی، اس کا شعلہ غضب نہیں بھڑک اٹھتا، جب جاہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر جذبہ غضب کا بھی استیصال ہو جاتا ہے، اگر

بچھڑو جہان میں یہ بات کھل جائے کہ میری ذات فقیرِ محض ہے، مالک نہیں ملوک ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، رب نہیں مرہوب ہے، مولیٰ نہیں عبد ہے، ہاں اگر اس حقیقت کا محض عقلی علم نہیں، وجدانی محقق ہو جائے تو اب میری نظر میں غضب کے سارے معروضات فنا ہو جاتے ہیں، مال و جاہ خدم و حشم کا تعلق میری ذات سے باقی نہیں رہتا، فقیر کو ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس ذات کے لوازمات ہیں، جو غنی و حمید ہے جو مولیٰ و رب ہے، جو مالک و حاکم ہے۔

حق تعالیٰ ہی الہ ہیں، لا الہ الا اللہ، وہی معبود ہیں اور مستعان اور ہم سب عبد عبد اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے ذلیل ہے اور فقیر، اس کی نسبت ذل و افتقار حق تعالیٰ ہی سے ہے، کسی غیر سے نہیں، وہ غیر اللہ کی نسبت سے غنی ہے، اور حق تعالیٰ کی نسبت سے فقیر، غنی کا فقیر سارے عالم سے مستغنی ہوتا ہے، جب قلب مومن پر اس توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے، تو وہ ساری دنیا سے اور دنیا کی تمام محبوب و مرغوب چیزوں کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے،

رنت آنکہ بقبیلہ بتاں رو آرم حربِ غمِ شاں بہ لوحِ دل بنگارم
آہنگِ جمالِ جاودانی دارم حسنے کہ نہ جاوداں ازو بیزارم (جامی)

اور تم ادھر یہ دیکھ چکے ہو کہ غیظ و غضب کی اصل و منشا حبِ اشیاءِ فانیہ ہے، لا الہ الا اللہ سے قلب کا تڑکیا اور روح کا تجلیہ ہوا کہ حبِ اشیاءِ فنا ہوتی اور اس حب کے فنا ہوتے ہی غضب کی بھی بیخ کنی ہو گئی!

(۳) مجاہدہ :- اس علم صحیح کے حصول کے بعد اب تمہیں مجاہدہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے، مجاہدہ علم کے قلب میں لغو ذمراہوں کے لیے ضروری ہے، مجاہدہ سے علم کا استقرار ہوتا ہے، تلویں جاتی ہے، تمکین پیدا ہوتی ہے، مجاہدہ ہدایت کے راستوں کو کھولتا ہے، حصول مقصود کا یہی واحد ذریعہ ہے، تمہارے سامنے جو علم صحیح اور پریش کیا گیا ہے، اس پر تدبیر ضروری ہے، تفکر لازمی ہے، فجر کا وقت اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے،

اس وقت اعصاب رات کی استراحت کی وجہ سے تازہ دم ہوتے ہیں، قلب کو سکون ہوتا ہے،
دماغ افکارِ دنیوی سے نسبتاً خالی ہوتا ہے، ایسے وقت تمہیں زندگی کے کاروبار شروع کرنے
سے پہلے اس ازلی وابدی صداقت پر غور کرنا چاہیے، اس کو قلب کی گہرائیوں میں اتارنے
کی کوشش کرنی چاہیے، کہ مالکِ حاکم حق تعالیٰ ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، ہر چیز ان ہی
کی ملک ہے، وہی رب ہیں اور وہی مولیٰ، ہم ان ہی کے فقیر ہیں، انہی کے در کے سائل ہیں،
ہم ہی ہمارے معبود ہیں، وہی مطلوب، وہی محبوب، وہی مقصود ان کو رکھ کر میں کسی چیز کا محتاج
نہیں، میں غنی عن اشیء ہوں، ہر شے سے برتر، مجھ ہی سے ارشاد ہوا ہے،

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ مَالَكُمْ وَبِحَيْزِ تَمَّ جَاتِي لَيْسَ تَمَّ أَسْ بِرِدْخِ نَكْرُو، اور جو
وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ حَيْزِ تَمَّ جَاتِي لَيْسَ تَمَّ أَسْ بِرِدْخِ نَكْرُو۔

(پتہ ۱۱۰)

کیونکہ

عالم بطفیلِ ماست موجود مایم زکائیات مقصود!

جوں جوں تمہارا مراقبہ، تمہارا تفکر و تدبر عمیق ہوتا جائیگا، تمہارا نقطہ نظر بدلتا جائیگا، اور یاد رکھو
کہ نقطہ نظری کے بدلنے سے خودی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور خودی کے انقلاب سے کائنات
کے چار سو بدل جاتے ہیں۔

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیرا

عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے (قبال)

اسی انقلابِ مزاج سے تمہارے قلب سے اشیاءِ فانیہ کی محبت محو ہوتی ہے، اور غصہ کا مٹی ہی
سمار ہو جاتا ہے، جب تک تم نے اپنے کو مالک و حاکم جانا، امانت میں تم نے خیانت کی،
وہیں نہیں غاصب ٹھہرے، غاصب کو جہان کہاں امن و چین لینے دیتا ہے، تم میں اور
کائنات میں توافق نہیں مخالف و تنازع قائم ہو گیا، اب ہر واقعہ تمہارے غصب کو
بھڑکائیگا، جب تم نے اپنا نقطہ نظر بدلا، حق تعالیٰ کو مالک و حاکم جانا اور خود کو اُن کا

مملوک و محکوم، آدابِ امانت سے واقف ہو گئے، تو اب کائنات میں اور تم میں تو افرق پیدا ہو جائیگا۔
اس تو افرق کے بعد انعامِ غضب کا کوئی موقع نہیں پیدا ہو سکتا۔

تسلیم نمی شوی از آن غم گینی تسلیم شو ہرا سچہ آید پیشت!

اسلئے تمہیں دورانِ تفکر میں رضا بالقضا کے اعتبارات پر خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔ دیکھو مدبرِ امر در حقیقت کون ہیں؟ حق تعالیٰ ہیں یدِ بزرگواروں السماء الی الارض، جب وہ مدبر ہیں جب امر و حکم ان ہی کا چل رہا ہے تو ان کی تدبیر کے ساتھ حسنِ رضا درکار ہے نہ کہ عصبہ و غضب! دیکھو حق تعالیٰ کی ذات کامل، ان کے صفات کامل، ان کے افعال کامل اور خود ہی خالق (خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْلَمُونَ) تو اب بات تمہارے ذہن میں جم جانی چاہیے کہ غم ہر جہ از دوست می رسد تیکو است

دیکھو حق تعالیٰ مومن پر رحیم ہیں کَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا، اب اگر تم میں ایمان ہے، اسکی حفاظت تم نے کر لی ہے تو اب ہر واقعہ تمہارے لئے نشانِ رحمت ہی پیش آئیگا گو بصورتِ تہر کیوں نہ نظر آئے کیونکہ حق تعالیٰ تم پر رحیم ہو کر تمہارا نقصان رفا نہیں رکھتے، جب اس صداقت پر تم غور کرو گے اور تمہارے قلب پر وہ مسلط ہو جائیگی، تو بے اختیار تمہاری زبان سے یہ پُرترتم الفاظ نکلنے لگیں گے۔

خواہی ز دصال شاد ماں دار مرا خواہی ز فراق بہ نغساں دار مرا

من باتونہ گویم کہ چساں دار مرا ناساں کدلت خواست چساں دار مرا (خاتم)

یہ مجاہدہ کا انجام ہو گا، لیکن اس غایت کا حصول یکدم نہیں ہوتا، تمہیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے اور بہت و استقلال سے قدم بڑھانے جانا چاہیے۔ کامیابی بالآخر مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے، اور کَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ کا وعدہ اس کے لئے پورا ہو کر رہتا ہے۔

اندیں رہ می تراست و می خراش	تا دم آخر دے فارسِ مباحش
دوست دارد دوست این آشفگی	کوشش بیہودہ بہ از خفتگی
کار کے گن تو و کابلِ مباحش	اندک اندک خاک چہ دای تراش
چوں بر چاہے می گنی ہر روز خاک	عاقبت اندر رسی در آبِ پاک
چوں نشینی بر سر کوئے کسے	عاقبت بینی تو ہم روئے سے

دُعَا كَا فِلَسَفَہ

ہم دُعا: اِذْ تُو اِجَابَتْ ہم نَدُو اِیْمِنِ اِذْ تُو اِجَابَتْ ہم نَدُو
 دُعَا حَقِّ تَعَالٰی سے مانگ ہے اور مانگنا یہ جانتا ہے کہ وہ اپنی قدرتِ مطلقہ کا ہماری
 زندگی میں ظہور فرمائیں! ہمارے ضعف میں اُن کی قوت کا ظہور ہو، ہمارے فقر میں اُن کی غنا و
 کا ظہور ہو، ہماری ذلت میں اُن کی عزت کا ظہور ہو، ہمارے عجز میں اُن کی قدرت کا ظہور ہو،
 اِسی صورت میں یعنی حق تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کے ظہور ہی کی وجہ سے ہماری دعا تصدق یعنی تقاضا
 کو بھی پھیر سکتی ہے اَلَا یُرَدُّ الْقَضَاءُ اِلَّا بِاللّٰهِ عَآءُ (علاء الترمذی) اِسی وجہ سے دعا سے بڑھ کر
 حق تعالیٰ کے یہاں کوئی چیز بزرگ تر نہیں لیس شَیْءٌ اَکْرَمُ عَلٰی اللّٰهِ مِنَ الدَّعَآءِ
 (رداء الترمذی دہنہ) اِسی بنا پر دعا ہر بلا سے بچاتی ہے، خواہ وہ تانل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو
 اِنَّ الدَّعَآءَ یَنْفَعُ حَمَآءًا نُّزُلًا وَهَمَّآ لَمَّا یُنزَلُ اِذْ رَاہِیْ کَ لِعُوْرِ حَضُوْرِ الْوَجُوْدِ صَلٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَمٌ
 فرمایا فَعَلٰی کُمْ عِبَادًا اللّٰہِ بِاللّٰہِ عَآءٍ اِسْلَمٌ لِّعَلَّہُ خَدَاکَ بِنَدُو دُعَا کَرُوْدُ (رداء احمد الترمذی)
 میں اپنے ضعف، فقر، عجز و ذلت کا بد ہی احساس ہے! اس احساس و وجدان کے باوجود
 اگر ہم دعا کے ساتھ قادرِ مطلق ہستی کی طرف نہ اٹھائیں یعنی اس کی قدرت کا اقرار اور اپنے عجز
 کا اعتراف نہ کریں تو یقیناً یہ چیز حق تعالیٰ کے رضا کا باعث نہ ہوگی۔ (رداء الترمذی)
 دُعا ہی زندگی میں جب ہم کسی دوست سے کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم
 اس سے مل کر اپنا کام بتلاتے ہیں اور اس صورت میں ہمارا کام کرنے کی کوشش کرتا ہے، اِسی
 طرح جب ہم حق تعالیٰ سے کچھ عرض کریں تو ہمیں ایک بنیادی صداقت کو مان کر عرض کرنا پڑتا
 ہے اور وہ بنیادی صداقت یہ ہے حق تعالیٰ قَرِیْبٌ ہِیْ، مَحْبُوْبٌ ہِیْ، اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مِّنْ حَبِیْبٍ

(سورہ ہود) وہ ہمارے قریب ہیں اور سن رہے ہیں۔ اِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ (سورہ سبأ) ان کی رحمت ہم پر محیط ہے، قریب ہے اِنَّ رَحْمَةً اِلٰهُ قَرِيبٌ (اعراف)

ایمان کی زندگی کا آغاز اسی وجدان سے ہوتا ہے: اِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ! وہ ہماری رگ

جان سے زیادہ قریب ہیں۔ فَمَنْ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۰، ق ۱۶) دعا کے وقت ہم

کسی بہری اور غائب ہستی کو نہیں پکار رہے ہیں، ہم اس ہستی کو پکار رہے ہیں جو سمیع و بصیر ہے

اور ہم سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمًّا وَلَا غَائِبًا، اِنَّكُمْ تَدْعُوْنَ

سَمِيعًا بَصِيْرًا. وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَهُ اَقْرَبُ اِلَىٰ اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ

سَرَّاحِلَةٍ (متفق علیہ)

ہماری زندگی کا پہلا قدم حق تعالیٰ کے حضور و شہود و کمال یقین و اذعان ہے! بجائے

اس وہم و امید کے کہ ہم زندگی کے کسی آخری مرحلہ پر حق تعالیٰ کے قرب و حضور کا تحقق کر سکیں گے

ہیں آج ہی کمال ایمان و اذعان کے ساتھ کہنا چاہیے۔

حق تعالیٰ آج میرے قریب ہیں، اقرب ہیں، محیط ہیں، ساتھ ہیں، اُن کے وعدے سچے ہیں،

اُن کے ہاتھ فضل و کرم سے پُر ہیں، اُن کی نعمتیں کامل و دراز ہیں، ان کی رحمتیں وسیع و کشادہ ہیں۔

وہ تجھے ہر تجربہ سے سلامتی و امن کے ساتھ نکال کر قبر کثیر کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔

يَا عَالَمَانِي وَيَا قَرِيبًا مَتِي وَيَا شَاهِدًا عَلِيًّا

مَوَاعِيدِكَ صَادِقَةٌ يَا دِيْنِيكَ فَاضِلَةٌ نِعْمَتِكَ سَابِغَةٌ رَحْمَتِكَ وَاسِعَةٌ

اَنْظُرْ اِلَىٰ مَنَّا مِنْكَ بِنَظَرَةِ رَحْمَةٍ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

ہم اب حق تعالیٰ سے اسی طرح باتیں کر سکتے ہیں جس طرح بچہ اپنے باپ سے باتیں کر سکتا ہے!

تجرت سے، ادب سے، عجز و انکسار سے، پلوئے اعتماد و وثوق سے عرض مدعا کر سکتے ہیں! وہ ہمارے

ساتھ بالذات حاضر و موجود ہیں۔ اِنَّ اِلٰهًا عَلِيًّا كَلِمًا شَيْءٌ شَهِيدٌ! وہ ہر چیز کے ساتھ حاضر ہیں،

اُن سے کوئی چیز جو معلوم کی جاسکتی ہو یا دیکھی جاسکتی ہو غائب نہیں ہو سکتی۔ اُن کا ارشاد ہے:

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ
 قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ
 شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ
 رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي
 السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا
 فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (پ ۱۱ ع ۱۲)

تم جس حال میں ہوتے ہو، یا قرآن سے کچھ پڑھتے
 ہو یا تم لوگ کوئی اور کام کرتے ہو، جب اس میں
 مصروف ہوتے ہو، ہم تمہارے سامنے ہوتے ہیں اور
 تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ
 نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے
 چھوٹی ہے یا بڑی۔ مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے۔

اس ارشاد سے ہمیں صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ بالذات حاضر ہیں،
 اس لئے وہ ہمارے ہر حال، ہر فعل اور ہر مصروفیت کو بالمشاہدت جانتے ہیں! ہمیں اپنا حال روشن
 کرنے کے لئے کسی مشقت، کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں، وہ ان حالات کے شاہد ذاتی ہیں فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا
 - تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں! جب ہمیں کوئی حاجت ہو تو ہمیں اس حاجت کو
 ان کے سپرد کر دینا چاہیے۔ اور پھر اس کی طرف سے اپنی توجہ کو ہٹالینا چاہیے اور ان ہی کی ذات
 مبارک پر اپنی پوری پوری توجہ مبذول دے کر دینا چاہیے اور اس امر کا یقین کر لینا چاہیے کہ
 ان کی کمال قدرت کا ظہور ہوتا ہے اور ان کا امداد ہمارے خیر ہر شے کے ظہور میں کار فرما ہے،

اربابِ عالمِ حلیم و زبانِ سوالِ نیکت۔

در حضرت کریم تقاضا چہ حاجت است

سچی دعا اجابت حق کا تحقق ہے: حق تعالیٰ قریب و مجیب ہیں اور فرماتے ہیں اَجِيبْ

دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا (بقرہ آیت ۱۸۶) جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں

اس کی دعا قبول کرتا ہوں: فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ط

اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دعا عبادت ہے، تمہارے رب نے کہا ہے، کہ تم

مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا (رواہ احمد و ابی السنن) اسی وجہ سے دعا کے وقت اجابت کا

تو یقین رکھنا چاہیے، اَدْعُوا اللَّهَ وَانْتُمْ مُوقِنُونَ بِاَنَّهَا جَابَةٌ۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے

فرمایا تھا کہ جس چیز کی بھی تمہیں خواہش ہو، اس کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کرو اور جب دعا کرو تو اس کے قبول ہونے کا یقین رکھو اور وہ چیز تمہیں حاصل ہوگی۔

دعا کے وقت سب سے زیادہ اہم یہی چیز ہے کہ ہم حاجتِ حق پر یقین رکھیں اور اچھی طرح مان لیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کوئی مسئلہ نہ چھوٹا ہے نہ بڑا، ان کے لئے ہر چیز آسان ہے، وہ ہر شے پر قادر ہیں **إِنَّ تَبِيئَتِكُمْ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَالْجَابَةِ جَبَائِرٌ! نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ!** اس لئے کامل یقین و وثوق کے ساتھ ہمیں اپنے قلب کے رخ کو حق تعالیٰ کی طرف پھیر دینا چاہیے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہماری حاجت سے واقف ہیں اور اس کی تکمیل فرما رہے ہیں، جب حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں تو پھر ہمارے تمام خوف بے بنیاد ہیں، فضول ہیں، ذرا اس شخص کا تصور تو کرو جو ایک سرسبز و شاداب وادی سے گذر رہا ہے، لیکن یہ غم اس کو کھائے جا رہا ہے کہ اس کے سامنے تو ایک دریا ہے اور وہ اس کو عبور نہیں کر سکتا حالانکہ دریا پر پل بھی ہے اور وہ نہیں جانتا! یا اس شخص کا تصور کرو جس کے ساتھ سفر میں ایک دانا و مینا قوی و عزیز دوست ہے جو راہ و رسم منزل سے بخوبی واقف ہے، جو اس سفر کا کامل نقشہ بنا چکا ہے اور یہ یقین دلا چکا ہے کہ اس سفر میں کوئی اتفاقی حادثہ تک پیش نہیں آئے گا، اس پر کامل اعتماد کیا جاسکتا ہے، اس پر بھی یہ مسافر پریشان ہے!

مومن کا قلب احمقانہ خوف سے خالی ہوتا ہے، وہ **خَلَّ اللَّهُ كَوْمَضْبُوطٍ يَكْرَهُ حِمَّتٍ وَ** مردانگی سے زندگی کے میدان میں قدم اٹھاتا جاتا اور کل کے مسائل اس کو پریشان نہیں کرتے، وہ حق تعالیٰ پر کامل توکل و اعتماد رکھتا ہے:

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے **لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَىٰ اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ** کہ خدا نے ہمارے لئے نگہ رکھی ہو وہی ہمارا کارساز ہے اور **الْمُؤْمِنُونَ ط (۹، توبہ ۵۱)** جو مومن کو خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے

اجابتِ دعا کے یقین کے ساتھ اپنی حاجت کا رسازِ حقیقی کے سامنے پیش کرنے کے بعد دعا

کی قبولیت پر ہمیں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، یہ جان کر کہ کوئی جدید ایجاد، نہ برق نہ
مقناطیس، نہ ذرہ ہائے اندر اس قوت کا کرداروں حصہ بھی پیدا کر سکتی ہے جو ہم میں حق تعالیٰ
کی لامتناہی قدرت پر بھروسہ کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے، ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اس
شکر کے ادا کرنے سے ہمارے شعور کے مقفل دروازے کھل جاتے ہیں اور ہم اس قابل ہو جاتے
ہیں کہ حق تعالیٰ کے لامحدود انعامات کو قبول کر سکیں اور ان کی نعمتِ سالنہ و رحمتِ واسعہ کا
منظرہ بین سکیں! حق تعالیٰ کا شکر نہ صرف ان نعمتوں پر جن کا ہم نے اپنی گذشتہ زندگی میں تجربہ
کیا ہے، بلکہ ان بے شمار نعمتوں پر جو ہمارا آئندہ زندگی میں ظاہر ہونے والی ہیں، ایک کامل نفاذ
شاد و با مراد زندگی میں داخل ہونے کا سب سے زیادہ یقینی اور سب سے زیادہ آسان طریقہ ہے
ہمیں نہ کسی چیز کی فکر کرنی چاہیے نہ کسی چیز کا غم، حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر یقین ان کی گذشتہ و
آئندہ نعمتوں پر شکر مشکلات کے پہاڑوں کو اڑا کر بکھیر دے گا اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا۔
يَسِيْفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا! (۲۰، ط ۱۰۵)

ختم دعا پر ہمیں کہنا چاہیے،

اَمْتَ غِيَاثِي فِي كُلِّ كَرْبَةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ! ہر بڑے غم میں تو ہی میرا فریاد ہے، خدایا تیرا شکر!
وَأَمْتَ رَجَائِي فِي كُلِّ شِدَّةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ! ہر سختی میں تو ہی میری امید ہے، خدایا تیرا شکر!
أَرْجُو الْخَيْرَ قَتِيئِرُهُ وَأَخَافُ الشَّرَّ اور تو آسان کر دیتا ہے اور ہر شر سے ڈرتا ہوں۔

فَتَصْرِفُهُ فَلَكَ الْحَمْدُ! اور تو اس کو دفع کر دیتا ہے، خدایا تیرا شکر!

وَأَرْبِيئِي التَّنِيَّاتِ فَلَكَ الْحَمْدُ! خوشی کے مارے میرے اگلے راست دکھلا دیتا ہے، خدایا تیرا شکر!

بِيَدِكَ مَوْتِي وَحَيَاتِي فَلَكَ الْحَمْدُ! میری زندگی و موت تیرے ہاتھ ہے، خدایا تیرا شکر!

حق تعالیٰ کی ذاتِ قادس پر بھروسہ، اس سے پیدا ہونے والی مسرت و شادمانی، تمام مصائب

و آفاتِ زندگی کا کامل علاج ہے، اسی لئے کہا گیا ہے،

شادی جاوید کن از دوست تو!
تا نہ گنجی ہچو گل در پوست تو!

• شادی جاوید" یا دائمی خوشی اس وجہ سے کہ حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، نِعْمَ
الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ" اچھے مولیٰ اور اچھے مددگار ہیں، لامتناہی قدرت و قوت کے مالک ہیں
ہم اپنے اسی یقین و ہمدان کا اظہار کرتے ہیں اس کی تکرار کرتے ہیں اور اس قوت سے تکرار کرتے
ہیں کہ تمام شرکی قوتیں جو ہمارے خلاف صفت آرا ہیں، راہ فرار اختیار کرتی ہیں اور بالآخر فنا
ہو جاتی ہیں، یہی ہمارا نعرہ جنگ ہے:

وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ!

إِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا!

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّرِيعُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ!

إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ!

كَانَ اللّٰهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا!

کسی حاجت کے وقت اگر ہمارے قلب کی نظر حق تعالیٰ کی قوت و قدرت پر جم جائے تو اس
قوت کا اظہار ہم میں ہونے لگتا ہے! دیکھو، جس چیز کا بھی ظہور ہماری زندگی میں ہوا ہے،
اسی وقت ہوا ہے جب ہم اس سے واقف ہوئے ہیں اور اس کو قبول کیا ہے۔ یہ ایک کلی نفسیاتی
قانون ہے! یہ کلی بھی ہے اور ضروری بھی، اس کا اطلاق ہر تصور پر، ہر مادی شے پر ہوتا ہے، جو
ہمارے علم میں آئی ہے، یا ہماری بلک بنی ہے! اسی لئے یہ چیز اہل عقل و اہل نقل دونوں کے نزدیک
مسلم ہے کہ جب ہم حق تعالیٰ سے کوئی چیز مانگتے ہیں تو ہمیں اجابت کا یقین کرنا چاہیے، یعنی یہ
یقین کرنا چاہیے کہ ہمیں وہ چیز مل چکی اور صرف اسی صورت میں وہ چیز ہماری بلک بن جاتی ہے
یہی تفسیر ہے اَدْعُوا اللّٰهَ وَآنتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ کی۔

حق تعالیٰ قادر و قوی ہونے کے علاوہ رحیم و ودود بھی ہیں، رؤف و رحیم بھی ہیں، غفور و

رحیم بھی ہیں، رحمن و رحیم بھی ہیں، البر الرحیم بھی ہیں، إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا اُن کا محبت بھرا ارشاد ہے، یہ جان کر ہم اپنے قادر توانا، رؤف و رحیم مالک کی بیشمار نعمتوں و رحمتوں کو شکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں تاکہ اُن کا کامل ظہور ہماری زندگی کی ہر جہت ہر پہلو میں ہو! محبت و شکر سے سرشار روح بے اختیار چیخ اُٹھتی ہے۔

اے جانِ من، جانانِ من، صد جانِ من قربانِ تو!

بے لطف تو من قرار نہ تو انم کرد احسان ترا شمار نہ تو انم کرد

گر برتنِ من زباں شود سرخے یک شکر تو از ہزار نہ تو انم کرد (ابوسعید ہنہ)

اسی نکتہ کو شیخ جیلی نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا تھا:

اہلِ ولایت می دانند کہ حضرت حق تعالیٰ جمیع مایحتاج الیہ اینہارا ہتیا ساختہ

و مقرر نموده است، پس بسببِ علم خویش از رنج تقاضا فارغ اند! پس بہتر است

کہ رجا در حق اینہا حسن ظن باید گفت نہ تقاضا، حسن ظن ب حضرت حق تعالیٰ معرفت

جمیع صفات باری است و امید یافت در رحمت اوست، از جہت اوسمانہ تعالیٰ

نہ از جہت بندہ، زیرا کہ صفاتِ حسن و کریم و رحیم و لطیف در رؤف و رؤفاست

حسن ظن ب حضرت حق تعالیٰ حوالہ کردن مقاصد خویش بر سابقہ امر عنایت جناب الہی

است و نظر قلب بسوئے حق تعالیٰ بے تطبیح فواد و بے تمیز آرواح و نفوس:

(منقول در جواہر عینی صفحہ ۳۳۶)

یعنی اولیاء جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کی تمام احتیاج کی چیزیں ہتیا کر دی ہیں اور مقرر فرمادی

ہیں، اپنے اس علم کی وجہ سے وہ تقاضا کے رنج سے فارغ ہو چکے ہیں، لہذا بہتر ہے کہ اللہ کے حق

میں رجا یا امید کو حسن ظن سے تعبیر کریں نہ کہ تقاضے سے! حق تعالیٰ سے حسن ظن ان کے تمام

صفات کی معرفت ہے، ان کی تری، ہر بانی و رحمت سے امید ہے، یہ حق تعالیٰ کی جہت سے،

نہ کہ بندہ کی جہت سے، کیونکہ حق تعالیٰ کی صفاتِ حسن و کریم و رحیم و لطیف در رؤف و رؤفا ہیں

اور حق تعالیٰ سے حسن ظن کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایتِ سابقہ کے حوالہ کر دیا جائے، اور قلب کی نگاہ اُن پر جم جائے، ایسی حالت میں قلب سے طمع اور رُوح و نفس سے تمام تشائیں نکل جاتی ہیں، لہذا ہم صحیح اُٹھتے ہیں :

تو دردِ دلی بغمِ این و آن کہ پردازد بجائے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پردازد
ز نازِ نیتِ ترا فرست و مرا ز نیاز کُنوں بحالِ دلِ ناتواں کہ پردازد

اوپر کے ارشادات سے معلوم ہوا :

(۱) دعا پر ہم مامور ہیں، اَدْعُوْنِي نِيْزْ فَعَلِيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِاللّٰهِ عَاوِدْ مَا فَطَرَنِي

ہے، ہماری قدرت کا تقاضا ہے۔

(۲) دعا کے بعد ہیں اس کی اجازت پر اس کے قبول ہونے پر یقین رکھنا چاہیے اَدْعُوْا اللّٰهَ

وَ اَنْتُمْ مَوْقُوْنٌ بِاللّٰهِ جَابِئَةٌ

حق تعالیٰ جو نیکو محسن و کریم و رحیم، لطیف و رؤف و ودود ہیں، اُن کی نعمتیں و رحمتیں ہم پر

محیط ہیں، ہماری زندگی میں اُن کا ظہور اُن کے قبول کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک کلی و ضروری

و نفیاتی قانون ہے، اس کی ہمیشہ پابندی کرنی چاہیے۔ دعا کرنے کے بعد قلب کی نگاہ حق تعالیٰ

کی اُن ہی صفات پر جم جانی چاہیے اور شعور کے دروازے اُن صفات کے ظہور کے لئے کھول دیئے

جاننے چاہئیں، دن کے مختلف اوقات میں قلب کی کشش و نگرائی حق سبحانہ تعالیٰ کی

اُن ہی صفات کی طرف ہونی چاہیے:

مزدک از ہر کس چشم و گوش بر بندیم تمام چشم و ہر گوش کردہ مانا (درد)

(۳) دُعا کے بعد اس کی قبولیت پر ہمیں قلب سے شکر ادا کرنا چاہیے، انسانی تخیل کی بلند ترین

پرواز ہی حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں و رحمتوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو اسے بننے مومن کے لئے فراموش

کرتی ہیں۔ فَلَا تَعْلَمُوْا نَفْسٌ مَّا اَخْفٰی لَكُمْ سَعِرٌ قُرْاٰنِیْ

ہاں سے ان اشارات پر عمل کرتے ہوئے اب تم اپنی کسی ضروری حاجت کا تصور کرو۔

دعاء اور دفع بلا

اگر آپ کا کوئی عزیز، آپ کا محبوب آپ سے ہزاروں کو س دور غم و الم میں مبتلا، بلاؤ مصیبت میں گرفتار ہو اور آپ سے دعا کا طالب ہو تو آپ جانتے ہیں کہ دعا کے ذریعہ اس کی تائید کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ جو طریقہ خود ہیں اپنی بلا مصیبت خوف و حزن کو دفع کرنے میں کام آتا ہے بالکل وہی اس محبوب کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے! اس کی تفصیلات اجمالی طور پر یہاں پیش کی جاتی ہیں، ممکن ہے کہ یہ آپ کی سمجھ میں آجائیں اور آپ کو اپنی ان باطنی ربانی قوتوں کا علم ہو جائے جن سے آپ اب تک بے خبر تھے، ان کے استعمال سے آپ خود کیف و سرور حاصل کریں اور دوسروں کی بھی راحت و آسائش کا باعث بن جائیں۔

زیر شہدیک انجھٹ بہلم بلبت از لذت اگر چو نہ گروی قفت کن

ایک نامعلوم خطہ زمین میں ایک کشف مصروف تحقیق ہے اور یکا یک راستہ بھٹک جاتا ہے، اب وہ پختہ کار خوب جانتا ہے کہ اس حالت میں اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے کہ وہ حواس باختہ نہ ہو جائے، اس کے اوسان جاتے نہ رہیں، ہشی گم نہ ہو جائے! اس کو خوب معلوم ہے کہ اگر خوف کے ماتے اب اس کی عقل جاتی رہے تو پھر اس کو کبھی راستہ نہیں ملتا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہلاک ہو جاتا ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اس نے اس وقت اپنے قلب کو سنبھال لیا، اس کو خوف و مہراس سے آزاد رکھا، پرسکون دل جمع اور مطمئن رہا تو ممکن ہے کہ اس کو راستہ مل جائے اور وہ ہلاکت سے بچ جائے۔

بالکل یہی حال تمام مصائب اور مشکلات کا ہے، سب سے پہلے ہمیں اپنے قلب کو خوف

پریشانی سے بچانا چاہیے، جب ہم پر بلاؤں کا نزول ہوتا ہے، درد اور غم کے باوجود اُمنڈا لے میں تو سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی معیت کا احساس کر کے اپنے دل کو خوف سے محفوظ کر لیں، خوف دور ہوا اور ہم نے ذاتی نفع و ضرر کے خیال سے بلند ہو کر اپنے آپ کو قاطب کر کے کہا کہ حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں اور تاباں کے الفاظ میں دنیا کے اچھے اور بُرے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر دیا کہ :-

دنیا کے نیک بُد سے کچھ تاباں نہیں ہر مجھ کو غم

گریں ہوا تو کیا ہوا اور دواں ہوا تو کیا ہوا

تو اب حالات میں تغیر ہو جاتا ہے، اور حیرتناک طریقہ سے ہمیں تمام بلاؤں سے نجات مل جاتی ہے اور مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا مِمَّا كَانَتْ عَلَيْهِ أَمْوَالُهُ، اسی طرح ہم اپنے محبوب کی خواہ وہ ہم سے قریب ہو یا دور ہو، اس کے بارے میں پریشان اور خوف زدہ ہو کر بند نہیں کر سکتے، خوف و پریشانی سے بچنے اس کی مصیبت کم ہونے کے اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ ہم اپنی مسموم ذہنی فضا سے اس کو بھی متاثر کرتے اور اس کے خوف و پریشانی میں اور اضافہ کر دیتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی طرف سے بے پرواہ ہو جانا چاہیے اور اس کا خدا مالک ہے کہ بے فکر بن جائیں وہ درد و تکلیف میں مبتلا ہے اور ہمیں اس کی مدد کرنی ضروری ہے، وہ ہم سے کوسوں دور ہے اور جسمانی خدمت کا ہمیں کوئی موقع حاصل نہیں، اس کی خدمت کا روحانی طریقہ ہی اختیار کیا جاسکتا ہے اور وہ دعا اور تقویٰ ہی ہے، ہم اس کے لیے اس طرح دعا کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اپنے لیے دعا کر رہا ہے اور رحمت و نصرت حق کا اس طرح ادراک کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اس کا ادراک کر رہا ہے۔

اس طریقہ کے استعمال میں سب سے زیادہ اسی شخص کو کامیابی حاصل ہوتی ہے جو مستحق

اور پرمیزگار ہے، توحید کے میدان کا مرد ہے، امتثالِ امورِ الہیہ میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے،

نواہی سے اجتناب ہے اور فسق و فجور سے تائب، اس کی دعا میں بلا کا اثر ہوتا ہے اور حق تعالیٰ

نے اسی کے متعلق تو فرمایا ہے کہ میں اس کا ہاتھ، آنکھ، کان پاؤں ہو جاتا ہوں کنت سمعہ
الذی یسمع بہ ونبصرہ الذی یتبصر بہ ویدہ الذی یبطش بہا ورجلہ الذی یمشی بہا

الحديث رواه البخاري

بہر حال پہلی چیز یہ ہے کہ ہم خود اپنے خوفزدہ اور پریشان قلب کو سکون و محبت عطا
کریں اور اس کے انتشار و پریشانی کو رفع کریں، جب ہم اپنے محبوب کے متعلق بڑی خبر
پہنچے تو ہمیں چاہیے کہ فوراً بھولنے فیرنے والی اللہ حق تعالیٰ کی طرف گریز کریں کیونکہ تمام چیزوں
کا اختیار ان ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی پناہ دیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں کوئی کسی
کو پناہ نہیں دے سکتا۔ قل من بیدہ ملکوت کل شیء وهو یجیر ولا یجار علیہم کنتم
تعلمون (پ ۵۶) تمام اہل اللہ کو اس امر کا تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی مصیبت کو ابتدا
حق تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور ظن کو اس کی اطلاع نہیں دیتا تو بہت جلد نصرت
الہی اس کو دور کر دیتی ہے اور اس کے قلب کو سکون اور طمانیت عطا کرتی ہے۔

یہ شاید ابتدا میں ہمارے لیے آسان نہیں جب ہم پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہو تو ہمارے
قلب کے تار ٹوٹنے لگتے ہیں، ہماری نبضیں پھٹنے لگتی ہیں، ہمارے خیالات میں بلا کا انتشار اور
نشئت پیدا ہو جاتا ہے، خون سے ہماری زبان سوکھنے لگتی ہے، ہماری آنکھوں میں اندھیرا
چھناتا ہے!

یاد رکھو یہی وقت ہے رجوع الی اللہ کا، یہی وقت ہے قلب کو ظلمت سے نکال کر نور
کی طرف رجوع کرنے کا، سلبی و تخریبی خیالات سے اس کو چھڑا کر ایجابی تصور کی طرف مائل
کرنے کا، اور حق تعالیٰ سے زیادہ کس کا خیال نورانی اور ایجابی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے حضور
انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت ان پاکیزہ الفاظ کو دہرانے کی تاکید فرمائی ہے :-

لا الہ الا اللہ العلی العظیم لا الہ الا اللہ رب العرش العظیم، لا الہ الا اللہ رب السموات
و رب العرش الکبریٰ

لہ نوٹ صفحہ ۳۲۲ پر دیکھیے۔

تم چاہو تو ان الفاظ کی تکرار کر سکتے ہو جو تمہارے کرب کو رفع کرنے میں اکیسرا حکم رکھتے
ہیں: اللہ اللہ ربی لا اشرك به شیئا یا پھر یہ الفاظ دہرائے جاسکتے ہیں: یا حی یا قیوم
برحمتک استغیث ۱۰

یہاں یہ نفسیاتی اصول یاد رکھنا چاہیے کہ خوف و غم کا مقابلہ ان کی سطح پر رہ کر نہیں کیا
جاسکتا، اس سطح میں ان کی قوت ناقابلِ مدافعت ہوتی ہے، ہمیں ان سے نجات پانے کے لیے
اس سطح سے بلند ہو جانے کی ضرورت ہے۔ جب ہم حق تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے
ہیں، ان کے اسماء و صفات کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو کر اس مقام
پر پہنچ جاتا ہے جہاں شر کا گزر نہیں، جہاں سوائے ذات کے سرور و سکون کے کوئی اور چیز
نہیں اور ہمیں ذات کے اس سرور میں کافی حصہ مل جاتا ہے ۵

قطرہ نوری سراپا نور باش بگڑا از غم دائمًا مسرو باش (نوی)
ادعیہ ماثورہ کی تکرار کے ساتھ تمہیں حق تعالیٰ کی محبت و احاطت کا اور اک بھی واضح طور پر
کرتا چلیے حق تعالیٰ نے تمہیں اپنی محبت کا یقین دلایا ہے ھو مَعَكُمْ اَیْمَانُ کُنْتُمْ جہاں کہیں
تم ہو حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہیں، وہ تم پر محیط ہیں، ہر شے پر محیط ہیں، کوئی شے ان کے احاطے سے
خارج نہیں، وکان اللہ بکل شیء محیطاً (پ ۵۷) الا انہ بکل شیء محیط (پ ۵۶) حق تعالیٰ
ہر جا حاضر و موجود ہیں، تم اپنا منہ جدھر پھیرو وہیں ذات حق موجود ہے۔ فایمنا تو لو افتم وجہ
اللہ -

آنکھیں جو ہوں تو میں پر مقصور ہر جگہ بالذات ہر جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

(نوٹ صفحہ ۳۲۵) لے رہا ہ بخاری و سلم و ابو عوانہ و نسائی و الترمذی و ابن ماجہ و غیر ہم ابن حوزہ نے اشارہ فرمایا
کیا کہ پھر اس کے بعد عاکرے -

دعا صفحہ ۳۲۵) لے رہا ہ ابو داؤد و النسائی و ابن جہاں بخاری نے تین بار ان کا کتنا زیادہ کیلئے و آخر جہاں ابن ماجہ
ایضا حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اپنے اہل بیت کو بھیج کر کہے فرمایا کہ تم میں جب کسی کو غم یا کرب پہنچے تو کہے۔ اللہ
اکبر ۱۰ لے ابن مسعود فرماتے ہیں کہ حضرت صلعم کو جب کوئی غم ہوتا تو یہ الفاظ دہراتے -

حق تعالیٰ خود ہم سے بہت قریب ہیں، اقرب ہیں، ہرگز بعید نہیں، دور نہیں! وہ اس کا ہمیں پورا یقین دلا رہے ہیں مَخْنُ اقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ یعنی ہم رگِ جان سے زیادہ قریب ہیں، اپنے سے دور کیوں سمجھ رکھا ہے! اپنے جہل کو دور کرا اور ہم سے قریب ہو جا! خوابِ جہل از حرمِ قرب مراد دور فکند ورنہ نزدیک تر از دوست کے ہیچ ندید

حق تعالیٰ کے ان ارشادات پر یقین و ایمان رکھ کر خوف و غم، کرب و رنج کے وقت ہمیں اپنے نفس کو یقین دلانا چاہیے کہ۔

حق تعالیٰ اس جگہ حاضر و موجود ہیں الا انہ بكل شیء محیط
 حق تعالیٰ قطعاً میرے ساتھ ہیں ہو معکم اینما کنتم
 حق تعالیٰ قطعاً میرے قریب ہیں۔ ان ربی قریب مجیب
 حق تعالیٰ قطعاً ہر جہت میں موجود ہیں فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

تواب

حضورِ حق رحمت ہے، حضورِ حق مسرت ہے، حضورِ حق امن و طمانیت ہے۔
 اس مراقبہ و تدبیر سے حق کا ادراکِ نفس و آفاق میں قائم ہونے لگتا ہے اور ادراکِ حق کے قیام کے ساتھ خوف و حزن، غم و کرب و الم سب فائب ہو جاتے ہیں کیونکہ قلب ان کی سطح سے بہت بلند ہو جاتا ہے اور سکون و مسرت و امن و طمانیت کی لہریں اندر سے اُبٹھنے لگتی ہیں حق کو اپنے ساتھ پا کر وہ ان میں مشغول ہو جاتا ہے اور ان سے راضی اور جب وہ حق سے راضی ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اس طرح جب ہم نے اپنے خوف و حزن کو دور کر لیا اور حق تعالیٰ کی یافت و شہود کی بدولت قطرہٴ نور میں گئے، ذاتِ الہی کے سرور سے لطف اندوز ہونے لگے تو ہم اب اپنے دور افتادہ مہجور محبوب کی دعا کے ذریعہ مدد کر سکتے ہیں، ذرا احتیاط کے ساتھ اس طریقہ پر غور کرو۔

ہیں اس کی جانب سے یافت قائم کرنا ہے، اگر اس کی جان خطرہ میں ہے، اگر وہ بلا دل میں گرفتار ہے تو جب ہم اس کا خیال کریں گے تو ہمارے قلب میں وہی تاریکی پیدا ہوگی جس میں وہ گھرا ہوا ہے۔ جب ہم نے اپنی تاریکی یافت حق کی وجہ سے دور کر لی تو اب ہمیں اس کی تاریکی اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور جس طرح اپنی تاریکی رفع کی تھی بالکل اسی طرح اس کے خیال سے پیدا ہونے والی تاریکی کو بھی دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ توصیہ ظاہر ہے کہ دوست کے غم سے ہمیں غم ہوتا ہے اس کی بے چینی ہمیں بے چین کرتی ہے۔ جب اس کے خطرے یا ضرر کا خیال قلب میں پیدا ہوا کہ قلب کی کیفیت بدلنے لگی اور اسی کیفیت کو حزن و خوف و کرب سے تعبیر کیا جاتا ہے، قلب کی کیفیت کو جب تم نے حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کے تذکرے سے حق تعالیٰ کی ذات کی یافت سمان کے حضور و معیت و احاطت و قرب اقریبیت کے ادراک فی الانفس والافاق سے دور کر لیا کہ تمہارے محبوب کا خوف و حزن خود اس کے قلب سے ہٹ گیا اور چین و سکون کی کیفیت کا طور ہونے لگا۔

اپنے دور افتادہ محبوب کی مدد کرنے کا روحانی طریقہ بس یہی ہے کہ پہلے اس کے غم و مصیبت کے بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اٹھانا چاہیے اور اس کا درد اپنے قلب میں پیدا کرنا چاہیے اور پھر حق تعالیٰ کے ذکر اور ان کی یافت کے ذریعہ امن و طمانیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور اس طرح یہ بوجھ خود بخود اٹھ جاتا ہے اور اس کو بلا و مصیبت سے نجات مل جاتی ہے۔ وما ذلک علی اللہ بجزیر!

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے محبوب کو حق تعالیٰ کو تفویض کر دینا چاہیے۔ ہمیں اس کی صورت کو ذہن میں مستحضر کر کے حق تعالیٰ سے یوں معروضہ کرنا چاہیے، حق تعالیٰ میں نے ان کو آپ کے سپرد کیا، تفویض کیا انہیں نور اور نورانی کر دیجیے عافیت و امن عطا فرمائیے ان کی ضروریات کی تکمیل کیجیے، ربنا علیک توکلنا، حسنا اللہ و نعم الوکیل، نعم المولیٰ

ہیں اس امر کا بھی شدت کے ساتھ استحضار کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہماری اور ان کی زندگی کے ہر واقعہ کا بذات خود تعین فرما رہے ہیں اور بشارت رحمت تعین فرما رہے ہیں۔ اس استحضار ہی سے امر واقعہ کا تحقق ہوتا ہے ہلکے لیے اور ان کے لیے بھی انکند ظن عبدی بی سے اس کی تائید ہوتی ہے، حالات میں آسانی اور سہولت پیدا ہونے لگتی ہے حق تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن تقویٰ ہے اور متقی کی مراد حق تعالیٰ قطعاً پوری کرتے ہیں ۶
می دہد بزواں مراد متعین! (رہمی)

ومن یتق الله يجعل له من امره يسرا سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے اور من یتق الله يجعل له مخرجا اس پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔

امداد کے اس روحانی طریقے کے متعلق یہ بات واضح طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ کشف ضرر حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، مخلوق میں نہ اس کی قوت ہے اور نہ طاقت لا قوۃ الا باللہ حق تعالیٰ ہی قائل ہیں اور مخلوق محض آلات، موثر حقیقی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، باقی اولیٰم و خیالات اوان یتسک الله بصر فلا کاشف له الا هو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ یصیب بہ من یشاء من عبادہ وهو الغفور الرحیم (پ ۱۷۶)
یعنی اگر تم کو حق تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائیں تو بجز ان کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہیں تو ان کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والے ہیں جاتی نے اسی عقیدہ کے تحت فرمایا ہے۔

حق قائل ہرچہ جزع آلات بود تاثیر زالت از محالات بود

ہستی کہ موثر حقیقی ست بحیث باقی ہما اولیٰم و خیالات بود

جب ہم اپنے قلب میں اپنے محبوب کا درد لے کر مواجہ حق میں آجاتے ہیں تو حق ہی کے

نور سے ہمارا اور ہمارے محبوب کا درد رفع ہو جائے، فاعل و موثر قطعاً حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں
اور ہم محض وہ آلات جن کے ذریعہ ان کا فیضِ کرم جاری ہوتا ہے۔

اے ستر تو در سینہ ہر صاحبِ راز پیوستہ درِ رحمت تو برہمہ باز
ہر کس کہ بدرگاہ تو آید بیاز محروم ز درگاہ تو کے گردد باز

اسرارِ حج

حج زیارت کردن خانہ بود حج رب البیت مردانہ بود (رومی)

صوفیہ کرام نے ہمیشہ مذہب کے ظاہری رسوم سے زیادہ ذوراس کی باطنی روح پر دیا
ہر دین محمدی کی ہی دو حیثیتیں ہیں: ظاہری و باطنی!

نیکی و طاعت کے ظاہری افعال سے قلب پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں ان
کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت یا تصوف کا مقصود و مقصد
العیین ہے۔

قرآنی تعلیمات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصل چیز ظاہری رسوم نہیں بلکہ باطنی روح ہے۔ دیکھو
قربانی کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے وضاحت فرمادی ہے کہ:

”ز قربانی کا گوشت حق تعالیٰ کے پاس پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ تقویٰ یا پارسائی ہے۔“

یعنی حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی محض قربانی کر دینے یا خون بہا دینے سے نہیں حاصل ہوتی جب
تک کہ اس قربانی کا مدار حق تعالیٰ کی محبت، ان کی رضا جوئی، اور ان کی قرب طلبی نہ ہو اسی
طرح دوسری جگہ واضح فرمایا گیا ہے کہ:-

لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُوا وَجْوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَبِالْحَرَامِ وَالْحَرَامِ وَالْحَرَامِ وَالْحَرَامِ وَالْحَرَامِ
نیکو اس کا نام نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا
مغرب کو، بلکہ نیکو اس کا نام ہے جو خدا اور یوم آخرت پر ایمان
یقین سے حاصل ہوتی ہے۔

یعنی محض کسی سمت کو قبلہ بنا کر اس کی طرف منہ پھیر لینے سے انسان کے اندر نیکی نہیں پیدا ہو سکتی

۱۰ شاہ ولی اللہ دہلوی نے فرمایا: ”لے لن ینال الله لمحومها و اولاد ما تها و لكن ینال التقوی منكو۔“

جب تک کہ اس کی بنیاد اللہ اور آخرت کے یقین و ایمان پر نہ ہو!
 لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیے کہ قرآنی تعلیمات اور اسلامی تصوف کی رو سے دنیا میں جس طرح انسانی روح بغیر انسانی جسم کے نہیں پائی جاتی اور اس کے روحانی افعال کا اہتمام بغیر جسمانی افعال کے نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا میں خاص خاص افعال یا جسمانی حرکات اور احوال کے بغیر روح کا ارتقا اور اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اسی لیے صوفیائے کرام نے باطن کے ساتھ ظاہر کی حفاظت پر پورا زور دیا ہے اور متقدمین صوفیاء نے تصوف کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "وہ نام ہے تعمیر ظاہر و باطن کا" بالفاظ دیگر دونوں کی اصلاح و درستی ضروری ہے، نہ ظاہر بغیر باطن کے اور نہ باطن بغیر ظاہر کے درست ہو سکتا ہے۔ ظاہر عنوان ہے باطن کا، جب کبھی ظاہری افعال شروع عمدی کے خلاف ہوں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کا باطن موافق و مطیع ہوگا، ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کا، کیسے ہو سکتا ہے کہ باطن درست ہو اور اس کا اثر ظاہر پر نہ پڑے، یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح ظاہری افعال کا اثر باطن پر پڑتا ہے بلکہ ظاہری عمل باطن کو متاثر کرتا ہے۔ ولیم جیمس جیسے ماہر نفسیات نے تو اس حد تک زور دیا ہے کہ "اگر تم باطن میں کوئی کیفیت یا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس کی ظاہری صورت پیدا کر لو، تم باطن متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔" جیمس لینگ نظریہ کی تفصیلات کے آج کل جامعات کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔

حج کے تمام اعمال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن جس کا طرہ امتیاز حق تعالیٰ کی شہادت ہے (الذین امنوا اللہ حبیباً اللہ) اپنے عشق و محبت کے جذبہ کو جو اس کے قلب کی گسائیوں میں نہاں ہے ظاہری اعمال و اشکال میں ہویدا کر کے تاکہ

"اس کے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے، وہ بلند آواز سے بلیک کہتے ہوئے نعرے

لگاتے اور ان نعروں سے محبت کی چھپی دلی آگ کو بھڑکاتا ہے!"

چنانچہ شاہ عبدالعزیز اپنی تفسیر میں بابر اہم ضلیل علیہ السلام کے حج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”باز ایشان را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را طالع شہداء ساختہ دیوانہ وار و عاشق کردار ہائے گرد
گشتن خانہ محبوب خود بر ہنہ سر و بر ہنہ تن و بر ہنہ پا، اثر و لیدہ مو، پریشان حال و گرد آلودہ از شام
بر زمین مجاز سیدہ گلے بر کوہ دگاہے بر زمین رو بہ سوی خانہ شادہ شہداء... گرد خانہ تجلی
آشیانہ او طواف کنند و بار بار کجھکے آن را بہ پوستد و بلیندہ

دیکھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے کو سرگشتہ و شیدا
بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے محبوب کے گھر کے گرد
ننگے سرنگے پاؤں، الجھے موٹے بال، پریشان حالی کے ساتھ گرد میں اسٹے ہو کر زمین
مجاز میں پنچیں، اور وہاں پہنچ کر کبھی پہاڑ پر، کبھی زمین پر محبوب کے اسی گھر کی طرف
رُخ کر کے کھڑے ہوں..... اسی تجلی خانہ کے گرد گھومیں اور اس کے گوشوں
کو چومیں چاہیں

حج کے مناسک سے عشق و محبت کا ایسی جذبہ ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر طواف کعبہ صفا
و مردہ کے درمیان سعی، مزدلفہ کی آمد و رفت، عرفات میں قیام، منیٰ میں ذبح و قربانی، و تکبیر و
احرام وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے۔

اعمالِ حج کے ان ہی باطنی اسرار کو ہم یہاں امام الصوفیہ حمزہ الاسلام حضرت غزالیؒ کے
اشارات کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں: نہ
زیر شہدیک انگشت سائیم بلبت از لذت اگر محو نگردی تعف کن!

حق تعالیٰ کے گھر کی زیارت کا شوق عاشق کے قلب میں بھرک اٹھتا ہے؛ جس قلب
میں اس ”شاہِ خواباں“ کا عشق نہیں وہ مردہ ہے، یا یوں کہیے: نہ
دل کہ فارغ شد ز عشق آن نگار
سنگ استہکے شیطانش شمارا

عاشق کی نگاہیں اب دنیا کی ساری لذتیں ہیج نظر آئے لگتی ہیں۔ مال و دولت، جاہ و حرمت دوست و احباب اپنی دلفریبیاں کھودیتے ہیں! "زندے" کا عشق اس کو مردوں کی محبت سے بیزار کر دیتا ہے اور وہ صحیح اٹھتا ہے۔

عشق با مردہ نباشد پائیدار عشق را با حئی جاں افزائے دار!
 عشق زندہ در روان و در بصر ہر دمے باشد ز خمچہ تازہ تر!
 عشق آن زندہ گزین کو باقیست و ز شراب جاں فرایت ساقیت
 عشق کن بگریم کہ جملہ انبیاء یافتند از عشق او کار و کیا!
 غرق عشق شو کہ غرق است اندرین عشق کے اولین و آخرین! (ردی)

اہل و عیال، دوست و احباب سے رخصت ہو کر جب وہ سوار ہوتا ہے تو اس کی نظر میں دارِ آخرت کی سواری آجاتی ہے، وہ اپنے جنازے کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے جس پر سوار ہو کر اس کو ایک روز آخرت کی طرف کوچ کرنا ہوگا اور وہ جانتا ہے کہ یہ دن کچھ زیادہ دور تو نہیں ہو سکتا۔ ۶۔ کیں عمر بیک چشم زدن نقش بر آب است!

جب احرام کے لیے چادر خریدتا ہے تو اس کو وہ دن یاد آتا ہے کہ جب اس کا تہ ہے جان کفن میں پٹیا جائیگا اور وہ ہے جس و حرکت پڑا ہوگا! اب اس کا ساتھ دینے والے نہ دوست احباب ہونگے اور نہ اہل و عیال صرف ایمان و عمل صالح ہی اس کے ساتھ جائینگے! وہ اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: ہ

يَا مَنْ بَدَيْتَ نِيَا وَاسْتَعْلَ قَدْ غَرَّكَ طَوْلُ الْأَمَلِ
 الْمَوْتُ يَا قِيَامَةَ وَالْعَبْرُ صَدُوقُ اللَّعَلِ (حضرت علی)

سوچتا ہے کہ احرام کی چادر تو خانہ کعبہ کے قریب پہنچ کر یا نہ صحنی پڑیگی، ممکن ہے کہ یہ سفر پورا نہ ہو سکے اور راہ ہی میں موت آجائے لیکن حق تعالیٰ سے ملاقات تو کفن میں لپٹے ہوئے ہی ہوگی! کفن کی اس چادر پر نظر کر کے شکستہ دلی کے ساتھ حق تعالیٰ سے عرض کر رہا ہے۔

اللَّهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِمَاءِ الثَّلَاجِ وَ
 الْيُرْدِ وَنَقِّ قَلْبِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ
 الثُّوبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّائِسِ وَبَاعِدْ
 بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ
 الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (بخاری عن عائشہ) فاصلہ کرے جیسا کہ مشرق و مغرب میں تو نے
 جب اپنے شہر سے باہر نکل آتا ہے تو سوچتا ہے کہ اس نے اپنے اہل و عیال اور وطن سے جدا
 ہو کر ایسا سفر اختیار کیا ہے جو کسی طرح دنیا کے اور سفروں کے بالکل مشابہ نہیں! اس سفر سے
 اس کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، ان کے گھر کی زیارت ہے، ان کی رضا و خوشنودی ہے، حق تعالیٰ
 ہی کی پکار ہے، ان ہی کی توفیق سے، ان ہی کے شوق دلانے سے، ان ہی کے حکم پر وہ قطع کرتا
 و ترک فلائق کر کے ان کے دربار کی طرف دیوانہ وار چل پڑتا ہے، اس کی زبان پر ہے:-
 بِسْمِ اللَّهِ، مَا شَاءَ اللَّهُ، حَسْبِيَ اللَّهُ، لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ، اللَّهُمَّ إِلَيْكَ خَرَجْتُ أَنْتَ
 اخْرَجْتَنِي!

من کہ باشم کہ براں خاطر عاظر گذرم لطفنامی کنی اے خاکِ دلت تاج سرم (ماتق)
 اس کو حق تعالیٰ سے پوری اُمید ہوتی ہے کہ وہ اس سفر شوق میں اس کے ساتھ ہونگے اس
 کے نگہبان اور مددگار ہونگے، وہ حق تعالیٰ ہی کی دستگیری و رہبری سے اپنی منتہی آرزو کو
 پائیگا، اپنے مولیٰ کے دیدار سے اپنی مراد کو پائیگا!

من این دستے کہ افشاندم ز کونین بدامان تمنا کے تو باشد! (حدیث)

سوچتا ہے کہ اگر وہ منزل مقصود کو پہنچے بھی نہ پایا اور راستہ ہی میں طعمہ اہلِ مسمیٰ ہو گیا، پھر

بھی وہ تباہ رہے گا! کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے:

وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا لِي
 اللَّهُ فَرَسُولِهِ ثُمَّ يَدْرِكْ الْمَوْتَ

اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرے مگر اس کو

فقد وقع أجره على الله“ آپکے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ

ہاں، اس راہ میں موت بھی اچھی! کہہ سکیں گے! ۵

حاصل عمر نثار رہے کریم! شادم از زندگی خویش کہ کلمے کریم

اسی فکر و ذکر، اسی دلولہ و جنون میں وہ میقات پر پہنچ جاتا ہے، کیڑے اتاڑتا ہے اور احرام

کی چادریں باندھتا اور اڑھتا ہے، ماسوائے آزاد ہو کر جمع اٹھتا ہے!

لبيك اللهم لتبيك لا شريك لك لتبيك!

آنکھوں سے اس کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، دل سے سرد آہیں نکلتی ہیں، اللہ زبان سے یہ چیخ :-

مرا از خاک کویت پیرا ہن است برتن! انہم ز آب دیدہ صد چاک تابدا من (جالی)

جاتا ہے کہ لبیک کی یہ پکار حق تعالیٰ کی اس پکار کے جواب میں ہو کہ :-

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ مِّنْ أَهْلِ كُلِّ مَدِينَةٍ مَّوَدَّعُوا ظُهُورَهُمْ لِلْحَاكِمِ مَبْتُورًا

اور اس کا خیال عرصہ قیامت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے کہ جب صور پھونکا جائیگا

اور لوگ اسی طرح پکارے جائیں گے اور وہ اپنی قبروں سے نکل کر میدان قیامت میں جمع ہونگے اور

حق تعالیٰ کی پکار کا جواب دینگے پھر ان میں سے بعض مقبول ہونگے اور بعض مردود! ابتدا میں

ترتیب ہر ایک کو ہوگا، خوف ورجا ہر ایک کے سینہ میں ہوگی! دل ہی دل میں حق تعالیٰ سے کہتا ہو کہ

کارے بجزگتہ نذاریم یا حنیظا عذری یغیراہ نذاریم یا حنیظا!

ہر چند رو سیاہ و گنہگار و مجرمیم جز رحمت پناہ نذاریم یا حنیظا! (جذاب)

توبہ و استغفار، تسبیح و تہلیل، مذمت و شوق، رجا و خوف میں اس کی ہر ساعت بسر ہوتی ہے۔

دل میں حسرتوں کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ راہ کی صورتیں بدداشت کیے بڑھتا جاتا ہے! کہیں کہتا ہے :-

اشد کس قدر وہ مقصود دور ہے پیک خیال راہ میں تھک تھک رہ گیا

جذہ کا قیام، ساتھیوں کی پریشانی اس کو متاثر نہیں کرتی، وہ تو ”مخو خیال“ یاڑ ہے :-

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مرنے نکل پئے یہ مری ہیں نیاز تھی کہ جہاں صری تھی دھری ہی

انتظار کی ساعتیں گزرتی جاتی ہیں اور وہ جیانی میں گنگناٹا جاتا ہے :-
 نظر ہے وقفِ غم انتظار کیا کہنا کھنچی ہر سانسے تصویر پار کیا کہنا۔ مگر مراد آبادی
 اب قافلہ مکہ منظر میں داخل ہو رہا ہے! حرم مامونہ میں پہنچ رہا ہے! امن دخل کان امینا
 کی نوید اس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ بلدا میں داخل ہو کر دم چنچ اٹھتا ہے :-
 ذرہ خاکم و در کوئے توام وقت خوش است ترسم اے دوست کہ بادے نہ بزدنا گاہم! (حافظ)
 آگے بڑھ کر جب اس کی نظر بیت اللہ پر پڑتی ہے تو رب البیت کی تجلی سے اس کے ہوش و حواس
 گم ہو جاتے ہیں :-

آمد خیرے ز آمد او من بعد خبر نماند مارا!

وہ بیت "کو نہیں، گویا" رب البیت کو دیکھ رہا ہے!

آنکھوں میں رنے یا رہی، آنکھیں ہیں رنے یا رہی

ذہ ہر آفتاب میں، ذرے میں آفتاب ہے!

اسی ذوق و خوق کو لیے ہوئے وہ طواف کے لیے بڑھتا ہے، اس کے قلب میں قظیم، خوف ورجا،
 عشق و محبت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، اس کا جسم خانہ کعبہ کے طواف میں مصروف ہوتا ہے
 لیکن اس کی روح رب البیت کے گرد گھومتی ہے، اس کا دل حضرت ربوبیت کا طواف کرتا ہے،
 اس پر فدا ہوتا ہے، اثار ہوتا ہے، چختا ہے :-

یک جان چہ متا نیست کہ ساریم فدایت

اما چہ تو اں کرد کہ موجود ہیں است!

جب حجرِ اسود کو بوسہ دیتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہے۔ اظہار
 فرمانبرداری، عہدیت و عبودیت کا اقرار کر رہا ہے، حجرِ اسود "عین اللہ عزوجل فی الارض"
 ہے، حق تعالیٰ کا ہاتھ تھا، زمین پر، یصافح بها خلقہ کما یصافح الرجل اخاه جس سے وہ

اپنے بندوں کے ساتھ مصالحت کرتے ہیں! وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عرض کرتا ہے: ۷

یارب منم و دست تہی چشم پر آب جاں دادہ و دل سوختہ و سینہ کباب

نامہ سیدہ و عمر تبہ، کار حسراب از روئے کرم بفضل خوشیم دریاب

پھر کعبۃ اللہ کے پردہ کو پکڑتا ہے یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ کے دامن کو پکڑ رہا ہے اور ملتزم سے چھٹتا

یہ یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ سے قریب ہو رہا ہے، رو رو کر عرض کرتا ہے: ۷

تو کریم مطلق دامن گدا چکنی جزائیکہ نخواستیم و ددیگے بنا کہ من بہ کجا روم چو برانیم

ہمہ عمر ہرزہ دویدہ ام غلم کنوں کہ خمیدام من اگر کجلقہ تمیدہ ام تو بر دین دوشانیم (بیدل)

آپ کا دامن چھوڑ کر کہاں جاؤں، کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، کس کے قدم پکڑ لوں؟ میری پناہ گاہ آپ

ہیں، میرا لجاو ادائیگی آپ کے سوا کون ہے؟ آپ کے کرم و عفو کے سوا میرا ٹھکانا نہیں! آپ کا دامن

نہ چھوڑونگا جب تک کہ آپ اپنی رحمت سے میری سب کاریوں کو معاف نہ فرمائیں، اور آئندہ

دامن میں پورے نہ فرمائیں! حق تعالیٰ آپ کریم ہیں، و کریم پیچڑو نیار کے ساتھ آیا ہوں،

دیدہ احکباب کے ساتھ آیا ہوں، و دیدل، نالہ جاں آزار کے ساتھ آیا ہوں، اگر آپ دامن عفو

میں پناہ نہ دیں تو کہاں جاؤں، کیا کروں! ۷

یارب دلم از بارگنہ مخزون است جاں زار و دل بافکار و جگر پر خون است

ہر خدگناہ من ز حد بیرون است عفو ت زگناہ من بے افزون است (دہ)

صفا و مروت کے درمیان جب وہ سہمی کرتا ہے تو یہ احساس قلب میں ہے ہرے کے ایک فقیر،

مسکین، حقیر و ذلیل غلام اپنے آقا، مالک، بادشاہ کے محل کے صحن میں بار بار چکر لگا رہا ہے، نظر

کرم کا ملتی ہے، زبان پر سوال ہے کہ:

”رب اغفر وارحم و تجاوز ذنبتا تعلم انک انت الاعز الاکرم“

بار بار گھومتا ہے اور آواز لگاتا ہے کہ:

عبیدک بفنائک! مسکینک بفنائک! فقیرک بفنائک! سائلک بفنائک! انت

کریم رحیم الرحمنی و اعفر لی یا رحیم یا کریم یا غفور!
 جانتا ہے کہ کوئی سائل اس در سے محروم نہیں جاتا، یہ کریم کا دروازہ ہے، اس کو چوکھٹا کرتا ہے
 وہ اپنی مراد کو پاتا ہے۔

گفت پیغمبر کہ چوں کو بی رویے عاقبت زان در برول آید سے

سایہ حق بر سر بندہ بود عاقبت جو بندہ یا بندہ بود

چوں نشینی بر سر کوی کے عاقبت ہمینی تو ہم روی کے

چوں ز چاہے میکنی ہر روز خاک عاقبت اندر روی در آب پاک

عرفات کے میدان میں جب وہ قدم رکھتا ہے اور لوگوں کا ازدحام اور آوازوں کا بلند ہونا
 اور زبانوں کا اختلاف جب اس کو نظر آتا ہے تو اس کو میدانِ قیامت کا منظر یاد آتا ہے کہ اس
 روز بھی ہر امت اپنے نبی کے ساتھ اسی طرح جمع ہوگی اور اس کی پیروی کریگی اور اس کی
 شفاعت کی امید کریگی، اب وہ اضطراب کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور خجیہ ہے:

یا من لا یغفلہ شأن سن لے وہ ذاتِ مطلق کہ جس کو ایک حال دوسرے حال

شأن ولا سمع عن سمیع ولا سے نہیں روکتا اور نہ ایک عرض کا سنا دوسرے عرض

تشبہ علیہ الاصوات، یا کے سننے سے باز رکھتا ہے، اور دہ مشتبہ ہوتی ہیں اس پر

من لا تغلطہ المسائل ولا آوازیں! لے وہ ذاتِ مطلق کہ جس کو بہت سے سوال

تختلف علیہ اللغات، یا من مغالطہ میں نہیں ڈال سکتے اور نہ مختلف ہیں اس کے نزدیک

لا یرمد الحاح الملحین و بہت سی زبانیں! لے وہ ذاتِ پاک جس کو ہٹ کرنے والوں

لا تضجروہ مسئلہ السائلین! کا اصرار تھکا نہیں دیتا اور مانگنے والوں کا سوال تنگ نہیں

اذقنا برد عفوک وحلاوة کرتا ہم کو اپنے عفوک کی ٹھنڈک اور رحمت کی حلالت سے آشنا

رحمتک! کر! (رومانے خضر علیہ السلام)

پھر رو کر کتاب ہے :-

الہی! انت انت وانا انا، انا حق تعالیٰ آپ آپ ہیں اور میں میں ہوں! میں گناہوں کی نظر
 العواد الی الذنوب وانت باز بار پلٹتا ہوں اور آپ منفرت کی طرف بار بار رجوع
 الی المغفرۃ! الہی ان کنت لا کرتے ہیں! حق تعالیٰ اگر آپ اپنے طاعت والوں ہی پر
 ترحمہ لا اهل طاعتک فالرحم کریں تو گنہگار کس طرف ملتی ہوں!
 من یفرغ المذنبون:

الہی تجنبت عن طاعتک عمدا حق تعالیٰ میں آپ کی اطاعت سے قصداً علیحدہ ہوا اور
 وتوجہت الی مصیبتک قصدا آپ کی نافرمانی پر دانستہ متوجہ ہوا، آپ پاک ہیں آپ کی حجت مجھ
 فبجناک ما اعظم حجبتک علی و پرکتی بڑی ہے اور آپ کا مجھے معاف کرنا کتنا بڑا کرم ہے پس جس صورت
 ما اکرم عفوک عنی فبوجوب میں کہ آپ کی حجت مجھ پر ضروری ہوئی، میری حجت آپ کے ہاں
 حجبتک علی والقطاع حجبتک جاتی رہی، میں آپ کا محتاج ہوں اور آپ مجھ سے بے پروا
 وفقری الیک وغناک عنی الا بے نیاز آپ مجھے معاف ہی فرما دیجیے! اے ان سے بہتر ذات جن کو
 غفرت لی! یا خیر من دعاہ جن کو کوئی دعا مانگنے والا پکارا، اور افضل ان کو جن میں کوئی توقع رکھو والا نہ ہو
 داع وافضل من رجاہ راجع عجزت اسلام کی حرمت اور مجھ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا
 الاسلام وبن مت محمد علیہ السلام وسیلہ تیرے سامنے پیش کرتا ہوں، میرے سلسلے گناہ
 اتوسل الیک فاغفر لی جمیع بخش دیجیے اور مجھے اس موقع سے حاجتیں پہنچی
 ذنوبی واصرفنی عن موقفی هذا کہے لٹائیے اور جو کچھ میں نے مانا بھلا ہے وہ لادتیجیے اور
 مقضی الخواتج رهب لی ما سألہ جس چیز کی میں نے تمنا کی اس میں میری توقع پوری
 وحقق رجای فیما تمیت! کیجیے!

پھر چلا آئے در دہبے دل سے!

الہی من مدحک نفسہ فانی الہی! جو تیرے سامنے اپنی تعریف کیا کرے میں تو اپنے
 لا شوقسی! الہی اخرست المعاصی نفس کو طاقت کرتا ہوں! الہی گناہوں نے میری زبان

لسانی فمالی وسیلۃ من عملی و گوئی کردی، پس مجھ کو اپنے عمل کا وسیلہ نہ رہا اور نہ سزا
 لا شفیع سوی الاہل! الہی انی اُمید کے اور کوئی سفارش کرنے والا! الہی مجھے علوم
 اعلیٰ ان ذنوبی لم یبق لی عندک ہے کہ میرے گناہوں نے تیرے نزدیک میری قدر
 جاہا ولا للاعتذار وجہا ولكنک کچھ باقی نہ رکھی اور نہ عذر کرنے کی کوئی صورت
 اکرم الاکرمین الہی ان لو اکن اہلاً چھوڑی لیکن تو تمام کریموں سے زیادہ کریم ہے! الہی
 ان ابلغ رحمتک فان رحمتک اگر میں اس قابل نہیں کہ تیری رحمت تک پہنچوں
 اہل ان تبلغنی ورحمتک سعۃ تو تیری رحمت تو شایان ہے کہ مجھ تک پہنچے! الہی
 کل شیء وانا شیء! الہی ان ذنوبی تیری رحمت ہر چیز کو شامل ہے اور میں بھی ایک چیز
 وان کانت عطا فادلکھا صغائر ہوں! الہی اگرچہ میرے گناہ بڑے ہیں لیکن تیرے
 فی جنب عفوک! فاغفرہالی یا کریم! عفو کے مقابل میں چھوٹے ہیں! میرے گناہوں سے

درگزر کر لے کریم!

جانتا ہے کہ یہ وہ مبارک مقام ہے جہاں حق تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور ان رحمتوں کو
 وہ قلوب جذب کرتے ہیں جو اس میدان میں موجود ہوتے ہیں، یہ ابدال و اوقات کے قلوب ہیں،
 ان صاحبین کے قلوب ہیں جو حق تعالیٰ کے آگے سربسجود ہیں، ان کے حضور میں دست بستہ
 دولت و مسکنت کے ساتھ گزر رہے ہیں! رحمت الہی کے جذب کا اس سے زیادہ قوی دہوتہ
 کوئی طریقہ نہیں کہ:

ان ابرار کی ہمتیں اکٹھی ہوں اور ایک وقت میں ایک زمین پر قلوب ایک دوسرے
 کی مدد کریں!

اس ادراک کے ساتھ ہی اس کی زبان سے یہ چیخ نکلتی ہے:

غناکم والادریٰ تو باعشم نروم جز شادو اُمید وار و خرم نروم

لہ ہے سب دعائیں ایسا معلوم باب نہم سے کی گئی ہیں۔ فیلرح۔

از درگہ پہنچو تو کرتے ہرگز نوسید کے نرفت و من ہم نروم (ابوسعید)
اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

عرفات شریف کے میدان میں آکر یہ سمجھنا کہ حق تعالیٰ نے میری مغفرت نہیں کی،
سب سے بڑا گناہ ہے۔“

رحمت اینجا کہ کند وسعت خود اظاہر

ہر کہ تقصیر نہ کرد است گنہ گار تراست!

رمی جمار کے موقع پر احرام باندھتے وقت کے اپنے اس قول کو یاد کرتا ہے کہ:

لبیک لحجۃ حقاً تعبداً و سرفناً

اور محض اپنی غلامی و بندگی کے اظہار کے لیے امر کی اطاعت کا قصد کرتا ہے اور محض تعمیل ارشاد
و امتثال امر الہی کے لیے رمی کرتا ہے، جانتا ہے کہ اس فعل میں نہ تو نفس کو کوئی خطبے اور عقل
کو اپنی عقل اور نفس کو حق تعالیٰ کے حکم پر قربان کرتا ہے، اور دیوانہ وار اقامت ذکر اللہ
کے لیے شیطان پر کنکر مارتا ہے اور زبان سے کہتا جاتا ہے:۔

اللہ اکبر علی طاعة الرحمن و رغم الشیطان تصدیقاً بکتابک و اتباعاً

لسنة نبیک۔

جب قربانی کرتا ہے تو جانتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم پر وہ اپنی بھی جان قربانی کے جانور کی
طرح فدا کرنے کو تیار ہو گا بلکہ عاشق کی زندگی تو ہر زمان مردنی ہے وہ اپنی جان کو ہر دم فدا کر ہی
رہتا ہے۔

اے حیاتِ عاشقان در مردگی دل نیابی جز کہ دزدل بردگی

ماہا و خوں بہارا یا نسیم جانبِ جاں باخشن بتاقتیم

۱۔ میں حاضر ہوں حج کے واسطے حقیقت میں بندگی اور غلامی کی راہ سے (دارقطنی در عل بروایت حضرت انس)
۲۔ انما جعل الطواف بالبيت والسعی بین الصفا والمروة ورمی حصار لا فاعل ذکر اللہ ولا لغیرہ یعنی طواف
کعبہ، سعی در میان صفا و مروہ اور کنکریوں کا پھینکنا ذکر اللہ کے قائم رکھنے کے واسطے مقرر کیا گیا ہے اور وہ تو مذہبی بروایت

ماشقاں راہر زمانے مرڈیت مردن عشاق خودیک نوع نیست
 اوردو صد جاں دارد از نور ہدی و او دو صد رامی کند ہر دم فدا
 ہر کیے جاں راستا ندہ ہسا از نبی خواں عشرۃ امثالہا (ردی)
 غم من حج کے اعمال میں دل کا وظیفہ یہ ہے جس کا اجمالاً او پر ذکر ہوا، قلب کی یاد کے ساتھ
 حج کے اعمال وہی ادا کرتا ہے جس کے دل پر حق تعالیٰ کی محبت و غلامی کا داغ ہوتا ہے اور ہر
 ہے کہ جس غلام کو خود بادشاہ خریدتا ہے اس کا مرتبہ سوا ہوتا ہے۔

داغ غلامیت کر دیا یہ خسرو بلند
 صدر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

زیارتِ مدینہ

”زیارتِ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اذکہ مستحبات و افضل قرأت سے ہے اور صاحبِ
 قدرت کے لیے قریب واجب کے ہے!“

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ حمل از وطن!
 خیزم چو گرد، انتم چو اشک، ایم بسر غلظم بہ تن (ابوحدی)
 مدینہ رسول کی راہ میں درود کے شغل سے بہتر کوئی شغل نہیں۔
 بِإِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا
 تَسْلِيمًا۔ من صلی علی واحدۃ صلی اللہ علیہ عشرًا (مسلم)
 اس راستہ کو درود و سلام کے ورد ہی میں ختم کرنا چاہیے، حُب نبوی کا تقاضا یہی ہے
 من مذہبی حب النبی و صحبہ
 وللناس فیما یعشقون مذاہب

۱۰۰ رہ ماتدآن، اشارہ بایہ من جاء بالحسنۃ فله عشر امثالہا (سورۃ الانعام)

۱۰۰ مولانا صدیق حسن مرحوم، دال شامۃ الغبریہ من مولد خیر البریہ ص ۱۱۵۔

جب مدینہ منورہ کی دیواروں پر نظر پڑتی ہے تو عاشق کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ یہ وہ مبارک شہر ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لیے پسند فرمایا ہے، اور اس کو ان کا دارالہجرت بنایا ہے۔ یہ وہ مقام مقدس ہے جہاں آپ نے حق تعالیٰ کے فرائض سنن مشروع فرمائے، اعدائے دین سے جہاد کیا اور حق تعالیٰ کے دین کو ظاہر کیا، اسی پاک زمین میں آپ نے اپنی زندگی بسر فرمائی، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنے جوار رحمت میں بلالیا اور آپ کی قبر مطہر اس میں مقرر فرمائی، اور آپ کے دو وزیر جو آپ کے احکام کی بجا آوری میں کامل تھے آپ ہی کے پہلے آرام فرما رہے ہیں! اس خیال کے آتے ہی وہ فرط مسرت سے چیخ اٹھتا ہے:۔

من ویشرب کہ بہ از نور بود خاک انجا!	باشد از مہر مسین سایہ افلاک انجا!
شرفی خاک رہش راست کہ باورین آب	از تہم شود اعضا کے وضو پاک انجا!
بجر رحمت شود آن قطرہ کہ از لے ریزد	چوں کند تاب سفر جبہ عرفناک انجا!
صاحبش راست جنابے کہ ز بس تعظیمش	بال جبرئیل بر وہ خس و خاشاک انجا!

(مولوی احسان اللہ ممتاز)

جب عاشق رسول مدینہ منورہ کی پاک زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کی زبان سے بے اختیار

نکلتا ہے:۔

اندر دو جہاں کعبہ ماکوئے محمدؐ

مخراپ دل و جاں خم ابوئے محمدؐ

وہ دیوانہ وار حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

اشد! ایسے جذبِ محبت کو کیا کروں!

رگ رگ کو جس نے درد بھر دل بنادیا

ہر قدم پہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اس مقام پر آقلے نامدار کے قدم پڑے ہونگے، قدم اٹھاتا ہے

پھر ٹھہر جاتا ہے، ٹھہرتا ہی، پھر تھم جاتا ہے

ترب کو چے میں ہم کل اس طرح سے جا بجا ٹھہرے
چلے چل کر تھکے، تھم کر بڑھے، ابلھ کر ذرا ٹھہرے

اس گلی کے ہر ذرے کو وہ اپنا دل سمجھتا ہے۔ ۶

ہم اس کوچے کے ہر ذرے کو اپنا دل سمجھتے ہیں۔

تجلیات جب اس کو لگے قدم بڑھانے نہیں دیتیں، تو وہ چنچلے سے

پایم بہ پیش از سر این کوئی رود

یاراں خبرد بید کہ این جلوہ گاہر کیت (نظیری)

اسی محبت کی تجلی میں وہ دیکھتا ہے کہ: ۶

کوچہ جاناں کا ہر ذرہ چرغ طور ہے!

اپنے محبوب کا وہ خیال کرتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی معرفت کس درجہ آپ کو عطا فرمائی تھی!

آپ کے ذکر کو کس درجہ بلند فرمایا تھا کہ اپنے ذکر کے ساتھ اس کو ملا دیا تھا، رفعتنا لک ذکرک کی

نوید سے آپ کو سرفراز فرمایا تھا! آپ کی تعظیم کے ترک کرنے پر کیسی وعید فرمائی تھی، گو آپ کی آواز

پر اپنی آواز ہی کے بلند کرنے سے وہ ترک تعظیم کیوں نہ ہو! جبط اعمال اس کی سزا تھی! پھر نظامیؒ

کے الفاظ میں وہ اس طرح متاخر ہوتا ہے ۷

شمسہ ز منہ ہفت اختران ختم رسل خاتم پیغمبران

احمد رسل کہ خرد خاک اوست ہر دوہاں بستہ فراک اوست

امی گویا بہ زبان فصیح اذ الف آدم ویمیم مسیح

اے تن تو پاک تر از جان پاک ریح تو پرودہ روحی فداک

سے مدنی برقع وکی نقاب سایہ میں چند بود آفتاب

اے گوہر تاج فرستادگان تاج وہ گوہر آزادگان

پھر وہ خیال کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان نیک بختوں پر کتنا بڑا احسان فرمایا، جنہوں نے

آپ کی صحبت پائی، اور مشاہدہ جمال، استماع اقوال و ملاحظہ احوال سے سعادت حاصل کی اور اپنے حال پر آنسو بہاتا ہے کہ یہ دولتِ سرمدی مجھے نصیب نہ ہوئی، اور نہ آپ کے اصحابِ کرام کی صحبت ملی! دنیا میں تو آپ کو نہ دیکھا، آخرت میں بھی شاید آپ کی زیارت نگاہِ حسرت ہی سے ہو اور اعمالِ بد کے باعث آپ ہیں قبول نہ فرمائیں کیونکہ آپ کا ارشاد مبارک ہے کہ:

”قیامت کے روز کچھ لوگوں کو فرشتے دوزخ کی طرف لے جائیں گے (جن میں اپنی امت کی بعض نشانیاں دیکھ کر ہیں حق تعالیٰ سے عرض کروں گا، حق تعالیٰ یہ میرے لوگ ہیں! حکم ہو گا کہ نہیں، تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کام کیے ہیں! تب میں کہوں گا کہ مجھ سے دور ہو! مجھ سے دور ہو!“ (رواہ اشعجان)

یہ حال ان لوگوں کا ہو گا جنہوں نے شریعتِ مطہرہ کی توقیر نہیں کی، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر نہ سمجھی اور بدعت کو ترجیح دی! اب وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہیں، اس عید سے کانپ اٹھتے ہیں، اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں، چیتھلے سے

ہر چند گناہ بے شمار است صد مرتبہ بے شمار توبہ

در بارگت کم حنڈایا بادیدہ اشکبار توبہ

گرفت بہ ترات عسرم کردم نہ بیک دو بار توبہ

شد ہر سر موکنوں زبانی آرم بتو بار بار توبہ (لا اعلیٰ)

پھر عرقِ خمالت میں غرق ہو کر حق تعالیٰ سے التماس کرتا ہے :-

توغنی از ہر دو عالم من فقیر روز محشر عذرا! پذیر

یا اگر بینی حسابم ناگزیر از نگاہِ مصطفیٰ پندہاں بگیری! (اقبال)

پھر امید ورجا کی موج اس کے سینے میں اٹھتی ہے، وہ اس امر کا احساس کرتا ہے کہ

حق تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے اس کو سرفراز فرمایا، اپنے محبوب کی زیارت کے لیے

وطن سے نکال کر اس مقدس مقام پر پہنچایا، خطہ دنیا یا تجارت اس سفر سے اس کا مقصود

ذہقا، فقط آپ کی بے پایاں محبت اور آپ کے آثار کے دیکھنے کے شوق ہی نے اس کو وطن
مالوت سے نکالا، زندگی میں جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوا تو اس نے اس پر ہی تعلق
کی کہ آپ کی مسجد مبارک میں حاضر ہو کر آپ کی قبر اطہر کی دیوار پر ہی نظر ڈالے۔

غیبے گر روی بشہر دیا رومی در مسجد مصفاکن
دوست را اگر نمی توانی دید خانہ دوست راتما شاکن

جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ سامان متیا کر دیے تو اب اس کی رحمت
سے یہی توقع ہے کہ وہ اس کی طرف نظر رحمت سے دیکھینگے، اور اس کے گناہوں کو معاف
فرمائینگے۔

اندر علم انچه ترا شاید نیست

اندر کرمت انچه مرا باید هست

جب مسجد نبوی میں قدم رکھتا ہے تو یہ سوچتا ہے کہ یہ وہ مقدس جگہ ہے جس کو حق
تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم اور مسلمانوں میں سے اول اور افضل لوگوں کے لیے تجویز فرمایا، جو تبول
عارف رومیؒ

برتر نند از عرش و کرسی و خلا

ساکنان مقعد صدق خدا

اور جو حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب و مطلوب و پسند رہے ہیں۔

جانتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حق تعالیٰ کے فرائض ادا ہوئے، اور
کامل عبودیت کے ساتھ ادا ہوئے! یہی وہ زمین ہے جس میں تمام مخلوق سے افضل و برتر
لوگ حالت حیات و حالت ممات میں جمع ہیں! اب وہ توقع کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس
پر بھی رحم فرمائینگے، اور دل ہی دل میں عرض کرتا ہے:

بضاعت نیاردم الا امید

خدایا ز عفوم مکن نا امید

پھر مسجد مبارک میں خشوع و تعظیم سے داخل ہوتا ہے، زبان پر یہ دعا ہوتی ہے:-

اللهم هذا هم رسولك فاجعل لي وقاية من النار واماناً من العذاب وسوء
الحساب اللهم افتح لي ابواب رحمتك وارزقني من زيارة نبيك ما رزقت
اوليائك واهل طاعتك واغفر لي وارحمني يا خير مسئول -

پھر نیت اعتکاف الی الخروج کر کے روضہ جنت کی طرف بڑھنا ہے اور محراب نبوی کے
پاس، ممکن ہو تو مصلی نبوی یا اس سے متصل یا منبر کے پاس، اور نہ ہو سکے تو کسی ایک مقام
پر تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کرتے ہیں، پھر اس نعمت عظمیٰ کے حصول پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا
ہے، اور رضا، توفیق خیر، قبولی اعمال، دہلوع مقاصد کی دعا کرتے ہیں! دعا کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:

اللهم ان هذه روضة من رياض الجنة شرفتها وكرمتها ومجدتها وعظمتها
ونورها بنور نبيك وحبيبك محمد صلى الله عليه وسلم اللهم كما بلغتنا في
الدنيا زيارته وما آثره الشرف فبلا تحرمنا يا الله في الآخرة من فضل
شفاعة محمد صلى الله عليه وسلم واحشرنا في زهرته وتحت لوائه وامتنا
على محبته وملته واسقنا من حوضه للمورود بيد الشرفية شربة هنية
لا نطفاء بعدها اذ انك على كل شيء قدير -

پھر زیارت کی نیت سے نہایت ادب و خشوع کے ساتھ روضہ پاک کے سامنے حاضر
ہوتے ہیں، اس کا عقیدہ ہے کہ حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کے آنے، کھڑے ہونے، اور
زیارت کرنے کا علم ہوتا ہے، اور اس کا درود و سلام آپ کی خدمت مبارک میں پہنچتا ہے۔
آپ نے فرمایا کہ:

من صلى علي واحدة صلى الله عليه عشرا (مسلم)

یہ جز آتو صرف زبان سے درود پڑھنے کی ہے، جب وہ خود زیارت کے لیے تمام بدن سے

ہے، اس حدیث سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: جو لوگ میری قبر پر آکر سلام کرے گی میں اس کا سلام خود سنوں گا
اور دوست سلام کرنے والوں کا سلام مجھے پہنچایا جائیگا! (مشکوٰۃ)

حاضر ہوا ہے تو اس کا بدلہ کس قدر عظیم الشان ہوگا!

اب وہ اپنے آقائے نامدار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے:
 الصلوة والسلام عليك ايها النبي السيد الكريم والرسول العظيم والحبيب
 الرؤوف الرحيم ورحمة الله وبركاته، الصلوة والسلام عليك يا محمد بن
 عبد الله بن عبد المطلب ابن هاشم يا طه يا يسر يا بشير يا سراج يا مبين
 يا مقدّم جيش الانبياء والمرسلين

يا خير من دفنت في التراب اعظمه قطاب من طيبهن القام والاحم
 نفسى الفداء لقبرانت ساكنه فيه العفات وفيه الجود والكرم
 انت الحبيب الذي ترحى شفاعتك عند الصراط اذا ما زلت القدم

پھر صدیق اکبرؑ اور عمر فاروقؓ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔

پھر حضورؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منبر شریف کے پاس حاضر ہوتا ہے اور تصور کرتا ہے
 کہ گویا آپ منبر پر چڑھے کھڑے ہیں اور مہاجرین و انصار آپ کے گرد حلقہ کیے ہوئے ہیں اور
 آپ ان کو خطبے میں حق تعالیٰ کی اطاعت کی ترغیب و ہمت دلا رہے ہیں اور نافرمانی سے روک
 رہے ہیں اور ڈرا رہے ہیں۔

محمد شہنشاہ خیلِ رسل	کہ خرد نڈ پیش چہ جزوہ گل
درخشاں دردیج عبد مناف	بانگشت اعجاز مر را شگاف
زابروش محراب عین لہفتین	زگیوش اسباب جبل امتین
فلک لوز دریاش در شبنے	فصیحاں زغوغاش در لبکے

چنان عقدہ از کار امت کشاد کہ دنیاں دریں کار برباد داد! (ظہوری)

دل میں توحید پر جینے مرنے کا پختہ عزم کرتا ہے، حضورؐ کی محبت کو قلب میں اور زیادہ راسخ
 کرتا ہے، اور آپؐ کی سنت مطہرہ پر ساری عمر عمل کا پورا ارادہ کرتا ہے۔ اس عقیدے کو پختہ کرتا ہے کہ

حق تعالیٰ ہر حال میں اس کے نگران ہیں۔ "الم يعلم بان الله يرى"۔ اس کے دل کے دوسو سو
اور خفیہ خطرات و خیالات کو دیکھتے اور جانتے ہیں تاکہ سب کاموں میں ادب کا لحاظ رکھے جیسے کہ
کوئی شخص کسی بادشاہ کی نظروں کے سامنے ہے، ہر وقت گردن جھکائے، اور ہر کام میں ادب؛
اس عقین کو بھی دل میں مضبوط کرنا ہے کہ:

"مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ"

یعنی طاعات کو ثواب سے ایسی نسبت ہے کہ جیسے غذا کو پیٹ بھرنے سے اور گناہوں

کو عذاب سے وہ تعلق ہے جو زہر کو ہلاکت سے!

عزم کرنا ہے کہ اپنے تمام حرکات و سکنات، خطرات و محظبات، لفظات و فلمات، غدرات و
فجرات پر ہمیشہ نظر رکھیں گے، اور تقویٰ کے اختیار کرنے میں اور ہر برائی سے اجتناب کرنے میں مبالغہ
سے کام لیں گے۔ بحول اللہ و قوتہ

آخر میں اس تسکین بخش عقیدے کو بھی پختہ کرتا ہے کہ رزق کی کفالت خود حق تعالیٰ نے فرمائی

ہے یہ کہہ کر کہ۔

"مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا"

یہ رزق مضمون ضرور ملے گا، جتنا مقدر ہے وہ قطعاً پہنچ کر رہے گا، طلب رزق بطور شرعی کرنا چاہیے
اور جو چیز فوت ہو جائے اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے۔

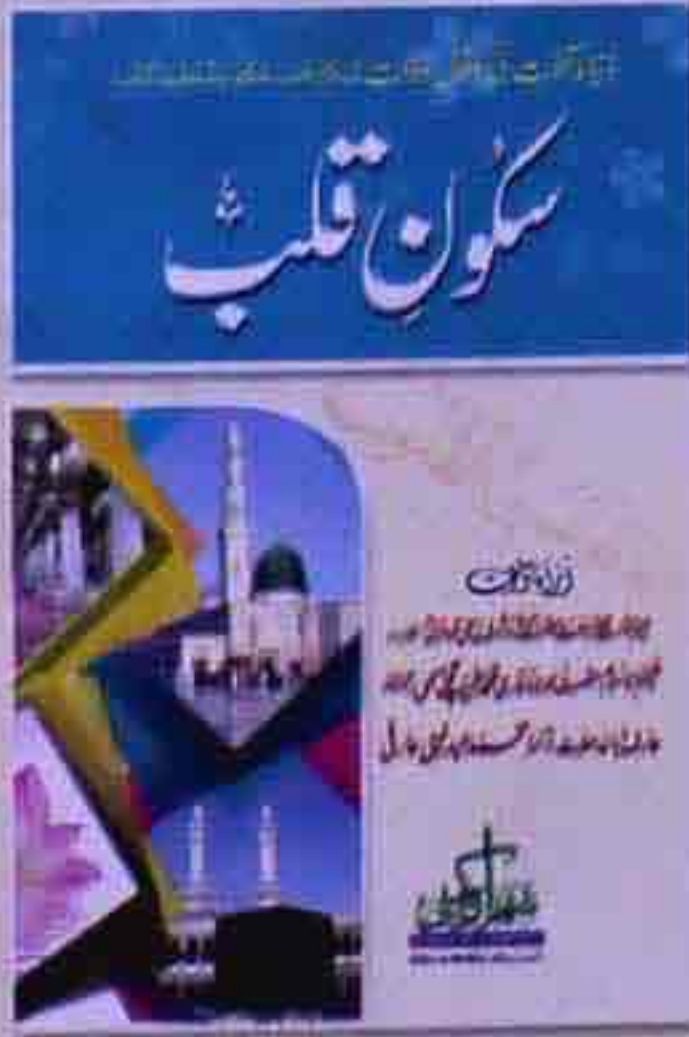
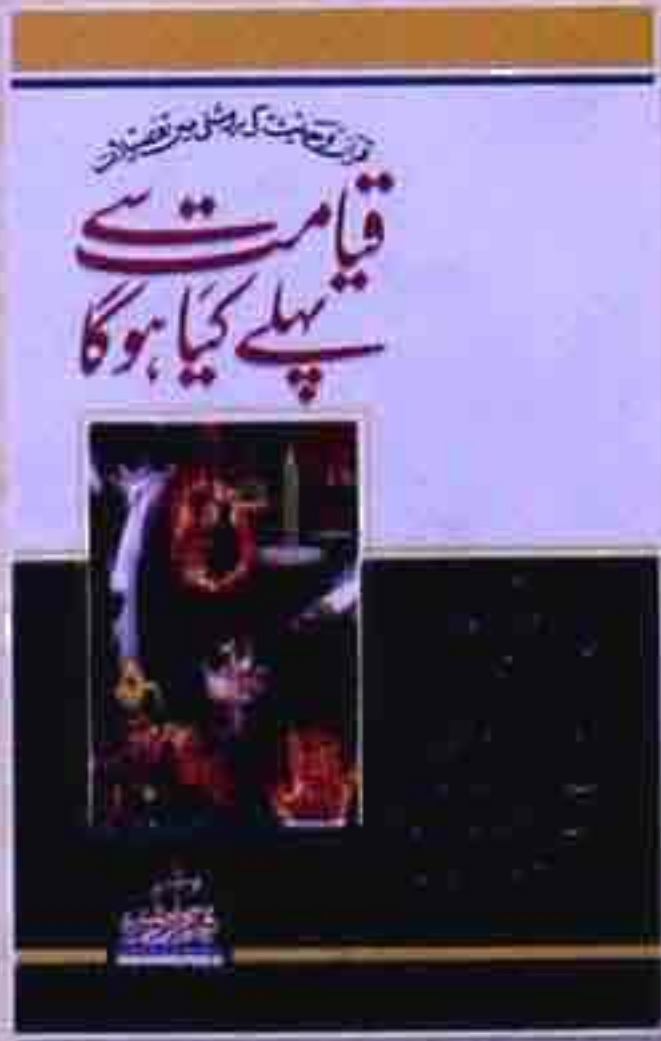
لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ

مہر تریف کے س پہنچ کر تصور کرتا ہے کہ کچھ ان ہی نیقنات پر حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم، زور دے رہے ہیں اور وہ انہیں اپنے قلب میں آمار رہا ہے، اور اپنے تحت شعوری نفس میں
انہیں پختہ کر رہا ہے۔

حج و زیارت کے اعمال میں ہے دل کا وظیفہ، جس کے اجمال کا ذکر ہوا۔ اس طرح فارغ

ہو کر حاجی فرط مسرت سے چیخ اٹھتا ہے

نازم بحشم خود که جمالی تو دیده است
 افتم بپیک خود که بگویت رسیده است
 هر دم هزارا بوسه زخم دست خویش را
 کوه منت لافچه بسویم کشیده است



یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
 اردو بازار، لاہور
 فون 042-37124354 فیکس 042-37352795

پروکسٹ بکس